باسمہٖ تعالیٰ

مَن و یزداں

(پانچواں ایڈیشن)

خدا کا وہ تعارف جو اس نے خود اپنی کتاب میں
کرایا ہے اور جس سے یہ حقیقت بھی واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ
خدا اور بندے کا باہمی تعلق کیا ہے

پرویزؔ

شائع کردہ
طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۲۵/بی گلبرگ ۲، لاہور

کتاب ---------- من ویزداں

مصنف ---------- علامہ غلام احمد پرویزؒ

ناشر ---------- طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

---------- B-25 گلبرگ II لاہور 54660 لاہور-II

فون 5753666-5764484

فیکس: 5764484

Email-tluislam@brain.net.pk

web.www.toluislam.com

طابع ---------- دوست ایسوسی ایٹس

مطابع ---------- زاہد بشیر پرنٹرز

ایڈیشن ---------- پنجم 1991ء بلاترمیم

ششم 1999ء بلاترمیم

طلوع اسلام ٹرسٹ کی مطبوعات سے حاصل شدہ
جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تعارف

قرآن فہمی کے ضمن میں پرویزؒ صاحب کے سلسلۂ "معارف القرآن" کا آغاز ۱۹۴۱ء میں ہوا تھا جب اس کی پہلی جلد دہلی سے شائع ہوئی تھی ۔۔۔ اس کا دوسرا ایڈیشن بھی وہیں سے ۱۹۴۷ء میں شائع کیا گیا تھا۔ اس جلد کا عنوان "اللّٰہ" تھا۔ اس کے بعد اس سلسلہ کی دوسری کڑیاں، جلد دوم، جلد سوم وغیرہ کے نام سے شائع ہوتی گئیں۔ جب ان کے جدید ایڈیشن شائع کرنے کا وقت آیا تو مشورہ یہ دیا گیا کہ چونکہ ان میں سے ہر جلد ایک مستقل موضوع سے متعلق ہے اس لئے انھیں پہلی، دوسری اور تیسری جلد کہنے کے بجائے، ہر جلد کا عنوان اس کے موضوع کے لحاظ سے الگ الگ رکھا جائے۔ یہ مشورہ صائب تھا اس لئے اسے قبول کر لیا گیا۔ اس فیصلہ کی رُو سے اس پہلی جلد کا نام "من و یزداں" تجویز ہوا اور اگلی جلدیں ابلیس و آدم، جوئے نور، برقِ طور، شعلۂ مستور، معراجِ انسانیت وغیرہ کے عنوانات کے ساتھ شائع ہوئیں۔ پاکستان میں یہ کتاب "من و یزداں" کے نام سے ستمبر ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی جو ایک عرصہ سے نایاب ہو چکی تھی۔ اب اس کا تازہ (یعنی اصل کتاب کا چوتھا) ایڈیشن مصنف کی نظرِ ثانی کے بعد شائع کیا جاتا ہے۔ سابقہ ایڈیشنوں میں ایک مستقل اور طویل باب "مشیت" کے عنوان سے بھی تھا، لیکن اس دوران میں پرویزؒ صاحب کی تصنیف "کتاب التقدیر" شائع ہو گئی، جس کی موجودگی میں اس کتاب میں "مشیت" کے باب کی موجودگی غیر ضروری سمجھی گئی۔ اس لئے اس باب کو حذف کر دیا گیا ہے۔

اس زمانے میں جبکہ اشیائے ضروریہ کی قیمتیں آسمان تک چڑھ رہی ہیں، ان کتابوں کے نئے ایڈیشن شائع کرنے کا مرحلہ بڑا ہمت طلب ہے۔ بایں ہمہ، ان کی اہمیت اور احباب کے پیہم تقاضوں کے پیشِ نظر، ان سب کے تازہ ایڈیشن شائع کئے جا چکے ہیں۔ صرف ایک کتاب "شعلۂ مستور" باقی ہے جو اس کے بعد پریس میں جا رہی ہے۔ اس دوران میں پرویزؒ صاحب کی کئی ایک تازہ تصانیف بھی شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں آخری کتاب "شاہکارِ رسالت" ۔ عمر فاروقؓ ہے جس نے چند ہی ماہ میں دُور دُور تک شہرت حاصل کر لی ہے۔ 'طلوعِ اسلام' ایک مشنری ادارہ ہے جس کا مقصد پرویزؒ صاحب کی قرآنی فکر کی نشر و اشاعت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی بیش از بیش توفیق عطا فرمائے!

پرویزؒ صاحب کی تصانیف میں قرآنی آیات کا حوالہ اس طرح دیا جاتا ہے کہ سورت کا نمبر اوپر اور آیت کا نمبر نیچے ہوتا ہے۔

والسلام!

مارچ ۱۹۷۴ء — طلوعِ اسلام ٹرسٹ، ۲۵۔ بی گلبرگ ۲، لاہور۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فہرست مشمولات

۸۔ رحمت

۱۱۔ مَنّ

۱۲۔ غضب۔ عتاب

۱۳۔ لعنت

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱

من و یزداں

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ مذہب کی بنیاد خدا کے ایمان پر ہے۔ مختلف مذاہب میں خدا کا نام بدل جائے گا لیکن اس کی ہستی کا اقرار، اس پر ایمان، ہر جگہ شرطِ اوّلیں ہوگا[1]۔ اس سے لازماً یہ سوالات سامنے آتے ہیں کہ خدا کیا ہے؟ وہ کیسا ہے؟ اسے ماننا کیوں ضروری ہے؟ اس کے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے؟ انسان اور خدا کا باہمی تعلق کیا ہے؟ یہ سوالات، جیسا کہ ظاہر ہے، بڑے اہم، بڑے مشکل اور بڑے نازک ہیں اور جب سے

سوال کی اہمیت

انسانی شعور نے آنکھ کھولی ہے، وہ ان کے اطمینان بخش جواب کے لئے مصروفِ تحقیق و کاوش ہے۔

قرآنِ کریم نے بھی دین کی عمارت، ایمان باللہ کی بنیادوں پر استوار کی ہے۔ اس لئے قرآن کے طالب علم کے سامنے بھی وہ سوالات آتے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ چونکہ ان سوالات کی اہمیت قرآن کے سامنے تھی، اسی لئے اس نے ان کا جواب بڑی شرح و بسط سے دیا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کے بلند، مجرّد حقائق (ABSTRACT TRUTHS) کے متعلق ہر شخص اپنی اپنی بصیرت کے مطابق ہی سمجھ سکتا ہے۔ میں اس باب میں، اپنی بصیرت کے مطابق جو کچھ سمجھ سکا ہوں، اسے ذیل کی سطور میں، مختصر الفاظ میں پیش کرنے کی

---

[1] اس میں شبہ نہیں کہ بعض مذاہب، مثلاً بدھ مت، ایسے ہیں جو خدا کی ہستی کے منکر ہیں، لیکن خود بدھوں کی حالت یہ ہے کہ وہ مہاتما بدھ کی خدا کی طرح پرستش کرتے ہیں سو، فرق صرف نام کا ہے۔ تصوّر ہر جگہ وہی ہے۔

کوشش کی گئی ہے۔ چونکہ (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے) یہ موضوع بڑا مشکل اور یہ مقامات بڑے نازک ہیں، اس لئے مجھے امید ہے کہ جو کچھ کہا جائے گا قارئین اسے پورے جذب و انہماک سے پڑھیں گے اور انتہائی غور و فکر سے سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ ہوسکتا ہے کہ اس سعی و کاوش سے قرآنی فکر کی مزید راہیں ہم پر کھل جائیں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

آپ تاریخِ انسانی کے کسی دور سے گزریئے اور روئے زمین کے کسی خطہ پر نگاہ ڈالئے' ایک چیز آپ کو بلالحاظ زمان و مکان، بالعموم تمام نوعِ انسانی میں مشترک نظر آئے گی، یعنی کسی بلند و بالا ہستی کا تصور، کسی فوق البشر قوت کا احساس' جس کے سامنے جھکا جائے' جس کی پرستش کی جائے' جس سے مرادیں مانگی جائیں' جس سے ڈرا جائے' جس کے حضور نذرانے پیش کئے جائیں' جس کے چرنوں میں شردھا (عقیدت) کے پھول چڑھائے جائیں۔ دنیا کے سیاح' مغربی محققین اور مکتشفین' اگر کسی ایسے علاقے میں بھی پہنچے ہیں' جہاں' اس سے قبل' کسی باہر کے انسان کے نقوشِ قدم دکھائی نہیں دیئے اور وہاں کے باشندے (تہذیب و تمدن سے قطعاً نا آشنا) یکسر حیوانی سطح کی وحشت و درندگی کی زندگی بسر کر رہے تھے' تو (اگرچہ وہ اپنی طرزِ بود و ماند اور معاشرت کے ہر گوشے میں باہر کی دنیا سے مختلف تھے' بایں ہمہ) ان کے ہاں بھی کسی غیر مرئی' بلند و بالا قوت کا تصور پایا گیا جس کی وہ پرستش کرتے تھے۔ مشہور یونانی مورخ' پلوٹارک (PLAUTARCH-AD 42-107) اس باب میں لکھتا ہے:

> زمین پر چلتے پھرتے تم ایسے شہر بھی دیکھو گے جن کی دیواریں نہیں ہیں۔ ایسے بھی جن میں سائنس کی کوئی علامت دکھائی نہیں دیتی' ایسے بھی جہاں حکمران کوئی نہیں' ایسے بھی جہاں نہ محلات ہیں نہ ورزش گاہیں' نہ تھیٹر' لیکن تم کوئی ایسا شہر نہیں پاؤ گے جہاں دیوتاؤں کے مندر نہ ہوں' جہاں دعائیں نہ مانگی جاتی ہوں' جہاں منتیں نہ مانی جاتی ہوں۔ ایسا شہر نہ آج تک کسی انسان نے دیکھا ہے نہ کبھی دیکھنے میں آئیگا۔[1]

اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاں اس قسم کی قوت کا احساس ہر جگہ موجود ہے' اس کا تصور اور اس کی تفاصیل ہر مقام پر مختلف ہیں۔ ایک ہی ملک میں' ایک قبیلے کا "معبود" دوسرے قبیلے کے معبود سے نہیں ملتا۔ ایک ملک کا "خدا" دوسرے ملک کے خدا

تصور میں اختلاف

---

[1] "اسلام کیا ہے"۔

سے مختلف ہے۔ ایک قوم کا "دیوتا" دوسری قوم کے "دیوتا" سے جداگانہ ہے۔ ایک فرقے کا "ایشور" دوسرے فرقے کے "ایشور" سے متبائن ہے۔ کچھ عرصہ پیشتر تک، مغربی محققین کے ایک گروہ کا خیال تھا (اور ممکن ہے اب بھی اس خیال کے مؤید وہاں موجود ہوں) کہ ابتدائی دور کے انسان نے جب دیکھا کہ بعض حوادث ایسے آتے ہیں، (مثلاً موسمی تغیرات، طوفانِ باد و باراں یا وبائی امراض وغیرہ) جن کے علاج و اسباب اس کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں اور اس کے ذہن کی ان تک رسائی نہیں ہو سکتی تو اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہو نہ ہو، ان حوادث کے پیچھے کوئی بہت بڑی قوتیں ہیں جو اسے نظر نہیں آتیں۔ اس طرح انسان کے ذہن میں "خدا" کا تصور پیدا ہوا۔ یہ تصور مختلف ممالک کے احوال و ظروف اور مختلف قبائل کے ماحول و کوائف کے ماتحت مختلف تھا۔ اس کے بعد، جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا اور انسان ترقی کرتا گیا، اس تصور میں بھی جِلا پیدا ہوتا گیا۔ اس طرح بتدریج "خدا" کا وہ تصور وجود میں آگیا جو دنیا کے بلند مذاہب کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس نظریہ کو "خدا کے تصور کا ارتقاء" کہا جاتا ہے جس کی تفصیل گرانٹ ایلن (GRANT ALLEN) کی کتاب (THE EVOLUTION OF THE IDEA OF GOD) یا فریزر (FRAZER) کی (GOLDEN BOUGH) وغیرہ کتابوں میں ملے گی۔ لیکن بعد کے محققین نے اس نظریہ کی تردید کر دی اور کہا کہ خدا کا صحیح تصور شروع سے ایک ہی رہا ہے۔ اس میں تدریج و ارتقاء کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس کی تردید

چنانچہ عصرِ حاضر کے مشہور مؤرخ ڈاکٹر آرنلڈ ٹوئن بی (DR. ARNOLD TOYNBEE) اپنی کتاب (AN HISTORIAN'S APPROACH TO RELIGION) میں لکھتا ہے کہ

> (پروفیسر) شمٹ کی تحقیق یہ ہے کہ خدا کی پرستش کا جو تصور بلند مذاہب نے پیش کیا ہے، یہ کوئی نیا تصور نہیں جسے انھوں نے ایجاد کیا ہو۔ نوعِ انسانی کا قدیم ترین مذہب یہی تھا جس کا احیاء بلند مذاہب نے کیا ہے۔ (ص ۱۸)

پروفیسر شمٹ (SCRMIDT) کی جس کتاب (THE ORIGIN AND GROWTH OF RELIGION) سے ڈاکٹر آرنلڈ نے مذکورہ بالا نتیجہ پیش کیا ہے، وہ اس موضوع پر عصرِ حاضر کی بہترین کتاب تصور کی جاتی ہے۔ اس میں اس نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ "انسان کے ابتدائی تمدن میں جس بلند ہستی کا تصور پایا جاتا ہے، وہ وہی تصور تھا جو توحید کے علمبردار مذاہب کی طرف سے پیش کیا گیا ہے چنانچہ نسلِ انسانی کے قدیم ترین قبائل میں سے اکثر کی نسبت یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ خدا کے متعلق ان کا یہی تصور تھا۔ لہٰذا ارتقائی

مذہب کا نظریہ اب عمرانیات کے پورے میدان میں یکسر دیوالیہ ثابت ہو چکا ہے۔" چونکہ ہماری کتاب کا موضوع، خدا کے تصور یا عقیدہ کا تاریخی استقصا نہیں، اس لئے ہم اس نکتہ کی مزید وضاحت ضروری نہیں سمجھتے ہمارے مقصدِ پیشِ نظر کے لئے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ قرآنِ کریم نے ہمیں بتایا ہے کہ جب سے انسان میں تمدّنی شعور بیدار ہوا، خدا کی طرف سے، بوساطت انبیائے کرامؑ، وحی کی راہنمائی آنی شروع ہو گئی۔ اس تعلیم کا نقطۂ ماسکہ خدا کے متعلق صحیح تصور تھا اور ظاہر ہے کہ

قرآن کا تصور

جب اس علم (وحی) کا سرچشمہ ایک ہی (خدا) تھا تو یہ تصور بھی شروع سے اخیر تک ایک ہی ہوگا (اور ایک ہی تھا)۔ لیکن ہوتا یہ رہا کہ ایک رسول آتا اور خدا کے اس بلند و بالا تصور کو نہایت وضاحت سے پیش کر دیتا۔ کچھ عرصہ کے بعد، یہ حقیقت لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی اور محسوسات کا خوگر انسان، الوہیت کے اس صاف اور شفاف تصور میں اپنی ذہنی رنگ آمیزی کرنے لگ جاتا۔ کبھی وہ ان چیزوں کو اپنا معبود بنا لیتا جن سے وہ ڈرتا اور خوف کھاتا، کبھی ان کو جن سے وہ اپنی کچھ توقعات وابستہ کرتا۔ کبھی ان ذہنی اور خیالی معبودوں کی عظمت و تقدیس کے پیشِ نظر ان کے مجسّمے کھڑے کرتا، بت تراشتا۔ چنانچہ یہ مختلف دیوی دیوتا۔ اندر۔ اگنی۔ سورج۔ چاند گنگا۔ جمنا۔ سانپ۔ گائے۔ بیل، سب اسی جذبۂ خوف و اُمید (یعنی دفعِ مضرّت اور جلبِ منفعت) کے اظہار کی مختلف شکلیں ہیں۔ جب ذہنِ انسانی پر اس طرح توہّم پرستی کی تاریکیاں چھا جاتیں، تو پھر ایک اور رسول آجاتا اور خدا کے پاکیزہ تصور کو وحی کے ذریعے انسانوں تک پہنچا دیتا اور انھیں واضح الفاظ میں بتا دیتا کہ انسان اشیائے کائنات کا مسجود ہے، ساجد نہیں۔ اس میں ایسی صلاحیتیں رکھ دی گئی ہیں جن کی رُو سے یہ اشیائے فطرت کو مسخّر کر سکتا اور ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکتا ہے۔ سمندروں کی شور انگیزیاں، پہاڑوں کی گراں سامانیاں، تحت الثّریٰ کی آتش فشانیاں، اَوجِ ثریّا کی طلعت آفرینیاں اور نور پاشیاں، دریاؤں کی (گاہ) دہشت خیز تلاطم خیزیاں اور (گاہ) سکون افزا روانیاں، ہواؤں کی تند و تیز جولانیاں، خوفناک صحراؤں کی دہشت انگیزیاں اور حیرت افروزیاں، غرضیکہ یہ جملہ کائنات اور اس کے مختلف اور متنوّع مظاہر، سب انسان کے سامنے ہاتھ باندھے خدمت کے لئے کھڑے ہیں۔ لہٰذا، ان چیزوں کے سامنے جھکنا اور انھیں اپنا آقا اور حاکم تصور کرنا چہ معنے؟

وحی کا یہ سلسلہ، اسی نہج و انداز سے جاری رہا، تا آنکہ جب ذہنِ انسانی سنِ شعور کے قریب پہنچ گیا تو خدا کا یہی پاکیزہ اور منزّہ، صاف اور شفاف، بلند و بالا تصور، ایک مکمل صورت میں، قرآن کے اندر دے دیا گیا

اور اس صحیفۂ آسمانی کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا گیا۔ چنانچہ اب، خدا کا صحیح تصوّر، (جسے خود خدا نے بیان کیا ہو) اپنی حقیقی اور اصلی شکل میں (جس میں ذہنِ انسانی کی رنگ آمیزی کا شائبہ تک نہ ہو) قرآن کی دفتین کے اندر ہے، اس سے باہر اور کہیں نہیں۔ اس لئے کہ آج دنیا کا کوئی مذہب بھی اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ جس کتاب کو آسمانی کتاب کہتے ہیں، وہ لفظاً لفظاً وہی ہے جو ان کے پیغمبر کو خدا کی طرف سے ملی تھی (تفصیل اس اجمال کی میری کتاب "مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں" میں ملے گی)۔ لہٰذا، جو شخص چاہتا ہے کہ اسے خدا کے متعلق وہ تصوّر مل جائے جسے خود خدا نے بیان کیا ہے، تو اس کے لئے قرآن کی طرف رجوع کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ زیرِ نظر کتاب کا مقصود و مطلوب یہی ہے کہ یہ بتایا جائے کہ قرآن نے خدا کا تصوّر کیا پیش کیا ہے۔

ذاتِ خداوندی

یہ ظاہر ہے کہ جہاں تک خدا کی ذات کا تعلق ہے، اس کی کنہ و حقیقت اور ماہیّت و کیفیت کا سمجھنا انسانی ذہن کے بس کی بات نہیں۔ ایک محدود (FINITE) ذہن، لامحدود (INFINITE) کا تصوّر کر ہی نہیں سکتا۔ خدا تو بہت بڑی چیز ہے[1]، دورِ حاضر کے مفکرین اور سائنسدان ہمیں بتلاتے ہیں کہ زمان (TIME) کی کوئی ابتدا نہیں اور مکان (SPACE) کی کوئی حد نہیں۔ یعنی یہ کہنا غلط ہے کہ زمانہ فلاں وقت سے شروع ہوا اور کائنات کی فضا کا آخری کنارہ، وہ ہے۔ نہ زمانہ کا کہیں سے آغاز ہوا، نہ فضا کا کوئی آخری کنارہ ہے۔ فلسفہ اور سائنس ہمیں یہ بتاتے ہیں، لیکن آپ اپنے ذہن پر زور ڈالئے اور ایک "لاابتدا" یا "لاانتہا" مکان کا تصوّر قائم کرنے کی کوشش کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ کے ذہن میں ان کا تصوّر آ ہی نہیں سکتا۔ آپ جتنا زیادہ ذہن پر زور ڈالیں گے، اتنی ہی جلدی آپ جھنجھلا اُٹھیں گے۔ سو جب، زمان اور مکان کے تصوّر کی یہ حالت ہے، تو خدا کی ذات کا تصوّر (جو زمان و مکان کا خالق ہے) کس طرح انسان کے حیطۂ ادراک میں آسکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ذاتِ خداوندی

---

[1] زمان و مکان تو پھر بھی مجرد (ABSTRACT) مباحث ہیں۔ ذہنِ انسانی کی تو یہ حالت ہے کہ ہم بچے کو جیومیٹری کا سب سے پہلا سبق یہ پڑھاتے ہیں کہ نقطہ (POINT) کا نہ طول ہوتا ہے نہ عرض، نہ ہی وہ جگہ گھیرتا ہے۔ اس کے باوجود وہ مرئی (VISIBLE) ہوتا ہے۔ آپ کسی ایسی چیز کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے جو طول، عرض اور حجم نہ رکھے اور اس کے باوجود مرئی اور محسوس ہو۔ بایں ہمہ، ہم نقطہ کے وجود کو مانتے ہیں۔ اس لئے کہ اس کی اسی تعریف (DEFINITION) پر جیومیٹری جیسے اہم علم کی ساری عمارت اٹھتی ہے۔

من ویزداں

کی کنہ وحقیقت کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ صرف یہ بتایا ہے کہ اس کی صفات (ATTRIBUTES) کیا ہیں۔

صفاتِ خُداوندی

قرآنی تعلیم کی عظمت اور بے مثالیت کا بنیادی گوشہ یہ ہے کہ ان صفات کی رُو سے خدا کا جو تصوّر سامنے آتا ہے، اس سے بلند، پاکیزہ اور مکمل تصوّر اور کہیں نہیں مل سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ (جیسا کہ آگے چل کر بتایا جائے گا) خود انسانی زندگی کے مقصود و منتہیٰ کا تعین، خدا کے تصور پر موقوف ہے۔ جس قسم کا خدا کا تصور کسی کے ہاں ہوگا، اُسی قسم کی اُس فرد کی زندگی اور اُس جماعت (یا قوم) کا معاشرتی نقشہ ہوگا۔ یہ غالباً مغربی مفکر کانٹ تھا جس نے کہا تھا کہ تم مجھے یہ بتادو کہ فلاں قوم نے کس قسم کا معبود پرستش کے لئے اختیار کر رکھا ہے اور میں تمہیں اس قوم کی تہذیب و تمدن کے متعلق سب کچھ بتادوں گا۔ فلہٰذا، خدا کا جو تصور قرآن نے پیش کیا ہے، جب وہ بے مثل و بے نظیر ہے، تو ظاہر ہے کہ اس تصور کی رُو سے، انسانی زندگی کا جو مقصود و منتہیٰ ہوگا اور اس کے حصول کے لئے جو راستے قرآن نے تجویز کئے ہونگے، (جنھیں وحی کی راہ نمائی کہتے ہیں) وہ بھی بے مثل و بے نظیر ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ کاروانِ انسانیت کو جو راہ نمائی قرآن کی رُو سے ملتی ہے، وہ کہیں اور نہیں مل سکتی۔

ہم نے اُوپر کہا ہے کہ جس قسم کا خدا (یعنی صفاتِ خداوندی) کا تصور ہمارے سامنے ہوگا اُسی قسم کی ہماری (انفرادی اور اجتماعی) زندگی ہوگی۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہماری زندگی کا خدا کے تصور کے ساتھ ...... بڑا گہرا اور بنیادی تعلق ہے۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے جسے اچھی طرح سے سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ انسانی زندگی کی ایک سطح وہ ہے جسے حیوانی سطح (ANIMAL LEVEL) کہا جاتا ہے۔ یہ زندگی خالص مادّی پیکر (آب و گِل) کی زندگی ہے جس کا مقصد (دیگر حیوانات کی طرح) تحفظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) اور تولیدِ نسل (PROCREATION) ہے۔ یہ زندگی اِس دنیا کی (طبیعی) زندگی ہے اور موت

انسانی زندگی

کے ساتھ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اسے مادّی تصورِ حیات (MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE) کہتے ہیں۔ لیکن قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ انسانی زندگی صرف طبیعی (حیوانی) زندگی سے عبارت نہیں۔ اس کے اندر ایک اور چیز بھی ہے جسے انسانی ذات (PERSONALITY) یا انسانی نفس (SELF) یا آنا یا ایغو (EGO) کہتے ہیں۔ قرآن اسے "رُوحِ خداوندی" (الوہیاتی توانائی یا (DIVINE ENERGY) کی اصطلاح سے تعبیر کرتا (نَفَخَ فِيهِ مِنْ رُّوحِهٖ ۳۲/۹)

اور "نفس" کہہ کر پکارتا ہے۔ انسانی جسم تو ہر آن بدلتا رہتا ہے، لیکن انسانی ذات خارجی تغیرات سے اثر پذیر نہیں ہوتی اور اگر اس کی مناسب نشوونما ہو جائے تو انسان اپنی طبعی موت کے بعد بھی زندہ رہ سکتا اور حیاتِ جاوید حاصل کر سکتا ہے۔ چونکہ اس موضوع پر میری متعدد تصانیف (مثلاً "ابلیس و آدم"، "انسان نے کیا سوچا"، "اسلام کیا ہے؟" اور "جہانِ فردا" وغیرہ) میں تفصیلی بحث کی جا چکی ہے اس لئے اس مقام پر صرف انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ "انسان نے کیا سوچا؟" کے مطالعہ سے یہ حقیقت بھی آپ کے سامنے آجائے گی کہ دورِ حاضر کے مغربی مفکر اور سائنسدان کس طرح رفتہ رفتہ، انسانی ذات کے متعلق قرآن کے پیش کردہ تصور سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں اور اس امر کا اعتراف کر رہے ہیں کہ انسانی زندگی کا موت کے ساتھ خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ قرآن نے انسانی ذات کو "روحِ خداوندی" کی اصطلاح سے تعبیر کر کے ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ

انسانی ذات

(۱) خدا کی بھی ایک ذات (PERSONALITY) ہے اور انسان کی بھی ایک ذات (PERSONALITY) ہے۔ واضح رہے کہ انسان کی ذات خدا کی عطا کردہ ہے، ذاتِ خداوندی کا جزو نہیں۔ ذات (PERSONALITY) ایک غیر منقسم وحدت (INDIVISIBLE UNITY) ہوتی ہے جو حصوں میں تقسیم نہیں ہو سکتی اور جب انسانی ذات، ذاتِ خداوندی کا جزو (یعنی حصہ) نہیں تو اویدانت یا تصوف کا یہ عقیدہ کہ انسانی ذات، آخر الامر، ذاتِ خداوندی میں مدغم ہو جائے گی اور اس طرح جزو اپنے کل سے مل جائے گا (جس طرح قطرہ دریا سے مل جاتا ہے) قرآن کے خلاف ہے۔

(۲) ذات (PERSONALITY) جہاں بھی ہوگی اس کے بنیادی خصائص (BASIC CHARACTERISTICS) ایک ہی ہوں گے۔

(۳) خدا کی ذات چونکہ مکمل ترین اور بلند ترین ذات ہے اس لئے اس کے خصائص و صفات بھی مکمل ترین اور بلند ترین ہیں۔ قرآن انہیں اسماء الحسنیٰ سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ اس ذات کے مختلف شئون یا (FACETS) ہیں۔

(۴) انسانی ذات ایک سمٹی ہوئی شکل میں اور (ذاتِ خداوندی کے مقابلہ میں) محدود ہے اس لئے اس کی صفات بھی (خدا کی صفات کے مقابلہ میں) محدود ہیں۔ لیکن بایں ہمہ اس میں (محدود طور پر) وہ تمام صفات موجود ہیں جنہیں (خدا کے سلسلہ میں) اسماء الحسنیٰ کہا جاتا ہے، بجز ان صفات کے جو خدا کی

لامحدودیت سے متعلق ہیں (اس کی تفصیل آگے چل کر آئے گی)۔

(۵) خدا کی ذات میں اس کی صفات مکمّل ترین شکل میں جلوہ بار ہوتی ہیں۔ انسانی ذات میں یہ صفات بطور ممکناتِ زندگی (RELISABLE POSSIBILITIES) یا مضمر (LATENT) یا مستتر (POTENT) یا خوابیدہ (DORMANT) شکل میں ہوتی ہیں۔ ان کا مشہود (MANIFEST) یا بارز (ACTUALISE) کرنا انسانی زندگی کا مقصود ہے۔ اسی کو انسانی ذات کی نشوونما (DEVELOP - MENT) کہتے ہیں۔

(۶) ظاہر ہے کہ ایک نچلی سطح (LOWER) کی ذات کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی تکمیل کے لئے کسی بلند (HIGHER) ذات کو بطور معیار (STANDARD) اپنے سامنے رکھے۔ اگر انسان کے سامنے اس قسم کا معیار نہ ہو تو وہ کبھی یقین اور وثوق کے ساتھ کہہ نہیں سکتا کہ اس کی ذات کی نشوونما ہو رہی ہے اور اگر ہو رہی ہے تو کس حد تک بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی ذات کی نشوونما ہو ہی نہ رہی ہو اور وہ اس خود فریبی میں مبتلا ہو کہ اس کی نشوونما (تزکیۂ نفس) ہو رہی ہے۔ لہٰذا انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی ذات کی نشوونما کے لئے صفاتِ خداوندی کو بطور معیار اپنے سامنے رکھے۔

قرآن نے صفاتِ خداوندی کو اس تفصیل و وضاحت اور حُسن و خوبی کے ساتھ اسی لئے بیان کیا ہے کہ انسان کے لئے ان کے معیار (اسٹینڈرڈ) بننے میں کسی قسم کا شک و شبہ یا ابہام و التباس نہ رہے۔ جوں جوں انسانی ذات میں ان صفات کی نمود ہوتی جاتی ہے، وہ (قرآن کے الفاظ میں) "خدا کے رنگ میں رنگا جاتا" یا اس کا "قرب" حاصل کرتا جاتا ہے۔

(۷) انسانی ذات میں ان صفات کی نمود کچھ ایسی شے نہیں جس کے متعلق کسی دوسرے کو کچھ علم ہی نہ ہو سکے اور پوچھنے والے سے یہ کہہ دیا جائے کہ

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

ان صفات کا اظہار انسان کی سیرت و کردار میں ہوتا ہے، جو مرئی اور محسوس شکل میں ہر ایک کے سامنے آجاتا ہے۔ اسی کو انسان کا کیرکٹر کہتے ہیں۔ یاد رکھئے، قرآنِ کریم کی رُو سے بلندیٔ اخلاق (کیریکٹر) ہی معراجِ انسانیت ہے۔ اس کے سوا "روحانیت" کا کوئی تصور نہیں۔ قرآنِ کریم میں تو "روحانیت" کا لفظ تک نہیں آیا۔ خود حضور نبیٔ اکرمؐ کے متعلق بھی یہی کہا گیا ہے کہ آپ "خلقِ عظیم کے حامل تھے"، یعنی بلند ترین کیریکٹر کے

حامل۔ (۴/۶۸)۔

(۸) خدا کی صفات کو اپنے سامنے بطور معیار رکھ لینا اور اپنی ذات میں ان کی نمود کو زندگی کا نصب العین قرار دے لینا، ایمان باللہ (خدا پر ایمان) کہلاتا ہے۔

(۹) جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، انسانی ذات، ہر انسان کو خدا کی طرف سے ملتی ہے لیکن ملتی ہے غیر نشوونما یافتہ شکل میں۔ انسان کا جو عمل، قرآنی پروگرام کے مطابق ہوگا اس سے انسانی ذات کا استحکام ہوگا۔ جو اس کے خلاف ہوگا اس سے اس میں ضعف و اضمحلال واقع ہوگا (اسے قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں)۔ ان اعمال کا نتیجہ اس دنیا میں بھی سامنے آجاتا ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی۔ لہٰذا، انسانی ذات پر ایمان کے معنی، خدا پر ایمان، اس کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان اور حیاتِ آخرت پر ایمان کے ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ خدا اور انسان کا بنیادی تعلق کیا ہے اور اس لئے صفاتِ خداوندی کا اپنی حقیقی اور بلاآمیزش شکل میں سامنے ہونا کس قدر ضروری۔ خدا پر ایمان کا لازمی نتیجہ انسان کا اپنی ذات کے وجود پر ایمان ہے جو اسے حیوانی سطح کی زندگی سے بہت بلند لے جاتا ہے۔ مغرب کے مادی (میکانکی) تصورِ حیات اور قرآنی تصورِ زندگی کا یہ بنیادی فرق ہے اور اسی فرق سے دونوں کے راستے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہو جاتے ہیں۔ راستے بھی مختلف اور منزلیں بھی مختلف۔ اسے پھر سن لیجئے کہ جس شخص کا اپنی ذات پر ایمان نہیں، اس کا خدا پر ایمان کچھ معنی نہیں رکھتا۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ یوں تو ذات (PERSONALITY) کی ہر خصوصیت اپنی جگہ اہم ہوتی ہے لیکن ان میں سے دو خصوصیات ایسی ہیں جنہیں بنیادی کہا جا سکتا ہے۔ یعنی حریت (FREEDOM) اور استغنا (INDEPENDENCE)۔

ذات کی بنیادی خصوصیتیں

استغنار کے معنی ہیں اپنی ذات میں کسی دوسرے کا محتاج نہ ہونا۔ بغیر کسی خارجی سہارے کے از خود قائم رہنا (اسے قرآن کی اصطلاح میں صمدیت کہتے ہیں)۔ اور حریت سے مراد ہے صاحبِ اختیار دارادہ ہونا۔ خدا، جو ذاتِ مطلق اور مکمل ہے، وہ انتہائی شکل میں غَنِيٌّ حَمِيدٌ (۲/۲۶۷) اور فَعَّالٌ لِمَا يُرِيدُ (۱۱/۱۰۷) ہے یعنی اس میں صمدیت اور حریت کی صفات اپنی انتہا تک پہنچی ہوئی ہیں (صمدیت کے متعلق تو ہم کسی دوسرے مقام پر گفتگو

کریں گے، جہاں تک حریت کا تعلق ہے، خدا، مطلق قوتوں اور لامحدود اختیارات کا مالک ہے، لیکن اس کے باوجود، اس نے خود ہی اپنے اختیارات اور اقتدارات پر کچھ پابندیاں عائد کر رکھی ہیں یعنی (SELF IMPOSED LIMITATIONS) مثلاً قرآن میں ہے۔ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (۶/۱۲)

پابندیاں

"اللہ نے اپنے اوپر اشیائے کائنات کی ربوبیت (یعنی انھیں سامانِ نشوونما بہم پہنچانا) فرض کر رکھا ہے۔ دیکھئے! یہ ایک پابندی ہے، لیکن اس قسم کی پابندیوں سے اس ذات کی حریت پر کسی قسم کا حرف نہیں آتا۔ اس سے وہ کسی غیر کی محکوم نہیں ہو جاتی۔ محکومی، خارج سے عائد شدہ احکام کی پابندیوں کو کہتے ہیں۔ خود عائد کردہ قیود کی پابندی محکومی نہیں کہلاتی۔ اگر آپ کسی کے حکم سے کسی جگہ خاص وقت پر پہنچتے ہیں، تو یہ محکومی ہے۔ لیکن اگر آپ اپنی مرضی سے وقت کی پابندی کرتے ہیں تو اسے محکومی نہیں کہا جائے گا۔ یہ اصول پرستی ہوگی۔

خدا کا اپنے مطلق اختیارات پر خود ہی پابندیاں عائد کر لینا ایک عظیم حقیقت کا مظہر ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا اپنے اختیارات اور قوتوں کو ایک مطلق العنان ڈکٹیٹر کی طرح استعمال نہیں کرتا، بلکہ قاعدہ اور قانون کے مطابق استعمال کرتا ہے اور قاعدے اور قانون سے مطلب یہ ہے کہ کائنات میں جس قسم کے حالات کا تقاضا ہو، وہاں اسی قسم کی صفتِ خداوندی کا ظہور ہو جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں، اسے یوں سمجھئے کہ جس قسم کے خارج میں حالات ہوں، اسی کے مطابق خدا کی طرف سے ردِّ عمل (REACTION) ہوتا ہے۔ (واضح رہے کہ جب خدا کے لئے "ردِّ عمل" کی اصطلاح استعمال کی جائے تو اس سے وہ مفہوم قطعاً مقصود نہیں ہوتا جو مفہوم انسانی ردِّ عمل کا ہوتا ہے۔ انسانی ردِّ عمل کی بنیاد، بیشتر صورتوں میں، جذبات پر ہوتی ہے اور خدا کی ذات، جذبات سے منزہ ہے)۔ یہ حقیقت کہ خاص حالات میں خدا کی ایک خاص

سُنَّۃِ اللہ کا مفہوم

صفت کا ظہور ہوتا ہے، قانونِ خداوندی کہلاتی ہے اور چونکہ خدا کی صفات غیر متبدل ہیں، اس لئے قوانینِ خداوندی بھی غیر متبدل ہوتے ہیں۔ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (۱۰/۶۴)۔ قانونِ خداوندی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا (۳۵/۴۳) "تم قانونِ خداوندی میں تبدّل و تحوّل ہرگز نہیں دیکھو گے"، اسی عظیم حقیقت کا اعلان ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نظامِ کائنات "فطرت کی اندھی قوتوں" کی رُو سے نہیں چل رہا، بلکہ غیر متبدل اور متعیّن قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہے۔ قرآن نے

مطالعۂ فطرت اور مشاہدۂ کائنات پر بڑا زور دیا ہے۔ اسے وہ بِلِقَآءِ رَبِّکُمْ (۱۳/۲)۔ [خدا کے آمنے سامنے ہونے] کا ذریعہ بتاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مطالعۂ فطرت سے، وہ قوانینِ خداوندی بے نقاب ہو کر انسان کے سامنے آجاتے ہیں جن کا تعلق نظم و نسقِ کائنات سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم 'مطالعۂ فطرت اور مشاہدۂ کائنات کو' خدا پر ایمان لانے کا ایک ذریعہ قرار دیتا ہے (تفصیل اس اجمال کی میری کتاب ـــ اسلام کیا ہے ـــ کے باب "انسان اور خارجی کائنات" میں ملے گی)۔

خارجی کائنات میں خدا کے قوانین، از خود جاری و ساری ہیں اور ہر شے ان کی پابندی پر مجبور۔ ان میں سے کسی شے کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ ان قوانین سے کسی قسم کی سرتابی کر سکے، وہ سب ان کے سامنے سربسجود ہیں۔ لِلّٰهِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۱۳/۱۵)۔ "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب قوانینِ خدا کے سامنے جھکا ہوا ہے"۔ لیکن انسان کو چونکہ ذات (PERSONALITY) عطا ہوئی ہے اور ذات کی بنیادی خصوصیت حرّیت (FREEDOM) ہے، اس لئے انسان کو ان قوانین کی پابندی پر مجبور نہیں پیدا کیا گیا۔ اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو ان کی پابندی کرے اور چاہے ان سے سرتابی اختیار کرلے۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ (۱۸/۲۹) "جس کا جی چاہے انھیں تسلیم کرے، جس کا جی چاہے ان سے انکار کر دے"۔ اگر وہ ان قوانین کی پابندی کرے گا تو اس کی ذات کی نشوونما ہو جائے گی، نہ کرے گا تو اس کی ذات دبی ہوئی (UN-DEVELOPED) رہ جائے گی اور یہ واقعہ ہے کہ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰهَا ۝ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۝ (۹۱/۹-۱۰) "جس کی ذات کی نشوونما ہو گئی، وہ کامیاب و کامران ہو گیا اور جس کی ذات دبی ہوئی رہ گئی، وہ تباہ و برباد ہو گیا۔

انسان اور پابندیٔ قوانین

اس سے ہمارے سامنے دو تین اہم باتیں آجاتی ہیں۔

(۱) قوانینِ خداوندی کی پابندی، خارج سے عائد کردہ احکام کی کرھًا (مجبورًا) پابندی نہیں ہوتی، بلکہ انسانی ذات کی از خود عائد کردہ قیود کی پابندی ہوتی ہے۔ اسی لئے قرآن نے اسے اطاعت سے تعبیر کیا ہے، جس کے معنی ہیں کسی کام کو بطیبِ خاطر، دل کی پوری رضامندی سے کرنا۔ جو کام مجبورًا کیا جائے اس سے انسانی ذات کی نشوونما ہونا تو کجا، وہ دب کر اور کچل کر رہ جاتی ہے۔ بطیبِ خاطر، قوانینِ خداوندی کی

اطاعت سے، انسانی ذات کے اختیار وارادہ کی صلاحیت میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (۲/۲۸۶) ــــ می شود از جبر پیدا اختیار ــــ اس کو کہتے ہیں۔

(۲) یہ قوانینِ خداوندی، چونکہ صفاتِ خداوندی کے مظاہر ہوتے ہیں، اس لئے ان کی اطاعت، خود انسانی ذات کے معیارِ اعلیٰ کا اتباع ہوتی ہے، یعنی اس کے رنگ میں رنگے جانے اور اس کے قالب میں ڈھل جانے کی آرزو اور کوشش۔ بالفاظِ دیگر، ان سے انسانی ذات کے تقاضوں کی تسکین ہوتی ہے۔ مثلاً جیسے طبعی دنیا میں جب کسی کو پیاس لگے اور کوئی اس سے کہے کہ پانی پی لو، تو یہ اس کے "حکم کی تعمیل" نہیں ہوگی بلکہ اپنے جسم کے طبعی تقاضا کی تسکین ہوگی۔

(۳) ان قوانین کی اطاعت سے ایک طرف انسانی ذات کا اثبات (AFFIRMATION) ہوتا ہے اور وہ علیٰ وجہ البصیرت دیکھ لیتا ہے کہ اس کا مقام تمام خارجی کائنات سے بلند ہے۔ دوسری طرف، اس سے (اپنی ذات کے مقابلہ میں) ذاتِ خداوندی کی علویت اور بلندی اُبھر کر سامنے آجاتی ہے، جس سے یہ حقیقت بے نقاب ہوجاتی ہے کہ وہ جہاں ساری کائنات سے ارفع و اعلیٰ ہے وہاں اپنے معیارِ کبریٰ (ذاتِ خداوندی) کے مقابلہ میں بہت نیچے ہے۔ (صلوٰۃ میں قیام اور سجدہ، انہی دونوں احساسات کے مظہر ہیں، قیام میں تمام کائنات کے مقابلہ میں، انسانی ذات کا اثبات اور ارتفاع مقصود ہوتا ہے اور رکوع و سجود میں انسانی ذات کا ذاتِ خداوندی کے مقابلہ میں خضوع و تعبّد)۔

(۴) اس سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ کائنات کی کوئی شے انسان کی ہم سنگ نہیں ہوسکتی۔ اس لئے کہ کائنات میں صاحبِ ذات (PERSONALITY کا مالک) صرف انسان ہے۔ مغرب کا مادہ پرست (MATERIALIST) چونکہ اپنے آپ کو دیگر اشیائے کائنات کی طرح (مادہ کی پیداوار (یا از قبیلِ مادہ) سمجھتا ہے، اس لئے وہ اس جہانِ رنگ و بو میں جذب ہوسکتا ہے، لیکن قرآنی تصورِ حیات پر یقین رکھنے والا، اس محسوس کائنات میں اپنے آپ کو منفرد پاتا ہے۔ اس کا رفیق کوئی دوسرا صاحبِ ذات ہوسکتا ہے یعنی برابر کی سطح پر، ایک انسان کا رفیق، دوسرا انسان ہوسکتا ہے اور بلند درجہ پر انسان کا رفیق، خود خدا ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبیٔ اکرمؐ نے خدا کو "الرَّفِیْقُ الْاَعْلٰی" کہا ہے

خدا کا رفیق

خدا سے رفاقت کا تعلق ہمیں حقیقت کے ایک اور اہم گوشے کی طرف لے جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خارجی کائنات میں قوانینِ خداوندی کے نتائج محسوس شکل میں سامنے آجاتے ہیں۔ بعض جلدی سے، بعض بہت دیر میں۔ مثلاً کسی درخت کے بیج میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ قانونِ خداوندی کے مطابق اس کی نشوونما کی جائے تو وہ ایک دن تناور درخت بن کر سامنے آجائے گا۔ یہ نتیجہ ہماری زندگی میں ہمارے سامنے آسکتا ہے لیکن فطرت کی بعض اسکیمیں ایسی بھی ہیں جن کے نتائج ہزارہا سال کے بعد جا کر مرتب ہوتے ہیں۔ مثلاً زندگی کے اوّلین جرثومہ کا مختلف ارتقائی مراحل طے کرنے کے بعد انسانی پیکر تک پہنچنا۔ یہ کہیں کروڑوں برس کے بعد جا کر ہوا۔

لیکن ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اگر فطرت کے ساتھ انسان کا ہاتھ شامل ہو جائے تو نہ صرف اس مدت میں بہت تخفیف ہو جاتی ہے جس میں کسی عمل نے (تنہا فطرت کے قاعدے کے مطابق) نتیجہ خیز ہونا تھا، بلکہ اس کے حسن و رعنائی اور افادیت و رفاہیت میں بھی بیش بہا اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہی پودا جو عام حالات میں چھ ماہ کے بعد پھول کھلاتا تھا اور وہ بھی صرف ایک رنگ کا، یورپ کی تجربہ گاہوں میں چوبیس گھنٹے میں، چار چار مختلف رنگوں کے پھول سامنے لے آتا ہے، یعنی جب انسان، قوانینِ خداوندی کا رفیق بن جاتا ہے تو خدا کے تخلیقی پروگرام میں تیزی آجاتی اور نتائج میں حسن پیدا ہو جاتا ہے۔

قوانینِ خداوندی کے نتیجہ خیز ہونے کی جو شکل خارجی کائنات میں ہے، وہی صورت انسانی دنیا میں بھی ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے کہ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ (۲۱/۱۸) کائنات میں یہ اصول کار فرما ہے کہ یہاں حق و باطل میں کشمکش جاری رہتی ہے۔ اس کشمکش میں حق، باطل کا سر توڑ دیتا ہے اور اس طرح باطل آخر الامر نیست و نابود ہو جاتا ہے یعنی تعمیری قوتیں آخر الامر تخریبی قوتوں پر غالب آجاتی ہیں اور اس طرح کائنات اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہ فطرت کا قانون ہے۔ جیسا کہ قرآن نے بتایا ہے، ”خدا کا ایک ایک دن“ ہمارے حساب و شمار سے ہزار ہزار (۲۲/۴۷) اور پچاس پچاس ہزار (۷۰/۴) سال کے برابر ہوتا ہے لیکن اگر اس کے ساتھ انسانوں کی رفاقت شامل ہو جائے تو حق کا یہی غلبہ چند دنوں میں سامنے آسکتا ہے لیکن یہ رفاقت انہی انسانوں کی طرف سے عمل میں آسکتی ہے جو قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقینِ محکم رکھتے ہوں اور ان کے مطابق اپنی ذات کی نشوونما کے لئے مصروفِ سعی و عمل ہوں (ایمان اور عملِ صالح اسی کو

کہتے ہیں) ایسے انسانوں کے گروہ کو جماعتِ مومنین یا حزب اللہ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اس جماعت کی سعی و عمل سے ایسا معاشرہ وجود میں آتا ہے جس میں قوانینِ خداوندی کم از کم وقت میں اثر انگیز اور نتیجہ خیز ہوتے چلے جاتے ہیں اور اس طرح افرادِ معاشرہ کی نشوونما ہوتی رہتی ہے۔ قرآن نے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف جماعت کے اندر (قرآنی معاشرہ میں) ہو سکتی ہے۔ وہ فرد کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي (۲۹/۳۰) جنت میں داخل ہونا چاہتے ہو تو خدا کے بندوں کی جماعت میں داخل ہو جاؤ۔ صادقین کی معیت (كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ (۹/۱۱۹)) اس کی بنیادی شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے خانقاہیت کی خلوت گاہوں اور زاویہ نشینی کے تجرّد کدوں کو ذہن انسانی کی اختراع بتایا ہے (۵۷/۲۷) جو خدا کے تجویز فرمودہ دین کے خلاف ہے۔ خدا کا دین معاشرہ کے اندر قائم ہوتا ہے۔ دین، انسانوں کے باہمی معاملات کے لئے اصول و ضوابط عطا کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی جنگل میں چلا جائے جہاں کوئی دوسرا انسان نہ ہو، تو اسے نہ دین کی ضرورت ہوتی ہے، نہ ایمان کی حاجت۔ نہ اس کی ذات کی نشوونما ہو سکتی ہے، نہ انسانی زندگی کے ارتقاع کی کوئی شکل۔ وہ درحقیقت، انسانی سطح پر زندگی بسر ہی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا، دین، اجتماعیت کا مقتضی ہے اور فرد کی ذات کی نشوونما معاشرہ کے اندر ہی ممکن ہے۔

فرد اور معاشرہ

اب ایک قدم اور آگے بڑھیئے۔ جب دنیا میں کوئی دو انسان اپنی زندگی کا نصب العین ایک ہی مقرر کر لیں، یعنی ان کے سامنے مقصود و منتہیٰ ایک ہو اور جس قالب میں وہ اپنی زندگی کو ڈھالنا چاہیں، وہ بھی ایک ہو تو ان میں قلب و نگاہ کی ہم آہنگی کا پیدا ہو جانا ضروری ہے۔ اسی کا نام وحدتِ فکر و نظر یا ایمان کا اشتراک ہے۔

یہی وحدتِ فکر و نظر ہے جسے قرآن انسانوں میں وجہ جامعیت قرار دیتا ہے، یعنی دنیا کے دو انسان ـــــ وہ کہیں بستے ہوں، ان کا رنگ، زبان، نسل، وطن کوئی ہو، اگر وہ صفاتِ خداوندی کو اپنے سامنے بطور خارجی معیار رکھ لیں اور اس کے مطابق اپنی ذات کی نشوونما کے لئے کوشاں ہوں، تو وہ دونوں انسان (رنگ، نسل، زبان،

قومیت کی تشکیل

وطن کے بُعد اور تفاوت کے باوجود) ایک جماعت کے رُکن اور ایک قوم کے افراد ہوں گے۔ قرآن نے قومیت کی تشکیل کے لئے یہی معیار بتایا ہے۔ اس طرح انسانوں میں جو وحدت پیدا ہوتی ہے وہ خون، رنگ، زبان اور وطن کے رشتوں سے کہیں زیادہ محکم اور پائیدار ہوتی ہے۔ اگر یہی وحدت پھیلتی جائے اور دنیا کے زیادہ سے زیادہ انسان اس طرح ایک دوسرے سے ہم آہنگ اور یک رنگ ہوتے جائیں تو اس سے تمام نوعِ انسانی ایک عالمگیر برادری بن جائے گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ خدا کی توحید (یعنی اس کی ذات کو بطور معیار

وحدتِ انسانیّت

اپنے سامنے رکھنے) کا لازمی نتیجہ وحدتِ انسانیت ہے۔ اس کے سوا وحدتِ انسانیت کی کوئی اور بنیاد نہیں۔ قرآن کا مقصود و منتہیٰ یہ ہے کہ رفتہ رفتہ تمام انسان، خدا کی توحید کو اپنی زندگی کا عملی شعار بنا کر ایک عالمگیر برادری بن جائیں اور اس طرح وہ تمام اختلافات مٹ جائیں جن کی وجہ سے آج دنیا درندوں کا بھٹ بن رہی ہے۔

خدا پر ایمان

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ قرآن کی رُو سے خدا کا تصور کیا ہے اور خدا پر **ایمان** سے مفہوم کیا۔ اس کے بعد یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن، تمام دنیا کے انسانوں سے اس کا مطالبہ کیوں کرتا ہے کہ وہ اس خدا پر ایمان لائیں جس کا تصور قرآن نے پیش کیا ہے۔ دنیا میں چند دہریوں (ATHEISTS) کو چھوڑ کر، ہر شخص، ہر قبیلہ، ہر قوم، کسی نہ کسی رنگ میں "خدا کا قائل ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ تمہارا اس طرح خدا کو ماننا، درحقیقت، خدا کو ماننا نہیں۔ یہ اُس خدا کا ماننا ہے جس کا تصور، تمہارے یا تمہارے جیسے دوسرے انسانوں کا تراشیدہ ہے۔ جیسے (مثلاً) ایک شخص کہتا ہے کہ میں مانتا ہوں کہ سونا ایک اچھی دھات ہے۔ اس کا رنگ سفید ہوتا ہے، مرطوب ہوا میں اس پر زنگ لگ جاتا ہے، سخت چیز سے ٹکرانے سے وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ چونکہ دنیا میں سب سے ہلکی دھات ہے اس لئے عام طور پر ہوائی جہازوں کی ساخت میں کام آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ان صفات کی حامل دھات کو "سونا" کہہ کر اس کے وجود کا قائل ہوتا ہے، وہ درحقیقت، (حقیقی) سونے کے وجود سے انکار کرتا ہے۔ سونے کے وجود کا قائل اس شخص کو مانا جائے گا جو اس کی صحیح اور حقیقی صفات کا قائل ہو۔ لہٰذا، جو شخص خدا کا تو قائل ہو لیکن اس کی صفات کا صحیح تصور اس کے سامنے نہ ہو، اس کا خدا کو ماننا، حقیقی خدا سے انکار کے مرادف ہوگا لہٰذا، خدا پر ایمان اس شخص کا تسلیم کیا جائے گا جو اس

خدا کا قائل ہو جس کی صفات قرآنِ کریم نے بیان کی ہیں اور جو صفات قرآن کے سوا اور کہیں مذکور نہیں۔

قرآنی ایمان کی خصوصیات

نہ صرف یہ کہ خدا کا جو تصور قرآن پیش کرتا ہے وہ کہیں اور نہیں ملتا، بلکہ خدا اور انسان کا جو تعلق قرآن بتاتا ہے، اس کا تصور بھی کہیں اور نہیں پایا جاتا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ

(۱) تمام کائنات پر خدا کا اقتدار و اختیار ہے لیکن وہ اپنے اقتدار و اختیار کو اپنے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق استعمال کرتا ہے اور ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ بالفاظِ دیگر یہ تمام سلسلۂ کائنات لگے بندھے قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہے جو محکم اور اٹل ہیں۔ یہی قوانین خود انسانوں کی دنیا میں بھی کارفرما ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا ہر عمل ایک متعین نتیجہ پیدا کرتا ہے اور اس میں کبھی استثناء نہیں ہوتی۔ ہر انسان کو اس کا اختیار ہے کہ وہ جو عمل چاہے کرے، لیکن ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ عمل تو ایک قسم کا کرے اور اس کا نتیجہ دوسری قسم کا پیدا کرے۔ جس قسم کا عمل ہوگا اسی قسم کا نتیجہ مرتب ہوگا۔ یہ نتائج خدا کے متعین کردہ قوانین کے مطابق مرتب ہوتے ہیں۔

(۲) بجز ان صفات کے جن کا تعلق خالصتہً خدا کی لاتناہیت اور لامحدودیت سے ہے، (مثلاً یہ کہ اسے کسی نے پیدا نہیں کیا، نہ ہی وہ عدم سے وجود میں آیا ہے) انسانی ذات کی بنیادی صفات وہی ہیں جو صفات ذاتِ خداوندی کی ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ انسانی ذات کی یہ صفات، محدود اور سمٹی ہوئی شکل میں ہوتی ہیں، نیز قابلِ نشوونما (UN-DEVELOPED)۔ ان کی نشوونما اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ انسان، صفاتِ خداوندی کو اپنے سامنے بطور معیار رکھے۔ یہ انسان اور خدا کا بنیادی تعلق ہے۔ جس چیز کو قوانینِ خداوندی کی اطاعت کہتے ہیں وہ (معاذ اللہ) کسی مستبد، مطلق العنان ڈکٹیٹر کے احکام کی فرماں پذیری نہیں ہوتی بلکہ ان ہدایات (DIRECTIONS) کا اتباع ہوتا ہے جن سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ ان ہدایات کے اتباع سے اس ذات کے تقاضوں کی تسکین ہوتی ہے۔

اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ جب ہم خدا کی صفات (اسماء الحسنیٰ) کا ذکر کرتے ہیں تو وہ (سمٹی ہوئی اور محدود شکل میں) گویا خود ہماری ذات کی صفات کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں ہے لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ کِتَابًا فِیْہِ ذِکْرُکُمْ (۲۱/۱۰ و دیگر مقامات) یقیناً ہم نے تمہاری طرف ایک

کتاب نازل کی ہے جس میں تمھارا ذکر ہے (ذکر کے معنی عظمت و شرف بھی ہیں اور تذکرہ بھی)۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

محمدؐ بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

(۳) جوں جوں انسانی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے، وہ خدا کے تخلیقی پروگرام میں شریک ہوتا جاتا ہے۔ اس طرح خدا اور بندے کا تعلق رفاقت کا ہو جاتا ہے جس میں خدا بہرحال رفیقِ اعلیٰ ہوتا ہے۔

خدا اور انسان کا یہ تعلق قرآن کے علاوہ کہیں اور نہیں ملے گا۔ مشرق کے اہلِ مذاہب کے ہاں خدا کے ساتھ انسان کا تعلق اتنا ہی ہے کہ انسان خدا کی پرستش کرتا ہے کیونکہ یہ خدا کا حکم ہے جسے انسان کو طوعاً و کرھاً ماننا ہے۔ اگر کوئی اس کا حکم نہ مانے تو خدا ناراض ہو جاتا ہے؛ اسے راضی کرنے کے لئے اس کے حضور نذر نیاز گزارنا یا اس کے کسی "مقرب" کی وساطت سے اس تک سفارش پہنچانا ضروری ہے۔ جب وہ اس طرح خوش ہو جاتا ہے، تو انسان کی مرادیں بر آتی ہیں۔ وہ ناراض رہتا ہے تو انسان مصیبت میں پھنس جاتا ہے۔

اس کے برعکس، مغرب کے اربابِ فکر و نظر کے نزدیک خدا کا تعلق صرف خارجی کائنات سے ہے جس میں اس کے قوانین (قوانینِ فطرت کی شکل میں) کارفرما ہیں۔ انسان کا کام یہ ہے کہ ان قوانین کا مطالعہ کرے اور ان کے مطابق فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے اپنے کام میں لائے۔ باقی رہی انسانی دنیا، سو اس میں انسانوں کو اپنے معاملات اپنی عقل و فہم کی رُو سے طے کرنے ہوں گے۔ ان کے لئے کوئی غیر متبدل اصول اور قوانین نہیں۔

خدا کے ساتھ تعلق کا ایک تصور ان لوگوں کا ہے جو "روحانیت" کے قائل ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ان کا خدا کے ساتھ براہِ راست تعلق ہوتا ہے۔ وہ خدا سے باتیں کرتے ہیں، اس سے ملاقاتیں کرتے ہیں، لوگوں کی دعائیں اس سے منظور کراتے ہیں، وہ انھیں غیب کی باتیں بتاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے تعلقات کا تصور بھی قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ خدا نے انسانوں کو جو کچھ بتانا تھا، اپنی کتاب (قرآنِ کریم) میں آخری مرتبہ مکمل طور پر بتا دیا۔ اب انسانوں کے خدا کیساتھ تعلق کا ذریعہ صرف اس کی کتاب کی اطاعت ہے۔

اس سے آپ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہوگی کہ دنیا کے "خدا پرستوں" کے متعلق بھی قرآن کا یہ ارشاد کیوں ہے کہ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (۲/۱۳۷) اگر یہ لوگ

اس طرح ایمان لائیں جس طرح (اے جماعتِ مومنین) تم ایمان لائے ہو، تب سمجھئے کہ انھیں زندگی کا صحیح راستہ مل گیا"۔ اگر یہ اس طرح ایمان نہ لائیں اور اپنے اپنے تصور کے مطابق خدا کو مانتے رہیں، تو خدا کے رجسٹر میں ان کا شمار "اللہ کو ماننے والوں" میں نہیں ہوگا، یعنی قرآن کی رُو سے اسے ایمان باللہ نہیں کہا جائے گا۔ ضمناً اسے بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ "خدا کو ماننے" کا عملی تصور اس کے احکام و قوانین کی اطاعت ہے۔ جو شخص زبان سے "خدا کو مانتا ہے"، لیکن اطاعت، غیر اللہ کے احکام کی کرتا ہے، قرآن کریم اس کا شمار خدا کے ماننے والوں میں نہیں کرتا۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ہ (۵/۴۴)۔ جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، انھیں کافر کہا جاتا ہے۔

اسماء الحسنیٰ قرآن نے صفاتِ خداوندی کا عمومی ذکر ہی نہیں کیا بلکہ انہیں الاسماء الحسنیٰ کہہ کر ایک اور حقیقت کی طرف بھی توجہ منعطف کرائی ہے۔ حسنیٰ، حسن سے ہے اور حسن صحیح صحیح تناسب PROPORTION کا نام ہے۔ اگر کسی شے کا ذرا سا تناسب بھی بگڑ جائے تو اس کا حسن باقی نہیں رہتا۔ اسی لئے تو مورخین نے کہا ہے کہ "اگر قلوپطرہ کی ناک ذرا چپٹی ہوتی، تو تاریخ کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔" اسماء الحسنیٰ کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی یہ صفات جہاں مکمل ترین اور اعلیٰ ترین ہیں، وہاں ان میں انتہائی تناسب بھی پایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صفات و خصائص سے صحیح (اور تعمیری) نتائج اسی صورت میں مرتب ہو سکتے ہیں جب ان صفات و خصائص میں صحیح صحیح تناسب و توازن ہو۔ کوئی نسخہ کارگر نہیں ہو سکتا جب تک اس کی ادویات کے اوزان میں صحیح تناسب نہ ہو۔ اس تصور کو ذرا آگے بڑھایئے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ (مثلاً) پانی حیات بخش ہے لیکن صرف اسی صورت میں جب جسمِ انسانی میں اس کا تناسب صحیح ہو۔ اگر اس تناسب میں ذرا سی بھی کمی بیشی واقع ہو جائے، تو انسان کی صحت بگڑ جاتی ہے۔ صرف صحت ہی نہیں بگڑتی بلکہ اگر اس کی افراط حد سے بڑھ جائے (جیسے ڈوبنے میں ہوتا ہے) تو اس سے فوری موت واقع ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف سنکھیا سمِ قاتل ہے لیکن اگر اسے صحیح مقدار میں دیا جائے تو ممدِ حیات اور قوت افروز ہو جاتا ہے۔ عالمِ طبعی سے ہٹ کر اخلاقیات کی طرف آیئے، تو اس میں بھی یہی حقیقت کارفرما نظر آتی ہے۔ (مثلاً) شرافت ایک عمدہ جوہر ہے لیکن یہ ذرا اپنی حد سے بڑھ جائے تو بے غیرتی بن جاتی ہے۔ عفو و درگذری اپنی حد کے اندر عمدہ خصلت ہے لیکن ذرا تفریط میں پہنچے تو بزدلی سے تعبیر ہو جاتی ہے۔ دولت خرچ کرنا زندگی کے لئے ضروری ہے لیکن یہ ذرا افراط کی طرف

چلی جائے تو اسراف ہو جاتا ہے اور تفریط کی طرف نکل جائے تو بخل بن جاتا ہے۔ لہٰذا صفات و خصائص اسی صورت میں خوشگوار نتائج مرتب کرتے ہیں جب ان کا تناسب صحیح ہو۔ بالفاظِ دیگر، صحیح نتائج مرتب کرنے کے لئے اسماء کا حسنیٰ ہونا نہایت ضروری ہے۔

جس طرح ذاتِ خداوندی میں اسماء حسنیٰ ہیں، اسی طرح جب انسانی ذات میں نشو و نما ہو تو اس کی صفات کے لئے بھی حسنیٰ ہونا نہایت ضروری ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ قرآن کی ساری تعلیم اسی محور کے گرد گردش کرتی ہے۔ اس میں وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ کس موقع پر کس صفت کا ظہور ہونا چاہیئے اور یہ ظہور کس حد تک ہونا چاہیئے۔ خدا زندگی بھی دیتا ہے اور موت بھی (هُوَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ (۴۰/۶۸)) وہ (شَدِیْدُ الْعَذَابِ (۲/۱۶۵)) سخت سزا دینے والا بھی ہے اور التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ (۲/۱۶۰) رحمتوں کے ساتھ لوٹ آنیوالا بھی۔ سطح بین نگاہوں کو ان صفات میں تضاد نظر آتا ہے، لیکن جو دیدہ ور سطح سے نیچے اُتر کر حقیقت کی گہرائی تک پہنچ جاتا ہے، وہ علیٰ وجہ البصیرت پورے حتم و یقین سے کہہ سکتا ہے کہ ایسا سمجھنے اور کہنے میں کوئی تضاد نہیں کہ پانی زندگی بخش بھی ہے اور قاطعِ حیات بھی۔ یہ نگاہوں کی سطح بینی

بظاہر متضاد صفات

تھی جس کی وجہ سے عیسائیت نے یہ کہہ دیا کہ (GOD IS MERCY) اور نجات صرف اس کے فضل (GRACE) سے ہوتی ہے، اعمال سے نہیں اور دوسری طرف ہندو مت کے "کرم یوگ" کے فلسفہ نے یہ عقیدہ پیدا کر دیا کہ غلط کام (چھوٹا ہو یا بڑا) اس کی ہلاکت آفرینی سے کسی صورت میں مفر نہیں (تناسخ یا جونا چکر کا نظریہ اسی مفروضہ پر قائم ہے)۔ قرآن نے ان دونوں نظریات کے برعکس، یہ بتایا کہ (مثلاً)

(۱) سنکھیا اگر مناسب مقدار میں استعمال کیا جائے تو مفید ہوتا ہے۔

(۲) اگر وہ تناسب سے تھوڑا سا آگے بڑھ جائے تو اس کے مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

(۳) اور اگر وہ ایک حد سے بہت زیادہ آگے بڑھ جائے تو وہ مہلک ہو جاتا ہے۔ شق ۳ وہ مقام ہے جہاں قانونِ مکافات کو شَدِیْدُ الْعَذَابِ کہا جائے گا یعنی ہلاکت آفریں نتائج کا حامل۔ لیکن شق ۲ کے متعلق ظاہر ہے کہ مناسب تدابیر سے سنکھیا کے مضر اثرات کا ازالہ کیا جا سکتا ہے، اسے تَوَّابِیَّتُ کہتے ہیں۔ اس حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ سے تعبیر کیا ہے کہ اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ط (۱۱/۱۱۴)۔ اعمالِ حسنہ اعمالِ سیئہ کے مُضر اثرات کو دُور کر دیتے ہیں۔ اسی کو عفو کہتے ہیں۔

ان امور کا صحیح مقام تو آگے چل کر آئے گا جہاں خدا کی گوناگوں صفات کا تفصیلی ذکر کیا جائے گا، اس مقام پر ہم نے اجمالی طور پر اس کا ذکر اس لئے ضروری سمجھا کہ یہ حقیقت سامنے آجائے کہ

(ا) ذاتِ خداوندی کی بظاہر متضاد صفات کا حقیقی مفہوم کیا ہے!

(ب) اسماء کے حسنیٰ ہونے کی اہمیت کیا ہے اور

(ج) جب یہ صفات، صحیح صحیح تناسب کے ساتھ، ایک فرد کی ذات میں منعکس ہوں گی تو اسے متوازن شخصیت (BALANCE PERSONALITY) کا حامل قرار دیا جائے گا اور متوازن شخصیت جس قدر صحیح اطمینان اور حقیقی سکون و مسرت کا پیکر ہوتی ہے، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

(د) اور جو معاشرہ اس قسم کے افراد پر مشتمل ہو جن کی شخصیت متوازن ہو، وہ خود جس قدر متوازن ہوگا ظاہر ہے اور ایسے معاشرہ کے وجود سے، انسانیت جس قدر امن و سکون میں رہے گی اس کے متعلق بھی کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔

صفاتِ خداوندی کے ضمن میں یہ چیزیں بھی قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں ملیں گی۔ اس سے آگے چل کر یہ حقیقت بھی سامنے آجائے گی کہ ان تفصیلات سے اخلاقی اقدار (ETHICAL VALUES) کا تعین کس حسن و خوبی سے ہو جاتا ہے اور خیر و شر کی وہ کش کش کس آسانی سے رفع ہو جاتی ہے جس نے دنیائے فکر کو شروع سے آج تک طلسمِ پیچ و تاب بنائے رکھا ہے۔ (اس نقطہ کے متعلق مزید بحث ذرا آگے چل کر آئے گی)۔

خدا کی لامحدود صفات

اس مقام پر اتنی وضاحت اور ضروری ہے کہ خدا کی بعض صفات ایسی ہیں، جن کا صحیح تعین (ذاتِ خداوندی کی کنہ و حقیقت کی طرح) ہماری سرحدِ ادراک سے ماورا رہے۔ مثلاً قرآن میں ہے هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ (۵۷/۳)۔ "وہ الاوّل اور الآخر ہے" ہم اس سے پہلے بتا چکے ہیں کہ کسی ایسے زمان (TIME) کا تصور جس کی ابتدا کہیں سے نہ ہو، ہمارے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا، نہ ہی ایسے زمان کا تصور جس کی حد کوئی نہ ہو، ہمارے ذہن میں آسکتا ہے۔

جب، خدا کے متعلق کہتے ہیں هُوَ الْاَوَّلُ، تو ہم اس کی لامتناہیت کا صحیح صحیح تصور کر ہی

نہیں سکتے۔ ہمارا ذہن اس کا آغاز کسی نہ کسی نقطہ سے ضرور کرے گا۔ اسی طرح جب ہم اس کے متعلق کہتے ہیں هُوَ الْاٰخِرُ تو ہمارا ذہن اس کا بھی تصور نہیں کر سکتا۔ وہ کسی نہ کسی نقطہ پر جا کر ضرور رُک جائے گا۔ لہٰذا ہم خدا کے اوّل اور آخر ہونے کا حقیقی اندازہ نہیں کر سکتے۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ

نہ تھا کچھ تو خدا تھا ۔۔۔ کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

قرآن اس سے زیادہ کا ہم سے مطالبہ بھی نہیں کرتا۔

اس قسم کے معدودے چند صفات کو چھوڑ کر خدا کی باقی صفات ایسی ہیں جنھیں، دورِ حاضر کی اصطلاح میں اخلاقی صفات (ETHICAL ATTRIBUTES) کہتے ہیں۔ مثلاً ربوبیت، رزاقیت، رحمانیت وغیرہ۔ یہی وہ صفات ہیں جنھیں مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہا جاتا ہے۔ قرآنی نظامِ زندگی میں ان اقدار کو بڑی اہمیت حاصل ہے بلکہ یوں کہئیے کہ اس نظام (الدین) کی ساری عمارت انہی بنیادوں پر استوار ہے۔

مستقل اقدار

یہاں سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ انسان کے لئے مستقل اقدار کی ضرورت کیا ہے؟ اسے اپنے معاملات عقل و فکر کی رُو سے طے کر لینے چاہئیں۔ اس میں کوئی شُبہ نہیں کہ انسان کو عقل و فکر کی صلاحیت عطا کی گئی ہے اور یہ وہ خصوصیت ہے جس سے یہ دیگر حیوانات سے متمیّز ہوتا ہے اِس لئے قرآن عقل و فکر اور علم و بصیرت پر بڑا زور دیتا ہے۔ جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے، وہ اس کے نزدیک شَرَّ الدَّوَآبِّ (۸/۲۲) اور اہلِ جہنّم (۷/۱۷۹) ہیں۔ علم و عقل کی رُو سے انسان اشیائے کائنات کا مطالعہ کر کے فطرت کی مخفی قوتوں کو مسخر کرتا اور اس طرح مسجودِ ملائک بنتا ہے۔

عقول کی جنگ

لیکن جہاں خارجی کائنات میں انسانی عقل اس قدر نفع رساں نتائج کی حامل بنتی ہے، جب یہی عقل خود انسانی دنیا میں آتی ہے تو یہاں یہ عجیب گل کھلاتی ہے یا یوں کہئیے کہ جب تک معاملہ قوائے فطرت کی تسخیر تک رہتا ہے، انسانی عقل، بلا تصادم و تزاحم، کام کئے جاتی ہے۔ لیکن جونہی ان قوتوں کے استعمال کا سوال آتا ہے، یہی عقل انسانوں کی باہمی کشمکش اور فساد کا موجب بن جاتی ہے۔ مثلاً ایٹمی قوت کی ریسرچ میں دنیا بھر کے سائنسدان اپنی اپنی لیبارٹریز میں نہایت امن و سکون سے مصروفِ عمل رہتے ہیں۔ لیکن جب ایٹم بم تیار ہو جاتا ہے، تو اس کے استعمال پر اقوامِ عالم میں جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں اور یہی جھگڑے آخر الامر جنگ کی شکل

اختیار کر لیتے ہیں جس میں فطرت کی یہی قوتیں جنھیں وجۂ تعمیرِ انسانیت ہونا تھا، باعثِ تخریبِ آدمیت بن جاتی ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے ؟ اس لئے کہ ہر فرد، ہر گروہ، ہر قوم کی عقل کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے آپ اپنے گروہ اور اپنی قوم کے مفاد کا تحفظ کرے۔ اسے کسی اور فرد، گروہ یا قوم کے مفاد کے تحفظ سے سروکار نہیں ہوتا۔ یعنی عقلِ انسانی، سودِ خویش ہی جانتی ہے، بہبودِ غیر سے اسے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا، جب مختلف افراد یا اقوام کے مفاد میں تصادم (CLASH OF INTEREST) شروع ہوتا ہے تو ان کی عقول میں جنگ (BATTLE OF WITS) شروع ہو جاتی ہے۔ اسے، بالفاظِ دیگر، یوں سمجھئے کہ جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کے جذبات انسان کی حیوانی جبلّت (ANIMAL INSTINCT) کے اندر داخل ہیں۔ عقل کا کام یہ ہے کہ وہ انسانی جذبات کے تقاضوں کو پورا کرے۔ مثلاً کسی شخص کے ہاں ایک خوبصورت تصویر ہے، ہمارا جی چاہتا ہے کہ ہم اسے حاصل کریں (یہ ہمارے جذبات کا تقاضا ہے)۔ وہ شخص اس تصویر کو دینا نہیں چاہتا۔ (یہاں سے ہمارے جذبات میں تصادم شروع ہوتا ہے)۔ اب ہماری عقل آگے بڑھتی ہے اور ہمیں مختلف تدبیریں سجھاتی ہے کہ اس تصویر کو کیسے حاصل کیا جائے۔ اس کے برعکس، فریقِ مقابل کی عقل اسے یہ بتاتی ہے کہ اس تصویر کی حفاظت کے لئے کیا کیا تراکیب اختیار کی جائیں (اسے عقول کی جنگ کہہ لیجئے)۔ اب ظاہر ہے کہ جس کی عقل زیادہ تیز ہوگی، وہی کامیاب ہو جائے گا۔ اس کے بعد فریقِ ثانی اس سے بدلہ لینے کے درپے ہوگا۔ اسی کا نام فساد ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی عقل اس کے جذبات کے پیچھے پیچھے چلتی ہے، اسی طرح جس طرح "کتے کے پاؤں" اس کی ناک (شکار کی بُو) کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں[1]۔

ان تصادمات کے انسداد یا ازالہ کے لئے انسانی معاشرہ کچھ اصول وضع کر دیتا ہے جو اس معاشرہ میں رہنے والے تمام افراد پر یکساں طور پر جاری ہوتے ہیں۔ ان اصولوں کو قوانین کہا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں

قوانین کے ذریعے فیصلہ

کہ اس معاشرہ کے مختلف افراد اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ وہ متنازعہ فیہ معاملات میں، اپنے اپنے جذبات کے تابع اور اپنی اپنی عقل کے پیچھے

---

[1] اس مقام پر صرف انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ تفصیل ان امور کی میری دوسری تصانیف "ابلیس و آدم"، "انسان نے کیا سوچا ؟" اور "اسلام کیا ہے ؟" میں ملے گی۔

چلنے کی بجائے، ان تسلیم کردہ اصولوں کے مطابق فیصلہ کریں گے۔ جو شخص ان کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا معاشرہ اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ ان کے مطابق چلے۔ ظاہر ہے کہ ان اصولوں (قوانین) کو انسان کی تمدنی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس اہمیت کا تقاضا ہے کہ (i) ان اصولوں کے وضع کرنے میں کسی خاص فرد، خاص پارٹی یا خاص قوم کے جذبات کو کوئی دخل نہ ہو اور (ii) یہ اصول ایسے نہ ہوں کہ انھیں جب جی چاہے بدل لیا جائے۔

غیر متبدّل قوانین

قرآن کہتا ہے کہ اس قسم کے اصول وضع کرنا عقلِ انسانی کے بس کی بات نہیں، اس لئے کہ (انسانی معاملات میں) اس کی عقل جذبات سے خالی ہو نہیں سکتی۔ لہٰذا یہ اصول ایسے مقام سے ملنے چاہئیں جو انسانی جذبات سے بلند ہو اور جس کے نزدیک تمام انسان (کسی ایک ملک یا ایک دَور کے انسان نہیں، بلکہ تمام انسان) برابر ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسا مقام ذاتِ خداوندی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

مستقل اقدار وہ ناقابلِ تغیّر و تبدّل اصول ہیں جو خدا کی طرف سے تمام نوعِ انسانی کی راہ نمائی کے لئے ملے ہیں تاکہ یہ اپنے فیصلے ان کے مطابق کریں۔ انسانی معاشرہ ان اصولوں کی عملی تنفیذ کے لئے، اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، ذیلی قواعد و ضوابط مرتب کرے گا، لیکن ان اصولوں میں کسی قسم کے تغیّر و تبدّل یا حک و اضافہ کا مجاز نہیں ہوگا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ غیر متبدّل اصول یا مستقل اقدار، وہ صفاتِ خداوندی ہیں جنھیں (سمجھنے کی غرض سے) "اخلاقی صفات" کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ہم نے اُوپر کہا ہے کہ اس قسم کے غیر متبدّل اصول (مستقل اقدار) وضع کرنا انسانی عقل کے بس کی بات نہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان اصولوں کا سمجھنا اور سمجھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچنا کہ یہ فی الواقعہ اپنے دعوے میں سچے اور اپنے مقصد کو پورا کرتے ہیں، بھی عقل کی حد سے باہر ہے۔

قرآنی اصولوں کو سمجھنا

قطعاً نہیں۔ عقل انھیں سمجھ سکتی ہے لیکن اس کے لئے ایک ضروری شرط ہے اور وہ یہ کہ جس طرح ایک سائنٹسٹ خارجی کائنات کا مشاہدہ اور مطالعہ، عقل و بصیرت کی رُو سے معروضی طور پر (OBJECTIVELY) کرتا ہے اور اس پر اپنے جذبات و عواطف کو اثر انداز نہیں ہونے دیتا، اگر اسی طرح قرآنی اصولوں پر غور و فکر کیا جائے تو ان کی صداقت اُبھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ قرآن نے اپنے دعاوی کی صداقت کے پرکھنے کا طریق خود ہی بتا دیا ہے۔ سورۂ یونس میں ہے۔

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ ۚ كَذَٰلِكَ

كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ٥ (۱۰/۳۹)۔

پہلی بات اس میں یہ کہی گئی ہے کہ قرآنی دعاوی کی تکذیب وہ لوگ کرتے ہیں جو علمی طور پر اس کے حقائق کا احاطہ نہیں کرتے۔ (لَمْ يُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا۔ (۲۷/۸۴)۔ یعنی قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس سطح تک علمِ انسانی اُس خاص زمانے تک پہنچ چکا ہے، وہ علمی سطح انسان کے سامنے رہے۔" اس زمانے کی سطح تک" اس لئے کہا گیا ہے کہ جوں جوں انسانی علم کی سطح بلند ہوتی جاتی ہے، قرآنی حقائق اسی نسبت سے بے نقاب ہوتے چلے جاتے ہیں۔

دوسری بات اس نے یہ کہی ہے کہ قرآنی حقائق پر غور کرنے والے مفکر کے لئے ضروری ہے کہ وہ تاریخِ عالم کا مطالعہ کرے اور اقوامِ سابقہ کے احوال و کوائف کو سامنے لائے۔ وہ دیکھ لے گا کہ جس قوم نے قرآنی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کی اُس کا نتیجہ کیا نکلا اور جس نے ان کی خلاف ورزی کی' اس کے عواقب کیا ہوئے۔ قرآن نے اس مقصد کے لئے تاریخ کے مطالعہ پر بار بار زور دیا ہے۔

اور تیسرا طریق یہ کہ قرآنی اصولوں کے مطابق معاشرہ متشکل ہونے دیا جائے۔ اس معاشرہ کے نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ یہ اصول حق و صداقت پر مبنی ہیں یا نہیں۔ اسے استنتاجی طریق یا (PRAGMATIC TEST) کہتے ہیں۔

جب قرآنی حقائق پر اس انداز سے غور و فکر کیا جائے تو ان کی صداقتیں ایک ایک کر کے بے نقاب ہوتی چلی جائیں گی۔ لیکن (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) شرط یہ ہے کہ اس غور و فکر کو جذبات سے ملوّث نہ ہونے دیا جائے۔ جب تک انسانی جذبات کو وحی کی راہ نمائی کے تابع نہ رکھا جائے' حقیقت کبھی سامنے نہیں آسکتی۔ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (۲۸/۵۰)۔ اس سے زیادہ راہ گم کردہ اور کون ہوگا جو خدا کی راہ نمائی کے بغیر' اپنے جذبات کا اتباع کئے جاتا ہے۔

خیر و شر کا مسئلہ

بہرحال، یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آگئی کہ وہ مستقل اقدار یا غیر متبدل اصول جن کے مطابق انسانی معاشرہ کو متشکل ہونا چاہیئے، صفاتِ خداوندی ہی پر متفرع ہیں۔ اس سے بھی اس امر کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ صفاتِ خداوندی کے صحیح طور پر سامنے ہونے کی اہمیت کیا ہے۔

ہم نے پہلے کہا ہے کہ صفاتِ خداوندی کے صحیح تصوّر اور ان کے اسماء الحسنیٰ ہونے کے قرآنی مفہوم سے خیر و شر (GOOD AND EVIL) کا پیچیدہ ترین مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ جو کام انسانی ذات کی نشو و نما، تقویت اور استحکام (INTEGRATION) کا موجب ہو، وہ عملِ خیر ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ وہی اعمال ہو سکتے ہیں جو مستقل اقدار یا صفاتِ خداوندی کے مطابق ہوں۔ اور جو عمل انسانی ذات میں ضعف اور انتشار (DISINTEGRATION) پیدا کر دے وہ شر ہے (اور یہ ظاہر ہے کہ یہ وہی اعمال ہو سکتے ہیں جو مستقل اقدار کے خلاف ہوں)۔ دنیا میں خیر و شر کا یہی معیار ہے۔ اس سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صفاتِ خداوندی کا انسانی ذات سے کیا تعلق ہے اور ان کی اہمیت کیا۔

صفاتِ خداوندی کی ہمہ گیری

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ خارجی کائنات کا کوئی گوشہ اور انسانی دنیا کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو صفاتِ خداوندی سے غیر متعلق ہو۔ انسانی دنیا میں ایک فرد کی انفرادی زندگی ہو یا ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ، سب کی صحیح تشکیل و تکمیل، صفاتِ خداوندی کے قالب (PATTERN) میں ہوتی ہے۔ یہی صفات فرد کی ذات کی نشو و نما کے لئے معیارِ اعلیٰ بنتی ہیں اور انہی سے وہ غیر متبدل اصول متشکل ہوتے ہیں جن کے مطابق چلنے سے انسانی معاشرہ فردوس بداماں ہو جاتا ہے۔ انہی سے انسان کے حال کی سرفرازیاں وابستہ ہیں اور انہی سے اس کے مستقبل کی سربلندیاں منسلک۔ ان سے الگ رہ کر، زندگی کبھی انسانی سطح پر نہیں آ سکتی، حیوانی (بلکہ اس سے بھی اسفل) سطح پر رُکی رہتی ہے۔

اس سے یہ ظاہر ہے کہ انسانی زندگی میں صفاتِ خداوندی کے صحیح علم و تصوّر کی اہمیت کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ایمان باللہ پر اس قدر زور دیا ہے۔ (ایمان باللہ کے معنی ہی صفاتِ خداوندی پر یقینِ محکم کے ہیں)۔ یہی وہ اساس ہے جس پر انسانی زندگی کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ یہی وہ بیج ہے جس سے اعمالِ حَسنہ کا شجرِ طیّب ثمر بار ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنّم بھی

لہٰذا ایمان باللہ ہی وہ محور ہے جس کے گرد انسان کی تمام کائنات گردش کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے صفاتِ خداوندی کو اس وضاحت و صراحت اور تفصیل و تشریح سے بیان کیا ہے۔ چونکہ یہ چیز دنیائے مذاہب و

افکار میں اور کہیں نہیں ملتی' اس لئے قرآن کی تعلیم بے مثل و بے نظیر ہے اور چونکہ اس میں ان صفات کا مکمل تصور دے دیا گیا ہے' اس لئے اس کے بعد کسی کتاب (فلہذا کسی نبی یا رسول) کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

آئندہ صفحات میں انہی صفاتِ خداوندی کا قرآنی بیان آپ کے سامنے آئے گا۔

۲

اِلٰہ

لُغوی معنی لُغوی طور پر اَلِہَ ، اِلَیہِ ، یَاْلَہُ کے معنی ہیں گھبرا کر کسی کی پناہ ڈھونڈنا یا متحیّر ہونا اور اَلَہَ ، یَاْلُہُ کے معنی ہیں کسی کو پناہ دینا، امان میں لینا۔ ان معانی کے اعتبار سے اِلٰہٗ کے معنی ہوں گے ایک ایسی ہستی جس سے خطرات میں پناہ حاصل کی جائے جس سے مشکلات دُور کرنے کی استدعا کی جائے اور جس کی عظمت و بلندی کے تصوّر سے انسان متحیّر ہو جائے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ لَاہَ ، یَلِیہُ سے مشتق ہے جس کے معنی بلند مرتبہ ہونا اور نگاہوں سے پوشیدہ ہونا ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ اَلَہَ کے معنی ہیں وہ شخص غلام بن گیا اور تَاَلَّهَهُ کے معنی ہیں اس نے اسے غلام بنا لیا۔ اس اعتبار سے اِلٰہٗ کے معنی ایسی ہستی ہوں گے جس کا غلبہ و اقتدار اختیار کیا جائے، جس کے قانون کی اطاعت کی جائے، جس کی محکومی اختیار کی جائے۔

آپ غور کیجئے کہ ذہنِ انسانی نے "معبود" کے جس قدر تصورات بھی قائم کئے ہیں ان میں مندرجہ بالا خصائص کسی نہ کسی شکل میں ضرور پائے جاتے ہیں۔ ان کا بلند و بالا ہونا، نگاہوں سے پوشیدہ ہونا، اس کے تصوّر سے حیرت زدہ ہو جانا، مشکلات سے گھبرا کر اس کی طرف مدد کے لئے رجوع کرنا، تذلّل و تعبّد سے اس کے سامنے جُھکنا اور اس کے احکام کی اطاعت کرنا۔ بالفاظِ دیگر، اِلٰہٗ وہ جامع لفظ ہے جو "خدا" کے ہر قسم کے تصوّر کو محیط ہے۔

قرآن نے ذاتِ خداوندی کے لئے **اللّٰہ** کا لفظ استعمال کیا ہے۔ (تفصیل آئندہ عنوان میں ملے گی) یعنی اللہ، خدا کی ذات کا نام ہے جس کی صفات کا تذکرہ قرآن کے صفحات پر درخشندہ موتیوں کی طرح بکھرا

ہوا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں اللہ رحیم ہے، اللہ کریم ہے، تو رحیمی اور کریمی، اللہ کی صفات ہیں۔ اس لفظ (اللہ) کے متعلق اکثر کا خیال یہی ہے کہ یہ دراصل اَل۔ اِلٰہٌ کا مرکب ہے۔ کثرتِ استعمال سے الٰہ کا ہمزہ (الف) گر گیا اور لام، لام میں مدغم ہو گیا۔ اس طرح اَل، اِلٰہٌ سے اللہ بن گیا۔ عربی زبان میں اسمِ نکرہ اَلْ لگا دینے سے معرفہ بن جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اللہ کے معنی ہوں گے وہ خاص اِلٰہ جس کا تصور قرآن نے پیش کیا ہے۔

قرآنی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ یعنی کائنات میں کوئی ایسی ہستی، کوئی ایسی قوت نہیں جسے الٰہ تسلیم کیا جائے۔ ایسی ہستی ایک ہی ہے جسے قرآن نے اللہ کہہ کر پکارا ہے۔ بالفاظِ دیگر، اس کے معنی یہ ہوئے کہ کائنات میں صرف اللہ کا قانون ایسا ہے جس کی اطاعت اختیار کی جائے، جس سے سامانِ حفاظت طلب کیا جائے، جسے تمام مشکلات و مصائب کے لئے سپر بنایا جائے۔ اس کا یہ قانون اس قدر بلند و بالا اور غلبہ و اقتدار کا مالک ہے کہ اس کی عظمت و رفعت کے تصور سے انسان ورطۂ حیرت میں گم ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو اِلٰہ ایک نہج سے خدا کی ذات کا تصور سامنے لاتا ہے اور دوسرے نہج سے یہ اس کی صفت بھی ہے۔ ہم نے آغازِ سخن اِلٰہ سے اسی لئے کیا ہے کہ اس کے بعد خدا کا اسمِ ذات (اللہ) سامنے آ جائے اور پھر اس ذات کی صفات، ایک ایک کر کے، وجۂ نورانیتِ قلب و نگاہ بنتی چلی جائیں۔

ہم نے اُوپر کہا ہے کہ قرآنی تعلیم کا بنیادی نقطہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے۔ اس کلمہ کے دو حصے ہیں۔ ایک سلبی یعنی اس امر کا یقین اور اس حقیقت کا اعتراف کہ دنیا میں کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جس کے سامنے جھکا جائے، جس کی اطاعت اختیار کی جائے، جسے آقا تسلیم کیا جائے اور اپنی حاجات کا قبلۂ مقصود سمجھا جائے۔ یہ نفی کا پہلو ہے۔ یہ اس تعلیم کا تخریبی گوشہ ہے۔ یعنی "معبودیت" کے متعلق جو کچھ پہلے سے ذہن میں ہے اُسے بھلا دیا جائے اور جب اس طرح زمین صاف ہو جائے تو اس پر ایک نئی عمارت تعمیر کی جائے۔ یہ ایجابی پہلو ہے۔ یعنی تمام قوتوں کے انکار کے بعد اس امر کا اقرار کہ ایک اور صرف ایک قوت ایسی ہے جس کی اطاعت کرنا ضروری اور جس کے سامنے جھکنا زیبا ہے، یعنی اللہ۔ اس طرح تمام قوتوں کو راستے سے ہٹا کر خدا سے بندے کا براہِ راست تعلق پیدا کر دینا، قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم ہے اور چونکہ قرآنِ کریم کی اصولی تعلیم کوئی نئی تعلیم نہیں بلکہ وہی ازلی پیغام ہے جو شروع سے

مختلف انبیائے کرامؑ کی تعلیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آرہا ہے، اس لئے ہر رسول اسی پیغام کی تجدید کرتا رہا۔ مثلاً حضرت نوحؑ کے متعلق ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَالَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ (۲۳/۲۳، ۷/۵۹)

یقیناً ہم نے نوح کو اس قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا کہ اے میری قوم (صرف) اللہ کی عبودیت اختیار کرو۔ تمہارے لئے اس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں[1]۔

حضرت نوحؑ کے بعد آنے والا رسول۔

فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَالَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ (۲۳/۳۲)

پھر ہم نے قومِ نوح کے بعد دوسری قوموں کا دور پیدا کیا۔ ان میں ... انہی میں سے رسول بھیجا (جو یہ تعلیم دیتا تھا کہ) اللہ کی عبودیت اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی اِلٰہ نہیں۔ کیا تم تقویٰ نہیں اختیار نہیں کرو گے؟

حضرت ہودؑ۔

قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَالَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ (۷/۶۵، ۱۱/۵۰)

کہا کہ اے میری قوم! صرف اللہ کی عبودیت اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارے لئے کوئی اِلٰہ نہیں۔ کیا تم تقویٰ نہیں اختیار کرو گے؟

حضرت صالحؑ۔

قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَالَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ (۷/۷۳، ۱۱/۶۱)

کہا کہ اے میری قوم! (صرف) اللہ کی عبودیت اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارے لئے کوئی اِلٰہ نہیں۔

حضرت شعیبؑ۔

قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَالَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ (۷/۸۵، ۱۱/۸۴)

---

[1] ہم اُوپر دیکھ چکے ہیں کہ اِلٰہ ایک جامع لفظ ہے جس کا ترجمہ کسی ایک لفظ سے نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہم ان آیات میں اِلٰہ کا ترجمہ نہیں کریں گے بلکہ اس کی جگہ اِلٰہ ہی لکھیں گے۔

کہا کہ اے میری قوم (صرف) اللہ کی عبودیت اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارے لئے کوئی الٰہ نہیں۔

حضرت الیاس ؑ۔

اَتَدۡعُوۡنَ بَعۡلًا وَّ تَذَرُوۡنَ اَحۡسَنَ الۡخَالِقِیۡنَ ۙ اللّٰہَ رَبَّکُمۡ وَ رَبَّ اٰبَآئِکُمُ الۡاَوَّلِیۡنَ ○ (۱۲۵-۱۲۶/۳۷)

کیا تم لوگ بعل (دیوتا) کو خدا بنا رہے ہو اور خدائے حقیقی کو چھوڑ رہے ہو جو احسن الخالقین ہے؟

یعنی اللہ کو جو تمہارا اور تمہارے آباؤ اجداد کا رب ہے

حضرت یعقوب ؑ نے اپنے آخری وقت میں یہی اقرار اپنے بیٹوں سے لیا۔

اَمۡ کُنۡتُمۡ شُہَدَآءَ اِذۡ حَضَرَ یَعۡقُوۡبَ الۡمَوۡتُ ۙ اِذۡ قَالَ لِبَنِیۡہِ مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِیۡ ؕ قَالُوۡا نَعۡبُدُ اِلٰہَکَ وَ اِلٰہَ اٰبَآئِکَ اِبۡرٰہٖمَ وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ اِلٰـہًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّ نَحۡنُ لَہٗ مُسۡلِمُوۡنَ ○ (۲/۱۳۳)۔

کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب کا آخری وقت آیا اور اس نے اپنے بیٹوں سے پوچھا تھا کہ تم میرے بعد کس کی عبودیت اختیار کرو گے؟ تو انہوں نے کہا کہ ہم تیرے الٰہ اور تیرے باپ دادا ابراہیم و اسمٰعیل و اسحٰق کے الٰہ کی عبودیت اختیار کریں گے۔ وہی الٰہ جو ایک ہے اور ہم اسی کے احکام و قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔

حضرت ذوالنون ؑ۔

وَ ذَا النُّوۡنِ اِذۡ ذَّہَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنۡ لَّنۡ نَّقۡدِرَ عَلَیۡہِ فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ اَنۡ لَّاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنۡتَ سُبۡحٰنَکَ ٭ۖ اِنِّیۡ کُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ ○ (۲۱/۸۷)۔

اور ذا النون (مچھلی والا یونس ؑ) جب (اپنی قوم سے) خفا ہو کر چل دیا اور اس نے خیال کیا کہ ہم (اس کے اس طرح چلے جانے پر) دار و گیر نہ کریں گے (لیکن جب اس کی حالت تنگ ہوئی) تو اس نے (مایوسی کی) تاریکیوں میں پکارا کہ خدایا! تیرے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ تو انسانوں کے خود ساختہ تصورات سے بہت دُور ہے۔ میں بے شک اپنے آپ پر زیادتی کر بیٹھا ہوں۔

حضرت موسیٰؑ نے بھی اپنی قوم سے یہی کہا جب انھوں نے درخواست کی کہ انھیں پرستش کے لئے ایک بُت بنوادیں۔

قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّ هُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ؀
(۷/۱۴۰)

کہا کہ کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو تمہارا إلٰہ تجویز کردوں؟ حالانکہ اس نے تمھیں تمھاری ہم عصر اقوام پر فضیلت دی ہے۔

اس لئے کہ انھیں بارگاہِ صمدیّت سے جلوہ گاہِ طور پر یہی ارشاد ہوا تھا۔

اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ؀
(۲۰/۱۴)

(اے موسیٰ) یقیناً میں ہی اللہ ہوں۔ میرے سوا کوئی إلٰہ نہیں۔ بس میری ہی عبودیت اختیار کرو اور میرے قانون اور نظام کو غالب رکھنے کے لئے نظامِ صلوٰۃ قائم کرو۔

یہی تعلیم حضرت عیسیٰؑ کی تھی جس کا اقــــرار وہ خدا کے حضور کریں گے۔

وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَ اُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ...... اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ؀ (۵/۱۱۶)

جب اللہ کہے گا کہ اے عیسیٰ ابنِ مریم کیا تم نے ان لوگوں سے (جو تیرے متبع ہونے کے مدعی ہیں) کہا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھے اور میری ماں کو إلٰہ بنالو؟ تو وہ کہے گا (معاذ اللہ) تیری ذات اس سے بلند ہے۔ یہ میرے لئے کب زیبا تھا کہ میں ایسی بات کہتا جس کا کہنے کا مجھے کوئی حق نہیں تھا؟ اگر میں نے کوئی ایسی بات کہی ہوتی تو وہ تجھ سے کیسے مخفی رہ سکتی تھی۔ تُو تو میرے دل کی بات تک بھی جانتا ہے۔ البتہ جو کچھ تیرے مخصوص علم میں ہے میں اسے نہیں جانتا۔ تو (حاضر اور) غیب سب باتوں کا جاننے والا ہے۔

قــرآنِ کریم کی تعلیم یہی تعلیم محفوظ اور مکمل شکل میں نبیٔ اکرمؐ کی وساطت سے تمام نوعِ انسانی تک پہنچائی گئی۔ فرمایا۔

اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى ؕ قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ؇ (۶/۱۹)

کیا تم (سچ مچ) اس امر کی شہادت دیتے ہو (یقین رکھتے ہو) کہ اللہ کے ساتھ دوسرے الٰہ بھی ہیں؟ (اے رسول!) کہو کہ میں تو ایسی شہادت نہیں دیتا۔ (میری شہادت تو یہ ہے) کہ الٰہ وہی اکیلا ہے اور میں یقیناً تمہارے شرک سے بری ہوں۔

سورۂ توبہ میں ہے کہ

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ ۖ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَ هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ ؇ (۹/۱۲۹)۔

اگر یہ لوگ (حق و صداقت سے) اعراض کریں تو کہہ دو کہ میرے لئے اللہ (کا سہارا) کافی ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں۔ میں اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور وہ عرشِ عظیم کا رب ہے۔

سورۂ رعد میں ہے۔

قُلْ هُوَ رَبِّیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَیْهِ مَتَابِ ؇ (۱۳/۳۰)

کہو کہ وہ میرا رب ہے۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ اسی پر میرا بھروسہ ہے اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔

یہ تعلیم بذریعہ وحی نازل ہوئی تھی۔

قُلْ اِنَّمَا یُوْحٰۤى اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ؇ (۲۱/۱۰۸)

کہو کہ مجھ پر یہ وحی ہوئی ہے کہ یقیناً تمہارا معبود (وہ) الٰہ واحد ہے۔ تو کیا تم اس کے قوانین کے سامنے جھکتے ہو یا نہیں!

اسی وحی کا دوسری جگہ یوں ذکر ہے۔

قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یُوْحٰۤى اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؇ (۴۱/۶)۔

کہو کہ میں تو یقیناً تمہارے جیسا ایک انسان ہوں۔ مجھ پر یہ وحی ہوئی ہے کہ یقیناً تمہارا معبود

وہی الٰہ واحد ہے۔

پھر فرمایا۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ۖ وَّ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ (۳۸/۶۵)۔

کہیئے کہ میرا منصب تو یہ ہے کہ میں تمھیں اس حقیقت سے متنبّہ کر دوں کہ تم جس روش پر چلے جا رہے ہو اس کا نتیجہ تمہاری تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا اور اس کے ساتھ ہی تمہیں اس حقیقت سے بھی آگاہ کر دوں کہ اللہ واحد قہّار کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔

اسی تعلیم پر ان الفاظ میں زور دیا گیا ہے۔

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (۴۷/۱۹)

پس یاد رکھو اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔

دوسری جگہ ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ (۶۴/۱۳)

اللہ وہ ہے کہ جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور ایمان رکھنے والے اللہ ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

یہ تو الگ الگ رسولوں کا ذکر تھا۔ مجموعی طور پر فرمایا۔

وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝ (۲۱/۲۵)۔

ہم نے تم سے پہلے بھی کوئی رسول نہیں بھیجا جس پر یہ وحی نہ کی ہو کہ میرے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ پس میری ہی عبودیت اختیار کرو!

یہ ہے وہ تعلیم جس کا سرچشمہ ہدایتِ خداوندی ہے۔ اس تعلیم میں جو خرابیاں واقع ہوئیں وہ سب ذہنِ انسانی کی پیدا کردہ تھیں۔ اس تعلیم کے حقیقتِ ثابتہ ہونے پر خود خدا شاہد ہے، اس کے فرشتے شاہد ہیں اور وہ صاحبانِ علم شاہد ہیں جو دنیا میں نظامِ عدل قائم کرتے ہیں۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (۳/۱۷)۔

اللہ اس پر شاہد ہے کہ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور ملائکہ اور صاحبانِ علم عدل پر قائم رہتے ہوئے (ان کی بھی یہی شہادت ہے کہ) اس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں۔ وہ غلبہ و حکمت والا ہے۔

حقیقی الٰہ کا پاکیزہ تصوّر قرآن کے اندر ملتا ہے

وَ اِلٰـهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحۡمٰنُ الرَّحِيۡمُ (۲/۱۶۳)

اور تمہارا اِلٰہ..... وہی اِلٰہِ واحد ہے۔ اس کے سوا کوئی اِلٰہ..... نہیں اور وہ رحمان اور رحیم ہے۔

وہ اِلٰہ جس کے متعلق ارشاد ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِىۡ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ‌ ۚ عٰلِمُ الۡغَيۡبِ وَالشَّهَادَةِ‌ ۚ.......

..... وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ (۵۹/۲۴-۲۲)۔

اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں، غیب و شہادت (حاضر و غائب) کا جاننے والا، رحمٰن و رحیم، ساری کائنات اس کی مملکت ہے۔ اس کے اقتدار اور علم کی وسعتیں لا انتہا ہیں۔ اس کی ذات مکمّل ترین اور ہر نقص سے پاک ہے۔ وہ کائنات کو تخریبی قوتوں کے اثرات سے محفوظ رکھتا ہے اور امن کا ضامن ہے۔ کوئی شے اس کے حیطۂ اقتدار سے باہر نہیں۔ وہ بڑے غلبہ اور تسلّط کا مالک ہے۔ اس نے ہر شے کو اپنے قوانین کے ساحلوں میں محصور کر رکھا ہے اور ہر قسم کی کبریائی اسی کو حاصل ہے وہ اس سے بہت دُور ہے کہ کسی قوّت کو اس کا ہمسر قرار دیا جائے۔

وہ خدا ہر شے کا خالق ہے۔ ہر شے کو حشو و زوائد سے پاک کر کے ایک متعیّن صورت عطا کر دیتا ہے۔ غرضیکہ تمام بلند و بالا صفات، انتہائی اعتدال کے ساتھ، اس کی ذات میں مجتمع ہیں کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، سب اس کے مقرّر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرمِ عمل ہے۔ وہ ہر قسم کے غلبہ کا مالک ہے اور اس کا غلبہ حکمت پر مبنی ہے۔

وہ اِلٰہ جس کی صفات یہ ہیں۔

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ‌ ۚ اَلۡحَـىُّ الۡقَيُّوۡمُ .... وَهُوَ الۡعَلِىُّ الۡعَظِيۡمُ ۝

(۲/۲۵۵؛ ۳/۲)

اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں۔ زندہ ہے اور اس کی زندگی کے لئے فنا و زوال نہیں القیّوم

ہے (یعنی ہر شے اس کے حکم سے قائم ہے اور وہ اپنے قیام کے لئے کسی کا محتاج نہیں) نہ (اس کی آنکھ کے لئے) اونگھ ہے نہ (دماغ کے لئے) نیند۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اسی کی مِلک ہے۔ ایسا کون ہے جو اس کے حضور اس کے قانون کے خلاف کسی کے ساتھ کھڑا ہو سکے؟ (جو کچھ انسان کے) سامنے ہے وہ اسے بھی جانتا ہے اور جو کچھ اس کے پیچھے ہے وہ بھی اس کے علم سے باہر نہیں اور (انسان یا تمام کائنات) اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر یہ کہ جتنا (علم وہ دینا) چاہے۔ اس کا علم و اقتدار ساری کائنات کو محیط ہے اور ان کی نگرانی اور حفاظت اس پر کچھ بھی گراں نہیں گزرتی۔ اس کی ذات بڑی عظیم المرتبت ہے۔

انسان معبود اسے بناتا ہے جس کے متعلق سمجھتا ہے کہ اسے کچھ اختیار اور قوت حاصل ہے اور قرآنِ کریم اس تصور ہی کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیتا ہے کہ خدا کے سوا کسی کو اساسی طور پر کوئی اختیار اور اقتدار حاصل ہے۔ لہٰذا، جب خدا کے سوا کسی کو کوئی اختیار و اقتدار ہی حاصل نہیں تو اس کے سوا کوئی معبود کیسے ہو سکتا ہے؟ فرمایا۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَ اَبْصَارَكُمْ وَ خَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ۝ (۶/۴۶)۔

کہو کہ کبھی تم نے اس پر بھی غور کیا کہ اگر اللہ تمہاری سماعت اور بصارت چھین لے اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دے تو اللہ کے سوا کون ایسا اِلٰہ ہے جو تمہیں یہ پھر دیدے؟ دیکھو ہم کس طرح دلائل کو مختلف پہلوؤں سے پھیر پھیر کر لاتے ہیں لیکن یہ لوگ پھر بھی حقیقت سے رُوگرداں رہتے ہیں۔

ہم نے اس مقام پر اِلٰہِ حقیقی کی صرف چند صفات کا اجمالی ذکر کیا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کا تفصیلی ذکر آئندہ صفحات میں سامنے آجائے گا اس لئے اس عنوان میں ان تفاصیل کا دیا جانا ضروری نہیں۔ اس مقام پر اتنا اور واضح کر دینا ضروری ہے کہ قرآن کا اِلٰہِ حقیقی، تمام نوعِ انسانی کا اِلٰہ ہے۔

اِلٰهِ النَّاسِ ۙ (۱۱۴/۳)

تمام نوعِ انسانی کا اِلٰہ!

وہ بلا لحاظ رنگ، نسل، قوم، ملک، سب کا ایک خدا ہے اور جب اِلٰہ ایک ہے تو تمام نوعِ انسانی ایک برادری ہے جس میں نسلی یا وطنی تفریق کو کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ اس عالمگیر برادری اور اخوتِ بشری کا تصورِ قرآن

کریم کے اِلٰہ کے تصور سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ بات بھی قرآنِ کریم ہی نے بتائی ہے کہ تمام نوعِ انسانی کی تخلیق نفسِ واحدہ سے ہوئی ہے (۳۹/۶) اور تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں جن میں قدرِ مشترک رشتۂ توحید ہے۔ (تفصیل ان امور کی اپنے مقام پر ملے گی)۔

عقل و بصیرت سے تخاطب

قرآنِ کریم کا انداز نہیں کہ وہ کسی عقیدہ کو عقل و بصیرت کے خلاف منوائے وہ ہمیشہ عقلِ صحیح اور قلبِ سلیم سے اپیل کرتا ہے۔ اس نے جب ایک اِلٰہ کی طرف دعوت دی تو اس لئے نہیں کہ وہ (نعوذ باللہ) دوسرے مذاہب یا دیگر اقوام کے "خداؤں" کی پرستش ہوتے دیکھ نہیں سکتا تھا، بلکہ اس لئے کہ یہ حقیقت ہے کہ اِلٰہ صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ (۲۱/۲۲)۔

اور زمین و آسمان میں اللہ کے علاوہ اور اِلٰہ بھی ہوتا تو یہ ارض و سما (سلسلۂ کائنات) درہم برہم ہو جاتا۔ وہ تمام قوتوں کا مالک ہے۔ لہٰذا یہ لوگ اِلٰہ کا جو تصور اپنے ذہن سے تراشتے ہیں، وہ اس سے بہت بلند و بالا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل دوسری جگہ یوں بیان کی گئی ہے۔

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ (۲۳/۹۱)۔

اور اللہ نے کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور اِلٰہ ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر اِلٰہ اپنی مخلوق کو لے کر الگ ہو جاتا اور ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتا۔ سو اللہ بلند ہے ان باتوں سے جو لوگ اس کی نسبت بیان کرتے ہیں۔

بظاہر یہ ایک مختصر سا فقرہ ہے لیکن معنوی اعتبار سے اس کے اندر حقائق کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔ نظامِ عالم کے ربط و ضبط پر بادنیٰ تدبر یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی کہ یہ عظیم الشان سلسلہ ایک خاص نظام کے ماتحت چل رہا ہے اور اس محیر العقول مشینری کے پرزوں میں ایک خاص یک جہتی اور باہمی تعلق ہے۔ یہ ہوشربا کارخانۂ

اس نظم و نسق کے ساتھ چل ہی نہیں سکتا تاوقتیکہ اس کو قابو (CONTROL) میں رکھنے والی طاقت ایک نہ ہو۔ مختلف ارادوں والی دو قوتوں کی موجودگی میں یہ نظام ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں چل سکتا۔ سورج کی رفتار اور گردش میں ایک ثانیہ کے ہزارویں حصّہ کا بھی فرق پڑ جائے تو نظامِ شمسی ایک آنِ واحد میں درہم برہم ہو جائے۔ سائنس کے انکشافات نے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ اس سلسلۂ کائنات کی جو چیزیں بظاہر ایک دوسرے سے الگ تھلگ، غیر متعلق اور آزاد نظر آتی ہیں، وہ بھی درحقیقت ایک دوسرے سے پیوست اور باہمی مربوط و منوط ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر کہیں دو یا دو سے زیادہ مستقل بالذّات اور بالارادہ قوتیں اپنے اپنے اختیار و ارادہ سے اس نظامِ عالم کا بندوبست کریں، تو نتیجہ دو عملی ہوگا! قرآنِ کریم نے اس نتیجہ کے لئے ایک لفظ لَفَسَدَتَا استعمال کیا ہے جس کے اندر "دو عملی" یا طوائف الملوکی کی صحیح تصویر موجود ہے۔ جب کسی نظام کی ہر کڑی اپنی اپنی جگہ ٹھیک طور پر سرگرمِ عمل ہو تو وہ نظام اعتدال پر ہوتا ہے اور حالتِ اعتدال کے نہ ہونے کا نام فساد ہے جس میں وہ نظام درہم برہم اور پریشان و پراگندہ ہو جاتا ہے اور اس کے مختلف پُرزوں میں باہمی ربط و ضبط نہیں رہتا۔ یہ یہ فساد ایک سے زیادہ ارادوں کے کارفرما ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر انجن میں دو مختارِ کل ڈرائیور ہوں تو ان کے اپنے اپنے ارادوں کو عمل میں لانے سے جو نتائج پیدا ہوں گے ان کے تصوّر سے لَفَسَدَتَا کی تفسیر سمجھ میں آجائے گی۔ مختلف خداؤں کا تصوّر (خواہ وہ مستقل بالذّات ہوں جیسے اہرمن و یزداں یا ایک برہما کے مختلف کارندے ہوں جیسے دیوی، دیوتا یا اس کی قوتوں کے مختلف مظاہر ہوں، جیسے شِو، وشنو وغیرہ) ذہنِ انسانی کے عہدِ طفولیّت کی یادگار ہے جب یہ سمجھا جاتا تھا کہ نظامِ عالم کے مختلف شعبوں میں کوئی باہمی ربط و ضبط نہیں، بلکہ وہ الگ الگ کام کرتے ہیں۔ ہوائیں اپنی قوّت سے چلتی ہیں اس لئے وایو دیوتا کی ضرورت ہے۔ بارش اپنے زور سے ہوتی ہے اس لئے اِندر دیوتا کی ضرورت ہے۔ پیدائش، زندگی، موت سب کے لئے الگ الگ خداؤں کی ضرورت ہے۔ لیکن عقلِ انسانی نے اپنی بلوغت کو پہنچ کر مشاہدات و تجربات سے جب کائنات میں یہ کیفیت دیکھی کہ ؎

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں

تو اب اس عقیدہ کی کہاں گنجائش ہے کہ نظامِ عالم ایک سے زیادہ ارادوں کے ماتحت چل رہا ہے؟

قرآنِ کریم نے، جو حقائق کو علم و بصیرت کی کسوٹی پر پرکھتا اور جہل اور توہّم پرستی کو مٹاتا ہے، بتایا کہ وہ ذات غیر محدود قوتوں اور لاانتہا اختیارات کی مالک ہے اور اسے اس چیز کی احتیاج نہیں کہ مختلف ایجنٹ اور کارندے اس کے

دست و بازو بنیں اور نظم و نسقِ عالم میں مختلف شعبوں کے انچارج ہو کر اس کا ہاتھ بٹائیں۔ عالمِ طبعی سے قطعِ نظر، اگر انسان کی تمدنی، عمرانی اور معاشرتی زندگی کو دیکھا جائے تو وہاں بھی "متعدد" خداؤں" کے عقیدہ سے جو فساد رونما ہوتا ہے، دورِ حاضرہ اس کی بہترین یا (بدترین) مثال ہے۔ یہ تمام فتنہ و فساد اور عدمِ اطمینان و فقدانِ سکون کی آگ اس لئے بھڑک رہی ہے کہ انسانوں نے الگ الگ "معبود" تراش رکھے ہیں اور ایک کا "معبود" دوسرے سے برسرِ پیکار ہے۔ (ان خداؤں کی تفصیل آگے آئے گی) الگ الگ "معبودوں" کی جگہ ایک اِلٰہِ حقیقی کو مرکز بنایئے، پھر دیکھئے کہ یہ تمام فساد امن میں تبدیل ہو جاتا ہے یا نہیں۔ فساد تو اس لئے ہے کہ ذہنِ انسانی نے ایک سے زیادہ اِلٰہ تجویز کر رکھے ہیں۔ ایک قوم کا "اِلٰہ" دوسری قوم کو جینے نہیں دیتا۔ ایک ملک کا "خدا" دوسرے ملک والوں کو کھائے جا رہا ہے۔ ہر "اِلٰہ" اپنی "مخلوق" اور اپنے گروہ کو لے کر ایک دوسرے پر چڑھائی کر رہا ہے۔ ہر جگہ فساد ہی فساد ہے۔ اعتدال کا کہیں نام نہیں۔ انسان جس عالمگیر مواخات کی تلاش میں سرگرداں ہے، اس کا سراغ صرف اسی عقیدہ میں ملے گا کہ تمام ممالک اور اقوام کا، یعنی جملہ انسانوں کا، خدا صرف ایک خدا ہے اور یہ کہ ساری دنیا کو اسی کے قوانین کے ماتحت چلنا چاہیئے۔ قرآنِ کریم نے شرک کی شدید مخالفت اسی وجہ سے کی ہے کہ شرک سے کوئی نظام اپنی اصلی حالت پر قائم نہیں رہ سکتا۔ تاکید پر تاکید ہے کہ خدا کے ساتھ کوئی اور اِلٰہ تجویز نہ کرو۔"

وَ لَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ؕ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ (۵۱/۵۱)

اور اللہ کے ساتھ کوئی اِلٰہ مت بناؤ۔ یقیناً میں اس کی طرف سے تمہیں صاف صاف آگاہی دینے کے لئے آیا ہوں۔

اس لئے کہ کائنات کی ہر شے تغیر پذیر اور فنا آشنا ہے، فلہذا، ان میں سے کوئی شے بھی اس قابل نہیں کہ وہ نظامِ کائنات کو مستقلاً ایک نہج پر چلا سکے۔

وَ لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۫ كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (۲۸/۸۸)۔

اور اللہ کے ساتھ دوسرا اِلٰہ مت پکارو۔ اس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں۔ اس کی ذات کے سوا

ہر شے تغیر پذیر ہے۔ حکومت صرف اسی کی ہے اور ہر شے کی گردش اسی کی طرف ہے۔
دنیا میں کوئی قوت ایسی نہیں جو اس کی حکومت اور اختیار میں شریک ہو۔ کائنات میں قانون صرف اسی ایک کا کارفرما ہے۔

أَمْ لَهُمْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ ۚ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ ○ (۵۲/۴۳)

کیا ان کے لئے اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہے۔ اللہ ان کے شرک سے بلند ہے۔

عقیدۂ توحید پر تعجب

چونکہ تمام قوتوں کو ایک ذات میں مرکوز کر دینے کا اعتقاد نظمِ عالم اور ہم آہنگیٔ کائنات کی حقیقت پر مبنی تھا اور یہ حقیقت ذہنِ انسانی کو ایک نئی چیز معلوم ہوتی تھی، اس لئے ان کے سامنے جب یہ عقیدہ پیش کیا گیا تو انہوں نے بے حد تعجب کا اظہار کیا (اور ایسی حقیقت کون سی ہے جسے علم و بصیرت نے انسان کے سامنے پیش کیا ہو اور جہل اور توہم پرستی نے اس سے اِبا نہ کیا ہو؟) وہ حیرت سے کہتے۔

أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلَٰهًا وَاحِدًا ۖ إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ○ (۳۸/۵)

ہیں! یہ کہتا ہے کہ یہ مختلف قوتوں کے مالک، دیوی، دیوتا سب باطل ہیں۔ یہ تمام قوتیں ایک ذات میں مرکوز ہیں، اس لئے الٰہ وہی ایک ہے۔ اتنی بے حد و شمار قوتیں صرف ایک ذات میں مرکوز! یہ تو بڑی تعجب انگیز بات ہے۔

اور اس عقیدہ کو (نعوذ باللہ) ایک مہمل شے سمجھ کر حقارت کی ہنسی ہنستے تھے۔

إِنَّهُمْ كَانُوا إِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ يَسْتَكْبِرُونَ ○ (۳۷/۳۵)

یہ ہیں وہ کہ جب ان سے کہا جاتا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں تو تکبر کیا کرتے تھے۔

اور اس کے پیش کرنے والے کو (معاذ اللہ) دیوانہ بتلاتے تھے۔

وَيَقُولُونَ أَئِنَّا لَتَارِكُو آلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُونٍ ۚ (۳۷/۳۶)۔

اور کہتے ہیں کیا ہم اپنے معبودوں کو ایک شاعرِ مجنون کے کہنے پر چھوڑ دیں۔

لیکن قرآنِ کریم نے اس انکار و اعراض کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ اس لئے کہ اسے یقین تھا کہ علم و عقل کی ترقی کے بعد جب انسان کے سامنے کائنات کے راز کھلیں گے، تو وہ خود بخود اس حقیقت کو ماننے پر مجبور ہو جائیگا کہ اس نظام کے پیچھے صرف ایک ہی مشیت کارفرما ہو سکتی ہے۔ کارگہ کائنات کے اس حسن و ضبط کے ساتھ

چلنے کے لئے وحدتِ قانون ناگزیر ہے۔

اَلَّذِیۡنَ یَجۡعَلُوۡنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـھًا اٰخَرَ ۚ فَسَوۡفَ یَعۡلَمُوۡنَ ○ (۱۵/۹۶)

جو لوگ اللہ کے ساتھ دوسرا معبود تجویز کرتے ہیں، انہیں بہت جلد معلوم ہو جائیگا کہ حقیقت کیا ہے؟

اسی لئے قرآنِ کریم کا دعویٰ ہے کہ جو لوگ ایک سے زیادہ معبودوں کے قائل ہیں، ان کے پاس اس دعوے کی تائید میں کوئی دلیل نہیں۔

اَمِ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اٰلِـھَۃً ؕ قُلۡ ھَاتُوۡا بُرۡھَانَکُمۡ ۚ (۲۱/۲۴)

کیا انہوں نے اللہ کے علاوہ اور معبود اختیار کر رکھے ہیں! کہیئے کہ تم اپنے اس عقیدہ کی تائید میں اپنی دلیل لاؤ۔

اس آیت میں برہان طلب کی گئی۔ لیکن یہ ایک انداز ہے یہ کہنے کا کہ ان کے پاس کوئی برہان نہیں، جیسا کہ دوسری جگہ ہے۔

وَ مَنۡ یَّدۡعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـھًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرۡھَانَ لَہٗ بِہٖ (۲۳/۱۱۷)

اور جو شخص اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا الٰہ پکارتا ہے تو اس کے پاس (اس عقیدہ کے اثبات میں) کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔

نیز یہ بھی بتا دیا کہ چونکہ اس عقیدہ کے مدّعیوں کے پاس کوئی دلیل و برہان نہیں، اس لئے حقائق منکشف ہونے پر انہیں احساس ہوگا کہ وہ کتنی بڑی غلطی میں گرفتار تھے اور اس شکستِ پندار سے اس وقت انکی جو کیفیت ہوگی، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ شرک کی حقیقت انسان پر اُس وقت کھلتی ہے جب وہ اپنی عظمت اور جوہرِ ذاتی کی قیمت

شرک سے انسان کی ذلّت و رسوائی

سے واقف ہو جاتا ہے۔ اس وقت اسے معلوم ہوتا ہے کہ ان حقیر چیزوں کو خدا بنا کر اس نے اپنے آپ کو کسقدر ذلیل بنا رکھا تھا۔ اسی لئے فرمایا۔

لَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـھًا اٰخَرَ فَتَقۡعُدَ مَذۡمُوۡمًا مَّخۡذُوۡلًا ○ (۱۷/۲۲)

خدا کے ساتھ کوئی دوسرا الٰہ تجویز نہ کر ورنہ ایسے ہو رہو گے کہ ہر طرف سے نفرین کے مستحق اور ہر طرف سے راندہ و درماندہ۔

دوسری جگہ ہے۔

وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِىْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝

(۱۷/۳۹)

اور خدا کے ساتھ دوسرا الٰہ مت اختیار کر، ورنہ ملامت کا مستحق اور ٹھکرایا ہوا جہنمی زندگی بسر کرے گا۔

سورۂ شعراء میں ہے۔

فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ۝ (۲۶/۲۱۳)۔

اور اللہ کے ساتھ دوسرا الٰہ مت پکار، ورنہ تو ان میں سے ہو جائے گا جو زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔

سورۂ قٓ میں ہے۔

اَلَّذِىْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِيَاهُ فِى الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ ۝ (۵۰/۲۶)۔

جو اللہ کے ساتھ اور الٰہ بنا لیتا ہے اُسے شدید عذاب میں مبتلا کیا جاتا ہے۔

عباد الرحمٰن، خدا کے بندے، کبھی کسی دوسرے کے سامنے نہیں جھکتے اس لئے کہ وہ اپنی ذات کی عظمت سے آگاہ ہوتے ہیں:

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (۲۵/۶۸)

وہ لوگ جو اللہ کے ساتھ اور الٰہ تجویز نہیں کرتے۔

استبداد کی قوتیں

ان عِبَادُ الرَّحْمٰنِ کی مثال میں اصحابِ کہف کو پیش کیا گیا ہے، جنہوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ خدا کے سوا کسی دوسرے کے سامنے نہیں جھکیں گے۔ استبداد بھلا ایسے جذبہ کی پرورش ہوتے کب دیکھ سکتا تھا اور اربابِ مذہب اپنے "خداؤں" کے خلاف اس قسم کا نعرۂ بغاوت کب گوارا کر سکتے تھے؟ اس لئے انھیں جن خطرات اور صعوبات کا مقابلہ کرنا پڑا ہوگا، ظاہر ہے۔ بہرحال نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بستی کو چھوڑ کر ایک غار میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے (تفصیل کے لئے "شعلۂ مستور" دیکھئے)۔

وَرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا......فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۝ (۱۸/۱۵—۱۴)

اور ہم نے ان کے دل مضبوط کر دیئے جب وہ (عزم راسخ سے راہِ حق میں) اُٹھ کھڑے ہوئے تو انہوں نے برملا کہہ دیا کہ ہمارا رب تو وہ ہے جو آسمان اور زمین کا پروردگار ہے۔ ہم اس کے سوا کسی کو اِلٰہ نہیں تسلیم کریں گے۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو یہ بڑی بے جا بات ہوگی۔ ہماری اس قوم کو دیکھئے! انھوں نے خدا کے سوا اور اِلٰہ بنا رکھے ہیں۔ اگر وہ اِلٰہ ہیں تو یہ ان کے لئے کوئی واضح دلیل کیوں نہیں پیش کرتے۔ پھر اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو خدا کے خلاف جھوٹی تہمت باندھے۔

اور ایک اصحابِ کہف کے زمانے ہی پر کیا موقوف ہے، اپنے آپ کو "خدا" منوانے والوں نے ہمیشہ استبداد سے کام لیا ہے۔ فرعون نے حضرت موسٰےؑ سے یہی کچھ کہا تھا۔

قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ٥ (۲۶/۲۹)

اس نے کہا کہ اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو اِلٰہ تسلیم کیا تو (یاد رکھو) یقیناً تمہیں جیل خانے بھجوا دوں گا۔

اور نشۂ قوت و حکومت میں سرشار ہو کر طنزاً بولا۔

وَ قَالَ فِرْعَوْنُ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ .... وَ اِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ٥ (۲۸/۳۸)۔

فرعون نے کہا کہ اے سرداران! میں تو اپنے سوا تمہارا کوئی اِلٰہ نہیں سمجھتا۔ پس اے ہامان! تم میرے لئے مٹی کی اینٹیں بنا کر ان پر آگ جلاؤ (پکاؤ ان کو پژاوہ میں) پھر میرے لئے ایک بلند مینار بناؤ تاکہ میں اس پر چڑھ کر موسٰی کے خدا کو جھانکوں۔ میں تو اسے جھوٹا ہی سمجھتا ہوں۔

دوسری جگہ ہے۔

وَ قَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْۤ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ٥ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰۤى اِلٰهِ مُوْسٰى وَ اِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا۔ (۴۰/۳۶-۳۷)۔

فرعون نے کہا کہ اے ہامان! میرے لئے ایک بلند مینارہ بنا دے تاکہ میں آسمان کی راہوں تک پہنچ جاؤں۔ پھر وہاں جا کر موسٰےؑ کے خدا کو دیکھوں بھالوں اور میں تو اسے جھوٹا ہی سمجھتا ہوں۔

لیکن فرعون کا انجام بھی بتاتا ہے کہ لَا بُرْهَانَ لَهٗ (مشرک کے دعوے کا بلا سند ہونا) کس قدر حقیقت پر

مبنی ہے۔ جب اس پر اس کی بے بسی ظاہر ہوگئی تو یہ حقیقت سامنے آگئی کہ واقعی اِلٰہ ایک ہی ہو سکتا ہے۔

حَتّٰۤی اِذَاۤ اَدۡرَکَہُ الۡغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنۡتُ اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا الَّذِیۡۤ اٰمَنَتۡ بِہٖ بَنُوۡۤا اِسۡرَآءِیۡلَ وَ اَنَا مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ○ (۱۰/۹۰)

حتّٰی کہ جب وہ (فرعون) ڈوبنے لگا تو اس وقت پکار اُٹھا کہ میں اس حقیقت پر ایمان لاتا ہوں کہ بجز اس اِلٰہ کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور کوئی اِلٰہ نہیں۔ میں بھی اس کے فرمانبرداروں میں سے ہوں۔

فرعون نے کہا کہ "میرے سوا کوئی اِلٰہ نہیں"۔ اس سے اِلٰہ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کی دعوت یہ تھی کہ بنی اسرائیل کو فرعون کی محکومی سے نکال کر آزادی کی فضا میں بسایا جائے جہاں وہ خالص خدا کے احکام کی اطاعت کریں۔ فرعون کا دعویٰ یہ تھا کہ اس کی مملکت میں اطاعت و فرماں پذیری اسی کی ہو سکتی ہے، اس لئے بنی اسرائیل کو اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ کسی اور کے قوانین کی پابندی اختیار کریں۔ اس سے ظاہر ہے کہ شرک یہی نہیں کہ انسان پتھر کی مورتیوں کے سامنے سجدہ ریز ہو، اس سے کہیں بڑا شرک یہ ہے کہ انسان قوانینِ خداوندی کی جگہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی اطاعت کرے۔

مجوسیوں کا شرک

مجوسی (پارسی، جو اپنے آپ کو جناب زرتشت کے پیرو کہتے ہیں) دو مستقل خدا مانتے ہیں۔ ایک نیکی کا خدا، ایک بُرائی کا۔ ایک نور کا خدا، ایک ظلمت کا۔

قرآنِ کریم نے اس عقیدہ کی بھی تردید فرما دی۔

وَ قَالَ اللّٰہُ لَا تَتَّخِذُوۡۤا اِلٰـہَیۡنِ اثۡنَیۡنِ ۚ اِنَّمَا ہُوَ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِیَّایَ فَارۡہَبُوۡنِ ○ (۱۶/۵۱)

اور اللہ کا حکم تو یہ ہے کہ دو اِلٰہ اختیار نہ کرو۔ اِلٰہ وہی ایک ہے۔ سو تم لوگ صرف اسی کے قانون کی خلاف ورزی کے تباہ کُن نتائج سے خوف کھاؤ۔

تثلیث

عیسائی تین خدا مانتے ہیں: باپ، بیٹا، روح القدس۔ یہ عقیدہ بھی باطل ہے۔

لَقَدۡ کَفَرَ الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰہَ ثَالِثُ ثَلٰثَۃٍ ۘ وَ مَا مِنۡ اِلٰہٍ اِلَّاۤ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ؕ (۵/۷۳)۔

بلاشبہ وہ لوگ (حق سے) منکر ہوئے جنہوں نے کہا کہ خدا تین میں ایک کا ہے۔ حالانکہ بجز اس ایک اِلٰہ کے اور کوئی اِلٰہ نہیں۔

یونان کے اقنومِ ثلاثہ کا عقیدہ جو آریہ ورت میں آکر روح، مادہ اور خدا کا عقیدہ بنا، وہ بھی تبعًا اسی میں شامل ہے[1]

احبار و رُہبان

اہلِ کتاب نے مذہبی احبار و رُہبان، علماء و مشائخ کو خدا کا شریک بنا لیا تھا۔ یہ عقیدہ انسانی عظمت و تقدّس کا نقاب اوڑھ کر عقیدت و ارادت کے راستے رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے اور کچھ اس طرح دل کی گہرائیوں میں اپنا گھر بنا لیتا ہے کہ اس کا استیصال بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ (۹/۳۱)۔

انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء و مشائخ کو خدا بنا لیا اور مسیح ابنِ مریم کو بھی۔ حالانکہ ان کو حکم یہی دیا گیا تھا کہ وہ اسی ایک اِلٰہ کی عبودیت اختیار کریں جس کے سوا کوئی دوسرا اِلٰہ نہیں۔ وہ ان کے شرک سے بلند ہے۔

ان اہلِ کتاب سے کہہ دیا گیا کہ انبیاء و رسل یا احبار و رُہبان کو خدا بنا لینے کی تعلیم خدا کی طرف سے نہیں، بلکہ تمہاری تحریفات کا نتیجہ ہے۔

وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (۳/۶۲)

اور اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں۔ یقیناً وہی تمام غلبہ اور حکمت کا مالک ہے۔

شرک کی غیر محسوس شکلیں

ان محسوس شکلوں کے علاوہ قرآنِ کریم شرک کی ایک ایسی شکل بیان کرتا ہے جسے انسان کی آنکھ بھانپ نہیں سکتی تھی۔ اس غیر محسوس شئے کو

---

[1] ہندوؤں کا عقیدہ بھی تثلیث ہی کی طرح ہے۔ وہ برہما (خدا)، پراکرتی (مادہ) اور آتما (روح) کو قدیم مان کر ایک میں تین اور تین میں ایک کے قائل ہیں۔ مشہور فلاسفر رامانج اسی عقیدہ کا پرچارک تھا اور یہی عقیدہ اس کے فلسفہ میں ملتا ہے۔

شرک قرار دینا صرف اس خدائے علیم وبصیر کا کام ہے جو دل کی گہرائیوں میں گزرنے والے خیالات سے بھی واقف ہے۔ فرمایا۔

أَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ أَفَأَنتَ تَكُونُ عَلَيْهِ وَكِيلًا (25/43)

کیا تُو نے اس کو بھی دیکھا جس نے اپنی خواہشات ہی کو اپنا اِلٰہ بنالیا۔ تو کیا تو اس کی نگرانی کر سکتا ہے؟

دوسری جگہ ہے۔

أَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً فَمَن يَهْدِيهِ مِن بَعْدِ اللَّهِ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ (45/23)

کیا تُو نے اس کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہشات ہی کو اپنا اِلٰہ بنالیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قانونِ خداوندی نے اسے باوجود علم کے، گمراہ کردیا اور اس کے کانوں پر اور قلب پر مہر لگادی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ صحیح راستہ کی طرف راہ نمائی اللہ کے قانون کے مطابق ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ کیا تم پھر بھی نصیحت حاصل کرو گے؟

ان آیاتِ مقدسہ کو سامنے رکھئے اور پھر کسی عصرِ حاضر کی مہذب دنیا پر نگاہ ڈالیئے اور کبھی اپنے دل کے نرم ترین گوشوں کو ٹٹولیئے اور دیکھئے کہ حقائق وبصائر کی کتنی دنیائیں اس ایک ٹکڑے کے اندر پوشیدہ ہیں۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کا ارشاد ہے کہ ایک سے زیادہ اِلٰہ مقرر کرلینے سے فساد رُونما ہوجاتا ہے۔ غور کیجئے کہ آج یہ جو ہر طرف فساد ہی فساد رونما ہو رہا ہے تو کیا اس کی یہی وجہ نہیں کہ ہر انسانی قلب صنم کدہ بن رہا ہے؟ ہر گروہ اور ہر قوم اپنی اپنی خواہشات کو خدا بنائے بیٹھی ہے اور اس "خدائے خواہشات وجذبات" کے تغلّب وتسلط میں جائز وناجائز کی کوئی تمیز باقی نہیں رکھتی؟ جائز (بقول لینن ومیکیاولی) وہ ہے جس سے مقصد حاصل ہوجائے اور ناجائز وہ جو حصولِ مقاصد میں مُخل ہو۔ یہ ہیں وہ بُت جنہوں نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔ ان بُتوں کی تعمیر کسی سنگ تراش کے ہاں نہیں ہوتی، بلکہ یہ ذہنِ انسانی کے کارخانے میں ڈھلتے ہیں۔ ان کا مسکن کوئی مندر نہیں، قلبِ انسانی ہے مال اور اولاد کا بت، عزت وجاہ کا بُت، دولت وثروت کا بُت، حکومت وسلطنت کا بُت، ملک ونسب کا

بُت اور خدا جانے کون کون سے لات و منات اور کون کون سے ہبل و عزیٰ انسانی دماغ میں ہر آن تراشے جاتے ہیں۔

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر
رست از یک بند تا اُفتاد در بندے دگر (اقبالؒ)

یہ شرک کی وہ خوفناک اور بھیانک گھاٹی ہے جہاں سے پھسل کر انسان سیدھا ہلاکت اور بربادیوں کے ہولناک جہنم میں جا گرتا ہے۔ قرآن نے کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو باوجود علم کے گمراہ ہو جاتے ہیں۔ علم، حق و باطل میں امتیاز کرتا ہے لیکن جب جذبات عقل پر غالب آجائیں اور خواہشات دماغ پر قابو پالیں تو پھر علم و عقل کبھی صحیح راستہ نہیں دکھا سکتے۔ اس مقام پر پہنچ کر انسان کے کان خطرات کی گھنٹیوں کی طرف سے بہرے ہو جاتے ہیں۔ اس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ اس کا قلب زنگ آلود ہو جاتا ہے اور وہ اپنے اعمال کے نتائج دہ عواقب کو نہیں دیکھ سکتا۔ بقول برنارڈ شا "یورپ جذبات کے دھارے پر بہے چلا جارہا ہے اور نہیں سوچتا کہ اسکا دہانہ کونسی ہلاکتوں کا سمندر ہے"۔[1] یورپ میں علم کی کمی نہیں لیکن سارا علم اسی تگ و دو میں صرف ہو رہا ہے کہ اپنے تغلّب اور دوسروں کی ہلاکت کے لئے کون کونسے طریقے سب سے زیادہ مؤثر اور سریع النفوذ ہو سکتے ہیں۔ آج نوعِ انسانی پر خدا کی زمین اس درجہ تنگ ہونے کی یہی وجہ ہے کہ علم، جذبات کے تابع چل رہا ہے۔ انسان نے اپنی خواہشات ہی کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ علم اگر اللہ حقیقی اور ربُّ العالمین کے قوانین کے ماتحت جہانبانی کرے تو یہی دوزخ جنّت بن جائے۔ علم اس وقت بھی توپ اور بارود بنانے کی تراکیب سوچے گا لیکن توپ بن جانے کے بعد اس کا رُخ انسانی مفاد پرستیوں کی رُو سے متعین نہیں ہوگا۔ اس بات کا فیصلہ کہ توپ ظالم کا ظلم روکنے کے لئے استعمال کی جائیگی یا اس کا نشانہ کمزور اور ناتواں قوموں کا مسکن ہوگا، توپ بنانے والا نہیں کریگا، بلکہ کوئی اور قوت کریگی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کو آسمانی ہدایت اور وحی کی ضرورت پڑتی ہے۔ جب انسان اپنے علم کے ماحصل کو خدا کے قوانین کے ماتحت استعمال کریگا تو یہی علم جو آج انسانیت سوز بن رہا ہے، انسانیت ساز بن جائیگا اور اس وقت لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا صحیح مفہوم سمجھ میں آجائے گا۔

---

[1] برنارڈ شاہ نے یہ الفاظ جنگِ یورپ (۱۹۳۹ء) سے پہلے کہے تھے۔ اس جنگ نے بتادیا کہ بربادی کا وہ کونسا سمندر ہے جس میں یورپ خود اپنے ہاتھوں غرق ہوا ہے۔ مزید تفصیل "انسان نے کیا سوچا" میں ملے گی۔

الٰہ حقیقی کی جو صفات گذشتہ صفحات میں آپ کے سامنے آئی ہیں، ان پر ایک دفعہ پھر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ زندگی کا کوئی گوشہ بھی ایسا رہ جاتا ہے جس کے لئے کسی اور "الٰہ" کی تلاش رہے۔ (۱) زندگی بخشنے والا (۲) پرورش کرنے والا (۳) رزق دینے والا۔ (۴) امن وسلامتی عطا فرمانے والا۔ (۵) ہر وقت نگہبان۔ (۶) بگڑی بنانے والا۔ (۷) ہر معاملہ میں کارساز۔ (۸) وہ جس پر کامل بھروسہ کیا جا سکے۔ (۹) جسے مایوسیوں میں پکارا جائے۔ (۱۰) جس کے قبضہ میں نفع و نقصان ہو۔ (۱۱) جو حاضر و غائب کا علم رکھتا ہو۔ (۱۲) سب پر غالب۔ (۱۳) عظمتوں کا مالک۔ (۱۴) ہر عیب سے منزہ (۱۵) مالک الملک۔ (۱۶) شہنشاہِ حقیقی۔ (۱۷) جس کی زندگی کے لئے فنا نہ ہو۔ (۱۸) جس کے سب محتاج ہوں۔ کیا اس ہستی کے علاوہ کوئی اور ہستی بھی اس قابل ہے کہ اس کی عبودیت اختیار کی جائے، اس کی محکومیت تسلیم کی جائے، اس کے قوانین کے سامنے جھکا جائے؟ اس کے بعد سوچئے کہ لَآ اِلٰہَ کے کیا معنی ہیں؟

این دو حرفِ لَآ اِلٰہ گفتار نیست — لا الٰہ جز تیغِ بے زنہار نیست
لا مقامِ ضرب ہائے پے بہ پے — ایں غو رعد است، نے آوازِ نَے
ہر قبائے کہنہ چاک از دستِ اُو — قیصر و کسریٰ ہلاک از دستِ اُو
ہر کہ اندر دستِ اُو شمشیرِ لاست — جملہ موجودات را فرماں رواست (اقبالؒ)

لیکن صرف لَآ ہی نہیں اس کے بعد اِلَّا بھی، یعنی نفی کے بعد اثبات، تخریب کے بعد تعمیر، انکار کے بعد اقرار، لَآ اِلٰہ کے بعد اِلَّا اللہ۔

در مقامِ لا نیاساید حیات
سوئے اِلَّا می خرامد کائنات

آئیے، اس لَآ کے بعد اب اِلَّا کی طرف چلیں کہ جس طرح خدا کا صحیح اقرار ناممکن ہے جب تک ہر غیر خدا قوت سے انکار نہ کر دیا جائے، اسی طرح محض انکار بھی فساد ہی فساد ہے جب تک خدا کا اقرار نہ کیا جائے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ۔ یہ ہے مکمل ایمان۔

۳

اللہ

اللہ اسم ذات ہے جیسا کہ سابقہ عنوان میں بتایا جا چکا ہے، خدا کا ذاتی نام (قرآن کی رُو سے) اللہ ہے، جو ال اور اِلٰہ کا مرکب ہے۔ یعنی وہ اِلٰہِ واحد جس کا تصور قرآن پیش کرتا ہے اور جس کی صفات اس شرح و بسط سے اس میں بیان ہوئی ہیں۔

حقیقتِ ذات کا ادراک اللہ کیا ہے؟ اس کی ہستی کیسی ہے؟ اس کی ذات کی کُنہ و حقیقت کیا ہے؟ وہ کہاں سے آگیا؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب عقلِ انسانی کے احاطہ سے باہر ہے۔ عقل درحقیقت نام ہے ان مجموعی نتائج کا جو انسان اپنے علم و مشاہدات سے حاصل کرتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ وہ ذرائع جن سے انسان علم حاصل کرتا ہے محدود ہیں۔ سو جب وہ ذرائع محدود ہیں تو ان ذرائع کا ماحصل بھی محدود ہی ہوگا اور محدود، لامحدود کا ادراک کس طرح کر سکتا ہے؟ وہ انسان جو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کر سکا کہ وہ خود کیا ہے، وہ کیا معلوم کر سکے گا کہ خدا کیا ہے؟ وہ شخص جو مشینری کی حقیقت تک پہنچنے سے عاجز ہے، مشینری بنانے والے کی کُنہ و حقیقت کا کس طرح احاطہ کر سکتا ہے؟ ذاتِ خداوندی کی ماہیت کا علم، انسان کی سرحدِ ادراک سے ماوراء ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم عرفان (خدا کے پہچاننے) کا تقاضا نہیں کرتا

ایمان و عرفان ایمان (مان لینے) کا تقاضا کرتا ہے۔ جس چیز کو انسان براہِ راست نہ سمجھ سکے، اس کے متعلق اندازہ لگانے کا دوسرا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اس جیسی کسی دوسری شے پر غور کیا جائے، لیکن وہ ذات بے مثل و بے نظیر ہے۔

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (۴۲/۱۱)

اس کی مثل کوئی شے نہیں۔

لہٰذا خدا کی ماہیت انسان کے ذہن میں کیسے آسکتی ہے؟

محسوسات کا خوگر انسان ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ بسیط سے بسیط حقیقت بھی لباسِ مجاز میں اس کے سامنے جلوہ بار ہو، یا کم از کم اس حقیقتِ مجردہ کو بیان اس انداز سے کیا جائے کہ وہ اس کے ذہن میں ایک محسوس پیکر کا تصور قائم کرسکے۔ یہی وہ بنیادی غلطی تھی جس کی وجہ سے انسان نے بُت پرستی اختیار کی۔ اسلام چونکہ علم و بصیرت کا دین ہے، اس لئے اس نے وہ تمام دروازے بند کر دیئے جن کے راستے اس قسم کی توہّم پرستی ذہن انسانی میں داخل ہو سکتی تھی۔ اس نے ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق کوئی مثال بھی ایسی بیان نہیں کی جس سے ذہن کسی محسوس و مشہود پیکر کی طرف منتقل ہو جائے۔ وہ حقیقت کو حقیقت رکھنا چاہتا ہے۔ ذہنِ انسانی کا تقاضا پورا کرنے کے لئے اسے کسی مجسّمہ میں تبدیل نہیں کرنا چاہتا۔

صفاتِ الٰہی

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ذاتِ خداوندی کی حقیقت و ماہیت سرحدِ ادراک سے ماوراء ہے۔ (لیکن چند ملحدین کے سوا) خدا کی ذات کا کوئی منکر نہیں۔ ملحدین کا انکار بھی دراصل انکار نہیں، الفاظ کا پھیر ہے۔ وہ قوت جو نظم و نسقِ عالم کو برقرار رکھے ہوئے ہے، ماننے والوں کے نزدیک خدا ہے اور نہ ماننے والوں کے نزدیک فطرت (NATURE) ۔ نہ ان کا ذہن ذاتِ خداوندی کی ماہیت کا احاطہ کرسکتا ہے نہ یہ فطرت کی حقیقت بتا سکتے ہیں۔ ذہنِ انسانی محسوسات کی حد تک علّت و معلول کے سلسلہ کو معلوم کرسکتا ہے، لیکن علّت العلل کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔

جن چیزوں سے خدا کا تصور ذہن میں مرتسم ہوتا ہے، وہ اس کی صفات ہیں، یعنی خدا کن قوتوں کا مالک ہے، نظامِ کائنات میں اس کے قوانین کس کس انداز سے کارفرما ہوتے ہیں (وغیرہ وغیرہ)۔ صفاتِ خداوندی کے صحیح تصور سے خدائے حقیقی کا صحیح ایمان قلبِ انسانی میں پیدا ہوتا ہے اور ان کے غلط تعیّن سے انسان باطل پرست ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے صفاتِ خداوندی کو اس شرح و بسط اور صحت و صواب کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ان کی رُو سے انسان خدا کے متعلق صحیح تصور قائم کرسکتا ہے۔ مذاہبِ عالم میں کوئی مذہب ایسا نہیں جو حتم و یقین کے ساتھ کہہ سکے کہ اس کی آسمانی کتاب تحریف و الحاق سے پاکیزہ اور ذہنِ انسانی کی آمیزش سے منزّہ ہے۔ حتم و یقین سے ایسا کہنا تو ایک طرف، انھیں اس کا اعتراف و اقرار ہے کہ ان کے بانیٔ مذہب کی کتاب اپنی اصلی شکل میں ان کے پاس موجود نہیں ہے (ان امور کی تفصیل میری کتاب "مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں" میں ملے گی)۔ اب ظاہر ہے کہ ان تحریف شُدہ کتابوں کی رُو سے انسانی ذہن جس قسم کے

خدا کا تصور پیدا کرے گا وہ خود انسانی تخیلات ہی کا پیکر ہوگا، یعنی خدا کی صفات، خود انسانی صفات کا بڑھا ہوا عکس ہوں گی۔ مثلاً انسان کے دو ہاتھ ہیں تو خدا کے چار ہاتھ بنا دیئے جائیں گے۔ انسان ایک پتھر اُٹھا سکتا ہے تو خدا ایک پہاڑ اُٹھا لے گا۔ انسان کا قد پانچ چھ فٹ کا ہوتا ہے خدا کا قد پچاس ساٹھ فٹ کا ہو جائے گا۔ ہندوستان کے دیوی دیوتا اور اصنامیاتِ یونان کے مجسّمے اسی تصور کے مظاہرات ہیں۔ انسان کا ذہن، انسان اور مظاہرِ فطرت سے الگ ہو کر خدا کا کوئی تصور پیدا ہی نہیں کر سکتا اور یہ اس امر کی سب سے بڑی داخلی دلیل ہے کہ دیگر آسمانی کتابوں میں ذہنِ انسانی کی آمیزش ہو چکی ہے۔ مثلاً ہندوؤں کی مزعومہ آسمانی کتاب، رگوید نمبر ۱ اسوکت نمبر ۹۰ منتر نمبر ۱۳۔ ۱۲ یا یجروید ادھیائے نمبر ۳۱، منتر نمبر ۱۲۔ ۱۱ میں ہے۔

ذہنِ انسانی کا پیدا کردہ خدا

ویدوں میں خدا کا تصور

> برہمن اُس کے منہ سے (پیدا) ہوئے اور اس کے بازوؤں سے کشتری ذات کے لوگ پیدا ہوئے۔ جو ویش ہیں، وہ اس کی ٹانگوں سے پیدا ہوئے اور پرمیشور کے دونوں پاؤں سے بچارے شودر پیدا ہوئے۔ چاند اس کے منہ سے پیدا ہوا اور آنکھوں سے سورج پیدا ہوا۔ منہ سے اِندر اور اگنی دیوتا پیدا ہوئے اور سانس سے ہوا پیدا ہوئی!

یا مثلاً یجروید ادھیائے نمبر ۳۱ منتر ۱۳ میں ہے۔

> پرمیشور کی ناف سے طبقۂ وسطیٰ (پیدا) ہوا۔ سر سے طبقۂ علوی پیدا ہوا۔ پرمیشور کے دونوں کانوں سے زمین اور کانوں سے اطراف اور گوشے پیدا ہوئے۔

اتھروید کانڈ نمبر ۱۱، سوکت نمبر ۲ منتر نمبر ۶ ــ ۵ میں ایشور کا سروپ (حلیہ) یہ بیان کیا گیا ہے۔

> ہے پشوپتے جیون کے سوامی! پرماتمن! تیرے مکھ (منہ) کو نمسکار ہے۔ ہے بھوسروا تپاوکٹ ایشور! تیری جو چکشو ہیں (آنکھیں ہیں) ان کو بھی نمسکار ہے۔ تیری توچا (چمڑی) کو نمسکار ہے۔ ...... ہے پرمیشور! تیرے انگوں (اعضاء) کو نمسکار ہے۔ تیرے اودر بھاگ (پیٹ) کو نمسکار ہے۔ تیری جیبھ (زبان) کو نمسکار ہے۔ تیرے مکھ (چہرے) کو نمسکار ہے۔ تیرے دانتوں کو نمسکار ہے۔ تیرے (دانتوں) کی گندھ (بُو) کو نمسکار ہے۔

یجروید ادھیائے نمبر ۱۳ منتر ۸ ــ ۶ میں ہے۔

سانپوں کی پرستش | زمین میں رہنے والے سانپوں کو سجدہ (قبول) ہو اور جو سانپ ہوا میں یا آسمان پر ہیں ان کو ہمارا سجدہ ہے۔ جو سانپ یا تو دھانوں کے تیروں کے ساتھ آتے ہیں یا نباتات میں ہیں یا جو سانپ اپنے بلوں میں ہیں ان کو ہمارا سجدہ قبول ہو۔ جو سانپ درمیوں میں یا سورج کی کرنوں میں اور پانیوں میں رہتے ہیں ان کو ہمارا سجدہ قبول ہو۔ (انگریزی ترجمہ کے لئے پرنسپل گرفتھ ایم۔ اے کا ترجمہ دیکھئے)

یجرو ید ادھیائے نمبر ۲، منتر نمبر ۶۲ میں ہے۔

اُسترے کو سجدہ | ہے استرے تو کلیان کاری ہے اور اچھے لوہے کا بنا ہوا ہے تجھے نمسکار (سجدہ) ہو تو اس بالک کو ہانی (تکلیف) مت پہنچانا۔

اتھرو ید کانڈ نمبر ۱، سوکت نمبر ۲۵، منتر نمبر ۴ میں ہے۔

بخار کو سجدہ | سردی والے بخار کو سجدہ قبول ہو۔ گرمی والے رورو نامی بخار کو بھی میں سجدہ کرتا ہوں۔ روزانہ، دوسرے اور تیسرے دن آنے والے بخار کو میرا سجدہ قبول ہو۔

ظاہر ہے کہ قابلِ پرستش اشیاء کے مذکورہ بالا تصورات، انسان کے محدود تخیلات کی پیداوار ہیں۔ کانٹ نے لکھا ہے کہ جس قسم کا معبود کوئی قوم اپنی پرستش کے لئے تجویز کر لیتی ہے، وہ معبود اس قوم کے تمدن و تہذیب کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس لئے کہ معبود کی عظمت اور تقدس کا تقاضا ہوتا ہے کہ انسان اسے بہترین لباس میں پیش کرے۔ لہٰذا کسی قوم کا تجویز کردہ معبود، یعنی وہ معبود جو ذہنِ انسانی کی پیداوار ہو، اس قوم کے ذہنی ارتقاء کے آخری نقطہ کو ظاہر کرے گا۔

اوتار کا عقیدہ | اوتار کا عقیدہ بھی انسان کے اسی رجحان کا آئینہ دار ہے اس نے جہاں کسی انسان میں کوئی ایسا جوہر دیکھا جو عام انسانوں میں کم ملتا ہے، اسے فوراً فوق البشر اور خدا بشکل انسان تصور کر لیا۔ اوتار کے اسی عقیدہ کو عیسائیت نے اپنا کر الوہیتِ مسیح کے قالب میں ڈھال لیا۔ ڈاکٹر براؤن نے اپنی کتاب (RESEARCHES IN ORIENTAL HISTORY) میں اس چیز کو بڑی تحقیق و کاوش سے ثابت کیا ہے کہ الوہیتِ مسیح عقیدۂ اوتار ہی کی صدائے بازگشت ہے۔ اس کے علاوہ اکثر عیسائی محققین اس نتیجہ پر

ینابیع المسیحیت | پہنچے ہیں کہ مسیحیت کی موجودہ تعلیم کا بیشتر حصہ بدھ مت کی قدیم تعلیم سے لیا گیا

ہے۔ چنانچہ مشہور مستشرق (MAX MULLER) اپنی کتاب (SCIENCE OF RELIGION) میں لکھتا ہے۔

(مہاتما) بدھ اور ان کے شاگردوں کی زبان اور (حضرت) عیسیٰ اور ان کے حواریوں کی زبان میں عجیب تطابق پایا جاتا ہے۔ بدھ مت کے اکثر افسانے اور تمثیلات سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ انجیل کے عہدِ جدید سے اخذ کئے گئے ہیں، حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ وہ سنہ عیسوی کے شروع ہونے سے بہت پہلے دنیا میں موجود تھے۔

(BUNSEN) اپنی کتاب (ANGEL MESSIAH) میں لکھتا ہے؛

بدھ مت کے متعلق جو قدیم ترین ریکارڈ ملتے ہیں، ان میں مہاتما بدھ کی زندگی اور تعلیم سے متعلق جو کچھ نظر آتا ہے، عجیب بات ہے کہ وہ نمایاں طور پر ان روایات سے ملتا ہے جو حضرت مسیح کے متعلق اناجیل میں پایا جاتا ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ اسے محض ایک اتفاقی امر کہہ لیا جائے اور یہ تعجب اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ جب یہ دیکھا جائے کہ یہ روایات صرف صحیفۂ لوقس اور کتابِ چہارم میں پائی جاتی ہیں۔ ان سے پہلی کتابوں میں ان کا ذکر نہیں۔

اس تذکرہ سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ جب انسان اپنے ذہن سے خدا کی تخلیق کرتا ہے تو خدا انسان بن کر رہ جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے خدائے بلند و برتر کی جو صفات بیان کی ہیں، ان سے واضح ہو جاتا ہے کہ انسانی تخیلات میں اور اس تعلیم میں جس کا سرچشمہ ذہنِ انسانی سے ماوراء ہے، کس قدر فرق ہے۔

ذاتِ خداوندی (اللہ) کی صفات کا تفصیلی تذکرہ آئندہ ابواب میں ایک ایک کر کے آپ کے سامنے آئیگا، لیکن ان میں سے چار صفات ایسی ہیں جن کا ذکر (قرآنِ کریم نے ایک مختصر سی سورت میں اس انداز سے کیا ہے گویا وہ خدا کی بنیادی صفات ہیں۔ وہ سورۃ یہ ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَ لَمْ يُوْلَدْ ۝
وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (۱۱۲/۱-۴)

(اے رسول) اس کا اعلان کر دے کہ اللہ ایک (احد) ہے۔ وہ الصّمد ہے۔ نہ وہ کسی کی اولاد ہے نہ کوئی اس کی اولاد ہے اور اس کی مثل و نظیر کوئی نہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ دیگر صفات سے پہلے ان چہار صفات کے متعلق اس عنوان میں گفتگو کی جائے۔

ھُوَ اَحَدٌ

ذاتِ خداوندی کی بنیادی صفت احدیّت ہے۔ احد اور واحد کے ویسے تو ایک ہی معنی ہیں یعنی ایک جس کے ساتھ کوئی نہ ہو، لیکن احدیّت میں یگانہ (UNIQUE) ہونے کا پہلو غالب ہوتا ہے۔ ذات (PERSONALITY) کی بنیادی صفت یہ ہے کہ وہ اپنے آپ میں یگانہ ہوتی ہے۔ کوئی ذات کسی دوسری ذات میں شریک نہیں ہوسکتی۔ اس کو اس کی انفرادیّت (INDIVIDUALITY) کہتے ہیں۔ سو خدا کی ذات احد ہے۔ اس کا شریک کوئی نہیں۔ وہ یگانہ ہے۔ اس میں کوئی اور شامل نہیں ہوسکتا۔

مجوسیوں کے عقیدہ کا بطلان

ذات کے اَحد ہونے سے، اوّل مجوسیوں کے اس عقیدہ کا بطلان ہوگیا کہ اہرمن و یزداں دو مستقل بالذّات خدا ہیں۔

وَ قَالَ اللّٰہُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰـہَیْنِ اثْنَیْنِ ۚ اِنَّمَا ھُوَ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِیَّایَ فَارْھَبُوْنِ ۝ (۱۶/۵۱)۔

اور اللہ نے کہا ہے کہ دو الٰہ مت بناؤ۔ الٰہ تو صرف وہی ایک ہے۔ سو صرف میرے ہی قانون سے ڈرو۔

عقیدۂ تثلیث کی تردید

اور دوم، عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث کی تردید ہوگئی کہ باپ، بیٹا، روح القدس تین میں ایک اور ایک میں تین خدا ہیں۔

یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ وَ لَا تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ .... وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا ۝ (۴/۱۷۱)۔

اے اہلِ کتاب، تم اپنے دین میں حد سے مت باہر نکلو اور خدا کی شان میں حق کے سوا اور کچھ نہ کہو۔ مسیح، عیسیٰ ابنِ مریم، بجز اس کے کچھ نہیں کہ وہ اللہ کا رسول تھا اور اس سلسلۂ رشد و ہدایت کی ایک کڑی جس کے متعلق مریم کو بتا دیا گیا تھا اور اس کی تعلیم وحیٔ خداوندی پر مبنی تھی۔ سوتم، عقیدۂ الوہیتِ مسیح کو چھوڑ کر، اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور یوں مت کہو کہ خدا تین ہیں۔ ایسی بات کہنے سے باز آجاؤ۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ الٰہ حقیقی ایک ہی الٰہ ہے۔ اُسے اولاد کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور

زمین میں ہے، سب اس کی ملکیت ہے اور اللہ کارساز ہونے میں کافی ہے۔ (اس لئے اسے کسی سہارے کی کیا ضرورت ہے)۔

دوسری جگہ ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (۵/۷۳)۔

یقیناً ان لوگوں نے (حق سے) انکار کیا جو کہتے ہیں کہ اللہ تین میں کا ایک ہے، حالانکہ بجز ایک اِلٰہ کے اور کوئی اِلٰہ نہیں اور اگر یہ لوگ ان باتوں سے باز نہ آئے تو ان میں سے جن لوگوں نے انکارِ حق کیا ہے ان پر دردناک عذاب واقع ہوگا۔

دیوی دیوتا شرک کی ایک قسم تو یہ ہے کہ خدا کی ذات میں دوسروں کو شریک ٹھیرایا جائے، یعنی ایک سے زیادہ خدا مانے جائیں، دوسری قسم یہ ہے کہ اس کے کاروبار اور حکم و ارادہ میں دوسری قوتیں کو شریکِ کار سمجھ لیا جائے۔ ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق برہما پیدا کرنے والا، وشنو پالنے والا اور شو ہلاک کرنے والا ہے۔ ان کے علاوہ سینکڑوں دیوی، دیوتا، مختلف شعبہ جاتِ قضا و قدر کے مختار ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم کا ارشاد ہے۔

مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ۡ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ۝ (۱۸/۲۶)

انسانوں کے لئے اس کے سوا کوئی کارساز نہیں اور وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

جب کوئی اس کے حکم و ارادہ میں شریک نہیں ہو سکتا تو پھر کارساز کیسے بن سکتا ہے۔

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ۭ قُلْ اِنِّىْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (۶/۱۴)۔

کہیئے کہ کیا (تم چاہتے ہو کہ) میں اللہ کے سوا، جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، کسی اور کو کارساز بنا لوں، حالانکہ وہ (سب کو) سامانِ زیست عطا کرتا ہے اور اسے

کسی سے سامانِ زیست لینے کی احتیاج نہیں ہے کیونکہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکنے والوں میں پہلا جھکنے والا ہوں اور تم مشرکین میں سے مت ہو جانا۔

رسولوں کی پرستش

دیوی دیوتاؤں کے بعد انسان نے خدا کے رسولوں کو خدا بنالیا اور اس سے دنیا کے کسی مذہب کے پیرو بھی نہیں بچے۔ حتیٰ کہ بدھ مت اور جین مت، جن کی تعلیم میں خدا کا تصور ہی نہیں، ان کے پیروؤں کی بھی یہ حالت ہوگئی کہ جناب بدھ اور مہاویر کی وفات کے تھوڑے عرصہ بعد ان کی پرستش ہونے لگی۔ جناب کنفیوشس نے دیوتاؤں کی پرستش کی مذمت کی تھی، لیکن پھر چین کے مندروں میں خود کنفیوشس کے مجسموں کی پوجا ہونے لگی۔ اہلِ چین کا دوسرا مذہب طائیت (TAOISM) ہے جس کے بانی (LAO-TZE) تھے۔ انھوں نے بھی بت پرستی کی تعلیم نہیں دی لیکن اس کے باوجود گذشتہ دو ہزار سال سے خود (LAO-TZE) کے بت کی پرستش ہوتی چلی آرہی ہے[1]۔ جاپان میں بدھ کے مجسمات کے ساتھ ان کے "خدا" کے مظاہر یعنی اس تلوار اور آئینہ کی پرستش بھی کی جاتی ہے جو ان کے قدیم مذہب (SHINTO) کے مطابق سورج کی دیوی نے اپنے پوتے یعنی جاپان کے پہلے شہنشاہ کے حوالے کئے تھے۔ مسیحیت میں حضرت

بانیانِ مذہب کے مجسمے

عیسیٰؑ کی الوہیت کے ساتھ ساتھ ان کے اور حضرت مریمؑ کے مجسموں کی پرستش کی جاتی ہے۔ ہندوؤں کے اوتار کا عقیدہ اسی رسول پرستی کی جھلک ہے یا، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، عیسائیوں کی رسول پرستی، ہندوؤں کے عقیدۂ اوتار کا چربہ ہے۔ قرآنِ کریم نے رسول پرستی کے دروازہ کو اس مضبوطی سے بند کر دیا کہ ذہنِ انسانی کی کوئی خوش عقیدگی اسے کھول نہیں سکتی (تفصیل "ابلیس و آدم" میں رسالت کے عنوان میں ملے گی)۔ یہاں صرف ایک آیت پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا

---

[1] اب چین میں سوشلزم عام ہو رہی ہے جس کی رُو سے کسی قسم کے خدا پر ایمان باقی نہیں رہتا۔ اس لئے ان کے ہاں "خداؤں" کی پرستش یا تو عہدِ پارینہ کی داستان بن گئی ہے، یا ہنوز، ان قدامت پرستوں میں باقی ہوگی جو سوشلزم کے عقیدۂ الحاد سے متاثر نہیں ہوئے ہوں گے۔ ایسے لوگ وہاں شاذ ہی ہوں گے۔

رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ وَ لَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَ النَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ (۳/۷۸-۷۹)

کسی انسان کو یہ بات سزاوار نہیں کہ اللہ اسے کتاب و حکمت و نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے کہنے لگے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میری عبودیت اختیار کرو بلکہ (وہ یہی کہے گا کہ) تم اس کتاب اللہ کی اطاعت سے جس کی تم دوسروں کو تعلیم دیتے ہو اور جس پر غور و تدبر سے تم اس کے حقائق کی تہ تک پہنچتے ہو، ربانی بن جاؤ اور نہ ہی وہ تمہیں یہ حکم دیگا کہ کائناتی قوتوں اور رسولوں کو اپنا خدا بنالو. کیا وہ تمہیں اسلام کے بعد کفر کی تعلیم دے گا۔

یعنی لوگوں نے جو رسولوں کی پرستش شروع کی ہے تو یہ ان کی اپنی وضع کردہ روش ہے۔ خدا کے کسی رسول نے انہیں ایسا کرنے کا حکم نہیں دیا. خدا کے رسول، خدا پرستی سکھانے کے لئے آتے تھے، اپنی پرستش کرانے کے لئے نہیں. لیکن ذہنِ انسانی کا کیا علاج کہ اس نے رسولوں کو خدا بنانے سے دریغ ہی نہیں کیا!

مذہبی پیشواؤں کی عبودیت

رسولوں کے بعد ان احبار و رہبان، یعنی مذہبی پیشواؤں کی باری آتی ہے جنھیں پہلے خدا تک پہنچانے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور بعد میں خود انہی کو خدا بنالیا جاتا ہے. مجوسیوں کے مُغ (MAGI) ہندوؤں کے برہمن، بدھوں کے لاما، عیسائیوں کے راہب، سب کی پرستش ہوتی ہے. قرآنِ کریم نے ان کھڑکیوں کو بھی مقفل کردیا. فرمایا۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ .... شَدِيْدُ الْعَذَابِ (۲/۱۶۵)۔

اور لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو خدا کے علاوہ اوروں کو بھی خدا بنا لیتے ہیں. وہ ان کے احکامات کی اسی طرح اطاعت کرتے ہیں جس طرح خدا کے احکام کی اطاعت کرنی چاہیئے. لیکن جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں، وہ نہایت شدت سے ان قوانین کی اطاعت کرتے ہیں اور کسی انسان کو خدائی قوتوں میں شریک نہیں سمجھتے۔

لیکن یہ بات ان (اولُ الذکر) لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک ان کی اس غلط روش کے تباہ کن نتائج ان کے سامنے نہ آجائیں. اس وقت یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ ہر قسم

کی قوت اور اقتدار خدا ہی کے لئے ہے اور اس کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں۔

اہلِ کتاب کو دعوتِ توحید

شرک کے اس گوشے کے پیشِ نظر قرآن کریم نے اہلِ کتاب کو بھی توحید کی دعوت دی۔ فرمایا۔

قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ○ (۳/۶۳)۔

کہیئے کہ اے اہلِ کتاب! آؤ اس بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے دونوں کے لئے یکساں طور پر مسلّم ہے، یعنی اللہ کے سوا کسی کی عبودیت اختیار نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریکِ حکم نہ گردانیں اور اللہ کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو معبود نہ بنالیں۔ پھر اگر یہ لوگ (اس دعوت) سے رُوگردانی کریں تو کہہ دو کہ تم گواہ رہنا کہ ہم خدا کے ماننے والے ہیں (انکار تمہاری ہی طرف سے ہے)۔

مادہ پرستی کے عقائد

یہ تو ہے محسوسات کو خدا بنالینا، لیکن قرآنِ کریم علاماتِ مرض کا علاج نہیں کرتا بلکہ علتِ مرض کا استیصال کرتا ہے۔ اس کی نگاہ، لطیف سے لطیف، غیر محسوس اسباب وعلل پر ہوتی ہے جن کی بنیادوں پر محسوسات کی عمارات اٹھتی ہیں۔ ہم بداہتاً دیکھتے ہیں کہ نظامِ فطرت علّت ومعلول (CAUSE AND EFFECT) کے اصول پر چل رہا ہے۔ اسباب کے جمع ہونے سے نتائج مرتب ہوجاتے ہیں۔ محسوسات کا خوگر انسان انہی اسباب کو مؤثر بالذات سمجھ لیتا ہے یعنی وہ سمجھتا ہے کہ یہ خاصیتیں ان چیزوں کے اندر ازخود موجود ہیں۔ یہی خیال مادّہ پرستی کی بنیاد ہے۔ ایک شخص دیکھتا ہے کہ سنکھیا کھانے والا تھوڑے عرصہ میں مرجاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ سنکھیا کے اندر یہ خاصیت ازخود موجود ہے کہ وہ قاطعِ زندگی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ زمین کو نرم اور ہموار کرکے اس میں تخم ریزی کی جائے اور پھر مناسب اوقات پر اُسے پانی دیا جائے تو اس سے پودے اُگ جاتے ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ ان اشیاء میں یہ قوتیں بالذات موجود ہیں اور جب نتائج انہی اسباب کے جمع ہونے کا نام ہے تو پھر کسی "خارجی

قوت کی ضرورت کہیں لاحق نہیں ہو سکتی۔

انسان اپنے عہدِ طفولیّت میں ان چیزوں کو قابلِ تعظیم سمجھتا تھا جن سے فائدے حاصل ہوتے تھے اور ان سے ڈرتا تھا جن سے نقصان پہنچتا تھا، لہٰذا انھیں سجدے کرتا تھا۔ ان کی پرستش سے انھیں خوش رکھنا چاہتا تھا۔ گائے، گنگا، تلسی کا پودا، پیپل کا درخت یا دوسری طرف سانپ، گرج، زلزلہ سب انہی جذبات کے ماتحت پرستش کے قابل قرار دیئے گئے۔ جب انسان ذرا آگے بڑھا تو اس نے ان چیزوں کی پرستش کو تو چھوڑ دیا، لیکن اب ان اشخاص کی پرستش ہونے لگی جن کے ہاتھوں سے یہ چیزیں ملتی تھیں۔ تلسی کے پودے کی پرستش چھوڑی، تو اس سنیاسی کی پرستش شروع کر دی جو یہی پتے اپنی جھولی سے نکال کر دیتا تھا۔ یہ پرستش پتوں کی ہو یا پتے دینے والوں کی، ہوتی تھی اسی جذبہ کے ماتحت۔ یعنی سمجھا یہ جاتا تھا کہ ان چیزوں یا انسانوں کے اندر یہ خاصیتیں از خود موجود ہیں کہ وہ نفع یا نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ آجکل اس پرستش کا زمانہ تو نہیں رہا، لیکن وہ جذبہ جس کے ماتحت یہ پرستش ہوتی تھی، ہنوز باقی ہے۔ اب بھی جب اسے بیماری سے شفا ملتی ہے تو ہرچند وہ مگنیشیا کی اس بوتل کو نمسکار نہیں کرتا جو اس کی شفا کا ذریعہ بنی تھی، لیکن اس ڈاکٹر کو یقیناً شفا بخشنے والا سمجھتا ہے، جس نے مگنیشیا دیا تھا۔ یہ عقلِ انسانی کا دوسرا درجہ ہے۔ یہی عقل جب پختگی حاصل کر لیتی ہے تو اس وقت جس طرح آج کے انسانوں نے بوتل کو نمسکار کرنا خلافِ عقل سمجھا ہے، اس، اپنے جیسے، انسان کے متعلق بھی یہ سمجھنا چھوڑ دے گا کہ وہ شفا دینے کا اختیار رکھتا ہے۔ اس وقت اس کی نگاہیں اس حقیقت کا اعتراف کریں گی کہ کائنات میں ہر عمل کا نتیجہ خدا کے مقرّر کردہ قانون کے مطابق مرتّب ہوتا ہے۔ اسی قانون کے مطابق چلنے سے صحت اور تندرستی ملتی ہے اور اس کی خلاف ورزی کرنے سے بیماری اور آخرالامر موت واقع ہو جاتی ہے۔ مختلف علوم کے ماہرین کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ ان قوانینِ خداوندی کا علم رکھتے ہیں۔ وہ ان قوانین کو بدلنے یا ان کے خلاف نتائج مرتّب کرنے کا اختیار و اقتدار قطعاً نہیں رکھتے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن نے (حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے) اس طرح بیان کیا ہے۔

اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَھُوَ یَھْدِیْنِ ۝ وَ الَّذِیْ ھُوَ یُطْعِمُنِیْ وَ یَسْقِیْنِ ۝ وَ اِذَا مَرِضْتُ فَھُوَ یَشْفِیْنِ ۝ وَ الَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ ۝ (۲۶/۷۸-۸۱)

اللہ وہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا اور جو زندگی کے صحیح راستے کی طرف میری راہ نمائی کرتا ہے۔

وہ خدا جو مجھے اپنے قانونِ ربوبیت کے مطابق کھانے پینے کو دیتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو اس کے قانونِ طبیعی کے مطابق مجھے شفا ملتی ہے۔ پھر اسی کے قانونِ طبیعی کے مطابق مجھے ایک دن موت آئے گی اور وہی مجھے مرنے کے بعد زندگی عطا کریگا۔

یعنی یہاں ہر واقعہ خدا کے قانون کے مطابق ظہور میں آتا ہے۔

پھر یہی نہیں کہ قرآنِ کریم یہ عقیدہ محض "اشیاء" کے متعلق قائم کرتا ہے اور انسانوں کے متعلق ایسا

انسانی اختیارات

نہیں بتاتا۔ اشیاء کو مؤثر بالذات سمجھنا جہالت ضرور ہے لیکن ایسا خطرناک نہیں جیسا انسانوں کو قادرِ مطلق سمجھ لینا۔ دنیا میں ظلم و استبداد اور جور و ستم کی وجہ یہ ہے کہ زیردست انسانوں کے ذہن میں یہ چیز نقش کر دی گئی ہے کہ بالادست انسان تمام قوتوں کے مالک و مختار ہیں۔ وہ رزق دے سکتے ہیں اور چھین بھی سکتے ہیں۔ مار بھی سکتے ہیں اور زندگی بھی عطا کر سکتے ہیں۔ انہی تصورات کے ماتحت قوت و حشمت کے مالک انسان دوسروں کو اپنی غلامی پر مجبور کرتے ہیں اور یہی ہیں وہ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ (خدا سے ورے دوسرے رب) جن کی "پرستش" ہر زمانہ میں ہوتی آئی ہے۔ قرآنِ کریم اس باب میں بھی توحید سکھاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمام قوتوں کا مالک صرف اللہ کا قانون ہے اس لئے کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسانوں پر اپنا حکم چلائے۔ حضرت یوسفؑ قیدخانہ میں اپنے ساتھیوں سے فرماتے ہیں۔

وعظِ یوسفی

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ .... ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ٥ (۱۲/۳۹–۴۰)

اے میرے قیدخانہ کے ساتھیو! کیا (تم نے اس بات پر غور کیا ہے کہ) بہت سے آقا بہتر ہیں یا صرف ایک اللہ غالب؟ تم اس کے سوا جن کی غلامی اختیار کرتے ہو (ان کی حقیقت اس سے زیادہ کیا ہے کہ) چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے تجویز کر رکھے ہیں۔ اللہ نے تو ان کے متعلق کوئی سند نازل نہیں کی۔ (یاد رکھو حکومت صرف خدا کی ہے اس کا فرمان یہ ہے کہ اس کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کرو۔ یہ ہے سیدھا دین، لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) سمجھتے نہیں۔

اندازہ فرمائیے کہ اگر انسان کے دل میں اس قسم کی توحید کا ایمان قائم ہو جائے تو پھر دنیا میں کوئی قوت بھی ایسی رہ جاتی ہے جس سے انسان خوف کھائے۔ وہ خوف کھائے گا تو صرف قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی سے۔ اس کے سوا وہ کسی سے نہیں ڈرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے مومنین کی صفت یہ بتائی ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ اُن پر کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوتا۔

ایمان سے خوف باقی نہیں رہتا

صمدیت

سورۂ اخلاص جس کی پہلی آیت (قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ) سابقہ عنوان میں درج کی جا چکی ہے۔ اس کی دوسری آیت ہے۔ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ (۱۱۲/۲)۔

"صَمَدٌ" کا لفظ قرآنِ کریم میں ایک ہی مرتبہ آیا ہے لیکن یہ لفظ اپنے اندر ایسی جامعیت رکھتا ہے جس کی تشریح مشکل ہو سکتی ہے۔ عام طور پر اس کا ترجمہ "اللہ بے نیاز ہے" کیا جاتا ہے اور اس سے یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ وہ بڑا بے پرواہ ہے۔ اس "بے پرواہی" سے ذہن فوراً اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ جس طرح ایک مطلق العنان، خود مختار، بادشاہ (ڈکٹیٹر) کسی قاعدے اور قانون کی پرواہ نہیں کرتا اور جو جی میں آتا ہے کر گزرتا ہے، خواہ اس کے نتائج و عواقب کچھ ہی کیوں نہ ہوں، اسی طرح (نعوذ باللہ) خدا بے پرواہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ ذاتِ اقدس احکم الحاکمین اور خود مختار ہے، لیکن اس کی "بے پرواہی" سے یہ مفہوم نہیں؛ صَمَد کے معنی ہیں ایسا بے نیاز جو اپنے کسی معاملہ میں دوسرے کا محتاج نہ ہو، ایسا سردار جس کی طرف مشکلات اور مہمات میں رجوع کیا جائے، ایسی بلند اور مضبوط چٹان کہ جب چاروں طرف سے سیلاب بلا گھیر لے تو انسان کی حفاظت کے لئے وہی ماویٰ و ملجا ہو۔ صمدیت سے مفہوم یہ ہے کہ خدا اپنے کسی معاملہ میں کسی کا محتاج نہیں۔ یہی ایک نشوونما یافتہ ذات (PERSONALITY) کی بنیادی خصوصیت ہوتی ہے۔ وہ اپنی ہستی، بقا اور استحکام کے لئے خارجی سہاروں کی رہینِ منت نہیں ہوتی وہ اپنے زورِ دروں کے آسرے زندہ اور قائم رہتی ہے اور خدا کی ذات چونکہ مکمل ترین ہے اس لئے اس کے بارے میں کسی خارجی سہارے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ برعکس اس کے ہر قائم رہنے والی شئے اپنے قیام کے لئے اس کے سہارے کی محتاج ہے۔ یہ ہے مطلب اَللّٰهُ الصَّمَدُ سے۔

بے نیازی کا صحیح مطلب

سورۃ اخلاص کی تیسری آیت ہے۔

لَمْ یَلِدْ وَ لَمْ یُوْلَدْ ۝ (۱۱۲/۳)

نہ اس کی کوئی اولاد ہے، نہ وہ کسی کی اولاد۔

خدا کی اولاد کا عقیدہ

خدا کی اولاد کا عقیدہ بہت پُرانا ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، چونکہ انسان اپنے ذہن کے پیدا کردہ خدا کو اپنی شکل پر تراشتا تھا...... اس لئے اس کے اندر تمام انسانی خصوصیتیں جمع کر دیتا تھا۔ اولاد، انسان کے نزدیک سب سے بڑی نعمت اور بہت بڑا سہارا ہوتی ہے، اس لئے وہ اپنے "خدا" کو اس سے کیوں محروم رکھتا؟ یوں بھی جب وہ دیکھتا کہ سلسلۂ پیدائش، تولید و تناسل کے ذریعے سے ہی قائم ہے تو یہ چیز اس کے ذہن میں نہیں آسکتی تھی کہ کوئی ہستی، خواہ وہ خدا ہی کیوں نہ ہو، اس سے منزہ ہو سکتی ہے۔ مجوسیوں کے ہاں سب سے قدیم دیوتا (MITHRA) خدائے ہرمزد کا بیٹا سمجھا جاتا ہے۔ یہی عقیدہ بقول (CLEMENT WOOD) اور ڈاکٹر براؤن، روم میں پہنچ کر ابنیتِ مسیحؑ کے عقیدہ کا باعث بنا۔ ہندوؤں کے ہاں اولاد کے علاوہ دیوتاؤں کی بیویاں بھی تصوّر کی جاتی ہیں۔ شیوجی کی

خدا کی بیوی کا عقیدہ

بیوی پاربتی اور ان کا بیٹا گنیش ہے۔ برہما، جو سب سے بڑا خدا ہے، اس کی بیٹی سرسوتی ہے۔ رگوید منڈل نمبر ۱، سوکت نمبر ۲۲، منتر نمبر ۱۲ میں ہے۔

اس کرم (فعل یا یگیہ) میں اندر کی پتنی (بیوی) اور ورن کی پتنی اگنی کو بلاتا ہوں۔ سوم پینے کے لئے اور اپنے کلیان (بہبودی) کے لئے۔ (ترجمہ پروفیسر راجہ رام شاستری)

ہندو مت کی رُو سے تخلیقِ کائنات کی ابتدا

قدیم ہندو مذہب میں مخلوق کی پیدائش کا نظام بھی وہی ہے جو ذہنِ انسانی کے عہدِ طفولیت میں متصوّر ہو سکتا تھا۔ ہم قارئین کے ذوقِ سلیم سے معذرت کے ساتھ اس کی ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ شت پتھ براہمن، نیز برہدارنیک اُپ نشد میں ہے کہ "پرمیشور بوجہ اکیلا ہونے کے مجامعت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے اس نے اپنی بیوی کی خواہش کی اور اتنا بڑا ہو گیا جیسے بوقتِ مجامعت مرد عورت ہوتے ہیں۔ پھر اس ایشور نے اپنے دو ٹکڑے کر ڈالے، آدھے سے بیوی اور آدھے سے مرد بن گیا اور پھر وہ بیوی چھپ گئی اور گائے، گھوڑی، گدھی، بھیڑ وغیرہ بنتی رہی اور پرمیشور، بیل، گھوڑا، گدھا، مینڈھا وغیرہ بنتا رہا۔ اس سے جفت کھا کر گائیں، گھوڑے، گدھے، ایک کھُر والے، بھیڑیں وغیرہ پیدا کیں۔ (دیدارتھ پرکاش مصنفہ سوامی آتمانند، صفحہ ۸۳-۸۴)۔

ان چیزوں کے بیان کرنے کی ضرورت صرف اس امر کی وضاحت کے لئے محسوس کی گئی ہے کہ قرآنِ کریم خدا کا صحیح تصور قائم کرنے کے ساتھ ساتھ کس طرح دنیا کے تمام غلط اور باطل عقائد کی تردید کرتا جاتا ہے۔ لَمْ یَلِدْ (اس نے کسی کو بذریعہ تولید پیدا نہیں کیا) اس سے نہ صرف ابنیتِ مسیحؑ و عزیرؑ وغیرہ کی تردید ہوتی ہے بلکہ ہر اس عقیدہ کی تردید جس کی رُو سے پیدائش مخلوق کی ابتدار، خدا سے بہ سلسلۂ توالد و تناسل مانی جاتی ہے۔ قرآنِ کریم کے تمام گوشے واضح طور پر سامنے نہیں آسکتے جب تک مختلف ادیانِ عالم کے مختلف عقائد نگاہوں کے سامنے نہ ہوں۔ قرآنِ کریم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ تمام غلط عقائد کی تردید کرنے کے بعد، صحیح عقیدہ ذہن میں راسخ کرتا ہے۔ ان غلط عقائد کو سامنے لانے کے لئے ہمیں بعض اوقات ایسی چیزیں بھی نقل کرنی پڑ جاتی ہیں، جو ذوقِ سلیم پر گراں گزریں۔ لیکن کیا کیا جائے بعض اوقات

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

تولید اور تخلیق، ویسے تو دونوں کے معنی پیدا کر لینے کے ہیں، لیکن (جہاں تک ذات کے تصور کا تعلق ہے) ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ تولید (یعنی پیدائش بذریعہ توالد و تناسل) میں پیدا کرنے والے کا ایک جزو (حصہ) منتقل ہو کر پیدا ہونے والے کا حصہ بنتا ہے۔ یہ چیز ذات (PERSONALITY) کے تصور کے خلاف ہے۔ ذات، ایک غیر منقسم وحدت ہوتی ہے، جس کا کوئی حصہ اس سے الگ نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی ایک ذات کا کوئی حصہ، کسی دوسری ذات کی تخلیق کا موجب بن سکتا ہے۔ اس لئے ذات کے سلسلہ میں تولید کا تصور ہی غلط ہے۔ اس کے برعکس تخلیق میں خالق (پیدا کرنے والے) کا کوئی جزو اس سے الگ نہیں ہوتا نہ ہی وہ جزو، مخلوق (پیدا ہونے والے) کا حصہ بنتا ہے۔ اس لئے ذات کی طرف سے عملِ تخلیق (CREATION) ہو گا، عملِ تولید (PROCREATION) نہیں۔ تولید، حیوانی سطح کی زندگی کا خاصہ ہے۔ تخلیق، ذات کا خاصہ ——— بنیادی حیثیت سے ذاتِ خداوندی کا اور تبعاً انسانی ذات کا۔

لہٰذا جن مذاہب نے عملِ تولید کو خدا کی طرف منسوب کیا ہے، وہ ذات کے اس بنیادی تصور سے بھی نا آشنا ہیں۔ آپ دیکھئے کہ قرآنِ کریم میں کن کن متنوع گوشوں سے ان توہمات کی تردید کی گئی ہے فرمایا۔

وَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۞ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۞ (۱۱۶-۱۱۷/۲)

لوگ کہتے ہیں کہ خدا اولاد رکھتا ہے۔ سبحان اللہ! (کیا لغویات ہے) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کی ملک ہے اور اس کے احکام کے سامنے سرنگوں۔ وہ آسمان اور زمین جملہ کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔ وہ جب کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو نہ اسے کسی مددگار کی ضرورت ہوتی ہے نہ وسائل و ذرائع کی، بس وہ حکم دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔

ہر شے کا خالق

یعنی وہ سلسلۂ کائنات کو اس طرح عدم سے وجود میں لایا ہے کہ جس شے کے متعلق اس نے ارادہ کیا، وہ وجود میں آ گئی۔ کس قدر پاکیزہ اور منزہ ہے یہ عقیدہ اور کس قدر قوتوں کا مالک ہے وہ خدائے حقیقی!

الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ۞
(۲۵/۲)

اللہ وہ ہے جسے آسمانوں اور زمین کی حکومت حاصل ہے اور اس نے کسی کو اپنی اولاد قرار نہیں دیا اور نہ اس کی حکومت میں کوئی اس کا شریک ہے اور اس نے ہر شے کو پیدا کیا اور پھر ہر ایک کا الگ الگ اندازہ مقرر کیا۔

سورۂ مریم میں ہے۔

مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۞ (۱۹/۳۵) (نیز ۴/۱۷۱)۔

اللہ کے شایانِ شان ہی نہیں کہ وہ (کسی کو) اپنی اولاد قرار دے۔ وہ اس سے بہت بلند ہے۔ جب وہ کسی کام کے کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس حکم کرتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے!

(نیز دیکھئے (۱۰/۶۸-۶۹)؛ (۲۳/۹۱)۔

خدا کی اولاد کا عقیدہ ایسا غلط اور بے بنیاد ہے جس کے لئے کوئی دلیل ہی نہیں لا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ

آج، اُن مذاہب کے پیرو جن کے ہاں یہ عقیدہ موجود ہے، اس کی عجیب عجیب تاویلیں کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ چیزیں محض استعارہ کے طور پر ہیں، اس سے مراد حقیقی اولاد نہیں۔ ان اہلِ مذاہب

عیسائیوں کا اعترافِ حقیقت

کا یہ اعتراف بجائے خویش قرآن کی صداقت کا ثبوت ہے۔ کچھ عرصہ ہوا، لارڈ بشپ آف کنٹربری نے ایک کمیشن متعین کیا تھا کہ وہ تحقیق کرے کہ موجودہ اناجیل کس حد تک قابلِ اعتبار ہیں اور ان کی تعلیم کس حد تک آسمانی کہلائی جا سکتی ہے۔ اس کمیشن کی رپورٹ میں، منجملہ دیگر امور، یہ بھی لکھا ہے کہ اناجیل میں ابنیتِ مسیحؑ سے متعلق جو کچھ بھی پایا جاتا ہے، وہ افسانے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ یہ خدا کی ذات پر ناقابلِ برداشت بہتان ہے۔

دیوتاؤں کی بیویاں

ہندوؤں کے ہاں خدا کی بیوی کے عقیدہ کے متعلق ذکر آ چکا ہے۔ قدیم بابل کے مذہب میں زراعت کی دیوی اشتر کی شادی کھجور کی روح (TUMMUZ) سے قرار دی جاتی تھی۔ مصر کے مذہب میں نخلستان کی دیوی (ISIS) کی شادی نیل کے خدا (OSIRIS) کے ساتھ مانی جاتی تھی۔ یونان کے اصنامیات اور روم کے مذہبی افسانوں میں خدا کی بیوی کا تصور موجود ہے۔ یونانی دیوتا (CHRONOS) کی بیوی (OPS) اور (ZEUS) کی بیوی (HERA)، لاطینی دیوتا (SATURN) کی بیوی (RHEA) اور (JUPITER) کی بیوی (JUNO) ہے۔ خدا کی اولاد اور رشتہ داروں کے عقیدہ کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ قبائلی زندگی کی باہمی لڑائیوں میں ایک خاندان کے افراد ایک دوسرے کے ممد و معاون ہوا کرتے تھے۔ (اسی اعتبار سے ہندو مذہب اور اصنامیاتِ یونان کے افسانوں میں باہمی لڑائیوں کا ذکر ہے)۔ اس لئے انہوں نے سمجھا ہوگا کہ ان خداؤں کے عزیز و اقارب بھی ہونے چاہئیں جو ان کے حمایتی بن سکیں۔ لیکن خدائے حقیقی کو کسی مدد کی ضرورت نہیں۔

وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ۝ (۱۷/۱۱۱)۔

کہہ دیجئے کہ تمام حمد اللہ کے لئے ہے جو نہ اولاد رکھتا ہے، نہ اس کی حکومت میں کوئی اس کا شریک ہے اور نہ کوئی ایسا ہے کہ اس کی درماندگی کی وجہ سے اس کا مددگار ہو۔ (وہ تمام قوتوں

کا مالک، ان تمام باتوں سے بے نیاز ہے) سو اس کے قانون کو اتنا بلند کرو جتنا ہونے کا اس کا حق ہے۔

خدا کی اولاد کے عقیدہ کی اصلیت اتنی ہی ہے کہ ابتدائی انسان کے ذہن نے خدا کو اپنی شکل پر تراشا اور اس کے بعد یہ عقیدہ نسلاً بعد نسلٍ اندھی تقلید سے متوارث چلا آیا۔ علم و بصیرت پر کسی نے پرکھا ہی نہیں۔

وَ یُنْذِرَ الَّذِیْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا ۙ مَا لَھُمْ بِہٖ مِنْ عِلْمٍ وَّ لَا لِاٰبَآئِھِمْ ؕ کَبُرَتْ کَلِمَۃً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاھِھِمْ ؕ اِنْ یَّقُوْلُوْنَ اِلَّا کَذِبًا ۝ (۱۸/۵-۴)۔

(یہ قرآن اس لئے نازل ہوا ہے کہ) تو ان لوگوں کو جو کہتے ہیں کہ اللہ اولاد رکھتا ہے، ان کے اس عقیدہ کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر دے۔ اس بارے میں ان کے پاس کوئی علم نہیں، نہ ان ان کے باپ دادوں کے پاس تھا۔ کیسی تباہ کن بات ہے جو ان کی زبان سے نکلتی ہے؟ یہ لوگ بالکل جھوٹ کہتے ہیں!

علم آجانے کے بعد تو ان عقائد کے مدعی خود ان عقائد سے جھینپتے ہیں اور انہیں تمثیلات و استعارات کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔

خدا کی بیٹیوں کا عقیدہ

خدا کے لئے صرف بیٹے ہی نہیں بلکہ بیٹیاں بھی تجویز ہوتی تھیں اور یہ عقیدہ ان لوگوں کے ہاں موجود تھا جن کے اپنے گھر اگر لڑکی پیدا ہو جاتی تو صفِ ماتم بچھ جاتی تھی۔ ہندوؤں کی معاشرت میں لڑکی جس "قدر و منزلت" کی مستحق ہے، وہ ظاہر ہے! لیکن برہما کے ہاں بیٹی تسلیم کی جاتی ہے۔ عرب میں بھی یہ عقیدہ موجود تھا کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں اور اپنی یہ حالت تھی کہ بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ فرمایا۔

وَ یَجْعَلُوْنَ لِلّٰہِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَہٗ ۙ وَ لَھُمْ مَّا یَشْتَھُوْنَ ۝ وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُھُمْ بِالْاُنْثٰی ظَلَّ وَجْھُہٗ مُسْوَدًّا وَّ ھُوَ کَظِیْمٌ ۝ (۱۶/۵۸-۵۷)

اور یہ لوگ اللہ کے لئے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں۔ وہ اس سے بلند ہے اور خود اپنے لئے وہ جس کے بڑے خواہشمند ہیں (یعنی بیٹے) اور جب ان میں کسی کو بیٹی پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے، تو مارے رنج کے اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے اور دل اس کا غم سے بھر جاتا ہے۔

عربوں میں فرشتوں کے متعلق ایسا ہی عقیدہ تھا جیسا ہندوؤں کے ہاں دیوی دیوتاؤں کے متعلق ہے، یعنی یہ کہ وہ محکمہ قضا و قدر کے اربابِ بست و کشاد ہیں اور سلسلۂ کائنات کے مختلف شعبوں کے مالک۔ اس اعتبار سے ان میں اور خدا میں رشتہ داریاں قائم کی جاتی تھیں۔ انھیں دیویاں بنایا جاتا تھا، خدا کی بیٹیاں قرار دیا جاتا تھا۔

وَ جَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ؕ...... ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝ (۴۳/۱۵—۱۷) نیز (۲۱/۲۷—۲۶)؛ (۴۳/۱۹)؛ (۱۶/۵۷)۔

اور ان لوگوں نے خدا کی محکوم مخلوق کو اس کا جزو قرار دے دیا ہے۔ انسان یقیناً کھلی ہوئی ناقدرشناسی میں ہے۔ کیا خدا نے اپنی مخلوق میں سے بیٹیاں پسند کیں اور تمہیں بیٹوں کے ساتھ مخصوص کیا؟ (یعنی وہ بیٹیاں کہ) جب ان میں سے کسی کو اس کے پیدا ہونے کی خبر ملتی ہے تو اس کا منہ غم سے کالا پڑ جاتا ہے اور وہ دل میں کڑھتا رہتا ہے۔

خدا سے جنّوں کی رشتہ داری کا غلط عقیدہ

انسان کے عہدِ جہالت میں جنّوں کا عقیدہ بھی عام تھا، یعنی غیر مرئی (نظر نہ آنے والی) قوّتیں جن کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ وہ انسانی معاملات میں دخیلِ کار اور اثر انداز ہوتی ہیں، اور ملکوں کی طرح عربوں میں بھی یہ عقیدہ عام تھا۔ (عربی زبان میں جن کے معنی ہی نظروں سے اوجھل کے ہیں۔ قرآن کی رُو سے جنات کی حقیقت کیا ہے، اس کے متعلق تفصیلی گفتگو "ابلیس و آدم" میں ملے گی)۔ بہرحال، عربوں کے ہاں عقیدہ تھا کہ جنات بھی خدا سے رشتہ داریاں رکھتے ہیں۔

وَ جَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَ بَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ؕ وَ لَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ۙ (۳۷/۱۵۸)۔

اور یہ لوگ خدا اور جنوں (کائنات کی غیر مرئی قوتوں) کے درمیان رشتے قائم کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ قوتیں خوب جانتی ہیں کہ وہ بارگاہِ خداوندی میں تعمیلِ ارشاد کے لئے حاضر رہتی ہیں۔

سورۂ اخلاص کی آخری آیت ہے۔

وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (۱۱۲/۴)۔

اس کی مثل اور نظیر کوئی نہیں

کُفُوًا کا لفظ بھی قرآن میں ایک ہی جگہ آیا ہے۔ اس کے معنی مثل، برابر، مساوی، مقابل کے ہیں مطلب اس کا واضح ہے، یعنی وہ ذاتِ بے ہمتا و بے چوں، اپنی ذات اور اپنی صفات میں لاشریک ہے۔ کوئی اس کے برابر نہیں، مثل نہیں، مقابل نہیں۔ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ۔ لہٰذا اوتار اور الوہیت کے عقیدہ کی کہیں گنجائش نہیں۔

یہ ہے وہ عقیدۂ توحید جو قرآنِ کریم، اللہ تعالیٰ کے متعلق پیش کرتا ہے اور "سمجھ میں نہ آنے والے" خدا کے متعلق وہ کچھ سمجھاتا ہے جس سے اس ذاتِ مطلق کا صحیح ایمان قلبِ انسانی پر مرتسم ہو جائے۔ واضح رہے کہ قرآنِ کریم میں اللہ کا لفظ تقریباً سات سو مرتبہ آیا ہے۔ ان تمام آیات کا درج کرنا مشکل ہے۔ اس لئے اس عنوان کے ماتحت اجمالاً لکھا گیا ہے۔ صفاتِ باری تعالیٰ کے متعلق تفصیلی ذکر دیگر عنوانات کے تحت آ جائے گا۔

ایک ضروری نکتہ کی وضاحت

آگے بڑھنے سے پیشتر ایک نکتہ کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم چونکہ اللہ کا کلام ہے اس لئے اس میں اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان ہوئی ہیں وہ حقیقت پر مبنی ہیں، ذہنِ انسانی کی قیاس آرائیاں نہیں۔ یعنی ان صفات کا یہ مطلب نہیں کہ انسان نے اپنے ذوقِ عبودیت کی تسکین کے لئے اپنے نہاں خانۂ دماغ میں کسی معبود کا تصور قائم کیا اور پھر اس معبودِ قیاسی کو اپنے تصورات کی دنیا کے مطابق مختلف اوصاف سے متصف اور متنوع اسماء سے موسوم کر لیا۔ جس طرح (بلا تمثیل) اس امر کا اقرار کہ سورج ایک عظیم الشان کرہ ہے جو صبح کو طلوع ہو کر روشنی اور حرارت دیتا ہے، محض ایک قیاسی "عقیدہ" نہیں بلکہ ایک حقیقتِ ثابتہ کا اعتراف ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات اور قرآنِ کریم کے مطابق اس کی صفات پر ایمان بھی ایک قیاسی عقیدہ نہیں، بلکہ حقیقت کا اقرار ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس حقیقت کے اقرار سے انسان کو فائدہ کیا ہے؟ اس کا اعتراف ضروری کیوں ہے؟ پہلی چیز تو یہ کہ حقیقت کا اعتراف بجائے خویش شرفِ انسانیت کی دلیل ہے۔ آپ کہئے کہ سورج روشنی اور حرارت نہیں دیتا، اندھیرا اور ٹھنڈک بخشتا ہے، آپ کی بصیرت کی ہنسی اُڑے گی۔ آپ کے صحیح العقل ہونے میں شبہ ہونے لگے گا۔ لیکن صفاتِ باری تعالیٰ پر ایمان صرف

اعترافِ حقیقت کے طور پر ہی ضروری نہیں، بلکہ یہ بہت بلند اور اہم مقاصد کا حامل ہے۔ ان مقاصد کے متعلق ہم پہلے باب (من و یزداں) میں بھی بحث کر چکے ہیں، لیکن چونکہ یہ نکتہ بڑا اہم ہے اور اس کے ساتھ ہی دنیائے فکر و عقائد میں عام شاہراہ سے ہٹا ہوا، اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا بار بار سامنے لانا فائدہ سے خالی نہیں ہوگا۔ ہمیں اس کا احساس ہے کہ تکرار تصنیف کا عیب ہوتا ہے لیکن کسی اہم حقیقت کی تشریح و تبئین کے لئے اگر کسی خاص نکتہ کو ایک سے زیادہ بار بھی سامنے لایا جائے تو اسے لایعنی تکرار نہیں سمجھا جا سکتا۔ زیرِ نظر تصنیف میں بعض مقامات پر تکرار کو اسی ضرورت کے ماتحت روا رکھا گیا ہے۔ (خود قرآنِ کریم بھی تبیانِ حقیقت کے لئے مختلف گوشوں کو بار بار سامنے لاتا ہے)۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان کا وہ اہم مقصد جس کی طرف اُوپر اشارہ کیا گیا ہے یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے انسان کا نصب العینِ حیات اس زمین پر خدا کی بادشاہت کا قیام ہے۔ انسان کو تمام مخلوق سے اشرف اور جملہ اشیائے فطرت کا مخدوم پیدا کیا گیا ہے۔ اس کا فریضۂ زندگی یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے کو اپنے تابع فرمان بنائے اور خود اللہ تعالیٰ کے قوانین کے تابع رہے اور اس طرح اپنی ذات میں استحکام پیدا کر کے قوانینِ الٰہیّہ کو ساری دنیا پر نافذ کر دے۔ وہ جماعت جو اس فریضۂ انسانیت کی تکمیل کرتی ہے جماعتِ مومنین کہلاتی ہے یعنی وہ جماعت جو ذات و صفاتِ خداوندی پر قرآنی تعلیم کے مطابق ایمان رکھتی ہے۔ چونکہ یہ ایک عظیم القدر فریضہ ہے جسے یہ جماعت ادا کرتی ہے، اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس جماعت کے افراد میں بشریّت کی حدود کے اندر اپنی امکانی وسعتوں کے ساتھ، صفاتِ خداوندی کا پرتو جھلک رہا ہو۔ اس کے آئینۂ قلب میں اس کے نور کا عکس مرتسم ہو۔ اس بے مثل و بے ہمتا، اس "برتر از قیاس و خیال و گمان و وہم" خدائے عرش کی صفاتِ جلیلہ کا خاکہ اس قُدسی نفس جماعت کے محسوس پیکروں میں فرشِ زمین پر منقوش نظر آتا ہو۔ اس جماعت کے پیرہنِ قلوب واذہان، اُس صنّاعِ نادرہ کار کے حسین و جمیل رنگ میں رنگے ہوئے ہوں۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (۲/۱۳۸)۔

رنگِ اُو بر کن مثالِ اُو شوی!

در جہاں عکسِ جمالِ اُو شوی! (اقبالؒ)

لہٰذا صفاتِ باری تعالیٰ پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ ایک مردِ مومن حدودِ بشریّت کی وسعتوں کے مطابق، اتباعِ قرآنی سے اپنے اندر اسی قسم کی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرے اور یوں "قُربِ خداوندی" حاصل کر کے

انسانیت کے سلسلۂ ارتقار کے مدارج طے کرتا ہوا آگے بڑھتا جائے۔ اس قسم کے مومنین کی جماعت اس دنیا میں حکومتِ الٰہیّہ کے قیام و بقا کی کفیل ہے۔ ان کا خُدا ربُّ العٰلمین ہے۔ یہ بھی اپنے اندر ربوبیّت کی شان پیدا کرکے دوسروں کی پرورش کا انتظام کریں۔ وہ رزّاق ہے ان میں بھی شانِ رزّاقیت ہونی چاہیئے۔ وہ رحیم وکریم ہے، ان کے ابرِ جُود وسخا کی گُہر ریزیاں بھی عام ہونی چاہئیں۔ وہ جبّار وقہّار ہے انہیں بھی اتنی قوّت ہونی چاہیئے جس سے یہ ہر سرکش ومتمرّد ومستبد انسان کی فرعونیّت کا علاج کرکے اصلاحِ عالم کرسکیں۔ وقس علیٰ ذالکؕ۔ یہ ہے حقیقی منشار صفاتِ خداوندی پر ایمان ویقین کا۔ ورنہ خدا تو خدا ہے خواہ کوئی اسے مانے یا نہ مانے۔ اگر ساری دنیا اپنی آنکھیں بند کرلے تو بھی سورج، روشنی اور حرارت کا ویسے ہی بخشندہ رہے گا جیسے آج ہے۔ خدا، اس وقت بھی خدا تھا جب کچھ موجود نہ تھا، اس وقت بھی خدا رہے گا جب کچھ باقی نہ رہے گا۔

عقیدۂ توحید کا نتیجہ

اب دیکھئے کہ سورۂ اخلاص کی مختصر سی آیاتِ مقدسہ میں جن چار صفاتِ خداوندی کو بیان کیا گیا ہے ان کے پرتو کا انسانی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ ان صفات پر ایمان لانے کا عملی نتیجہ کیا ہوتا ہے؟

ایک خدا پر ایمان لانے سے انسان دنیا بھر کے باطل "خداؤں" کی غلامی سے آزاد ہوجاتا ہے۔ ایک کا محکوم ہونے سے یہ ساری کائنات کا حاکم بن جاتا ہے۔ یہ اس کے دروازہ پر جُھکتا ہے تو دنیا اس کے قدموں پر جُھکتی ہے۔ یہ اُس کا ہوجاتا ہے تو سارا عالم اس کا ہوجاتا ہے۔

اور جب یہ جماعت اس حقیقت پر ایمان رکھتی ہے کہ ان کا خدا ایک ہے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یہ جماعت بھی ایک ہو۔ خدائے واحد کو ماننے والی جماعت ملّتِ واحدہ ہونی چاہیئے اگر دو خداؤں کا ماننا شرک ہے تو اس جماعت کا دو ٹکڑوں میں بٹ جانا بھی شرک ہے (چہ جائیکہ اس کے سینکڑوں فرقے بن جائیں) اسی لئے فرمایا کہ:

وَ لَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۙ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَ كَانُوا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۝ (۳۰/۳۱-۳۲)

(دیکھنا! کہیں دعوائے ایمان کے باوجود) تم مشرکین میں سے نہ ہوجانا، یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہوجانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ انگیزی کی (دین میں فرقے پیدا کردیئے) اور خود بھی ایک

فرقہ بن کر بیٹھ گئے (پھر ان سب کی حالت یہ ہو گئی کہ) ہر فرقہ اپنے اپنے مسلک (کی حقانیت) پر مگن ہو گیا۔

ملّتِ اسلامیہ کا فرقوں اور گروہوں کے اندر تقسیم ہو جانا عملی شرک ہے۔ اس لئے کہ خدائے واحد پر ایمان رکھنے والی قوم کا ملّتِ واحد بن کر رہنا ان کے عقیدۂ توحید کا عملی ثبوت ہے۔

چیست ملّت! ایکہ گوئی لا الٰہ — با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ

یک شو و توحید را مشہود کن! — غائبش را از عمل موجود کُن!

ملّت کی وحدت کی بنیاد اس حقیقتِ کبریٰ پر ہے کہ تمام افرادِ ملّت ایک ہی قانون کی اطاعت کریں۔ ان کا نصب العین زندگی ایک ہو۔ خدائے واحد پر ایمان کا عملی مفہوم اس کے قانون کی اطاعت ہے۔ لہٰذا، توحیدِ خداوندی سے مراد، اس کے قانون کی وحدت ہے اور قانون کی وحدت کا عملی نتیجہ، ملّت کی وحدت ہے۔ اس وحدت کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا تو وحدتِ انسانیت بروئے کار آجائے گی۔ لہٰذا، توحیدِ خداوندی کا آخری نتیجہ وحدتِ انسانیت ہے جس کا عملی ذریعہ اس نظام کا قیام ہے جس میں قانونِ خداوندی کی اطاعت ہو۔ اس کے سوا کسی کے احکام و قوانین کی اطاعت نہ ہو۔ اس نظام کو اسلامی حکومت کہا جاتا ہے۔

صفتِ صمدیّت کا اثر

پھر جب ایک عبدِ مومن اس کا اعلان کرتا ہے کہ اس کا خدا صمد ہے، تو اس کے ساتھ ہی وہ اپنے اندر بھی صفتِ صمدیّت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ صمدیّت کے معنی یہ ہیں کہ خدائے واحد اپنے ارادوں کی تکمیل کے لئے کسی دوسرے کی مدد کا محتاج نہیں، بلکہ جملہ کائنات اپنی مشکلات و مصائب میں اس کی مدد کی محتاج ہے۔ خدائے صمد پر ایمان رکھنے والی قوم کی بھی یہی حالت ہونی چاہیئے کہ وہ اپنی تدابیر کی تکمیل کے لئے غیر کی دست نگر نہ ہو، بلکہ ایسی بے پناہ قوتوں کی حامل ہو کہ ساری دنیا اپنی مشکلات میں اس کی طرف رجوع کرے۔ زبان سے اَللّٰہُ الصَّمَدُ کی تکرار اور اور عملاً یہ حالت کہ اپنی ہر ضرورت کے لئے غیروں کے محتاج، یہ اُمّتِ مسلمہ کا شیوہ نہیں ہو سکتا اور آج ہماری احتیاج کی تو یہ حالت ہو چکی ہے کہ ہم نہ صرف مادّی ضروریات ہی میں غیروں کے محتاج ہیں، بلکہ افکار و تصوّرات بھی دوسروں کے مستعار لے رکھے ہیں۔ نہ ہمارا کوئی نظریہ اپنا ہے نہ اصول، نہ دل اپنا ہے نہ دماغ کُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِیْنَ کی لعنت اس درجہ (APISH MENTALITY) کی شکل میں ہم پر مسلّط ہو چکی ہے کہ ہم

غیروں کے اندازِ زندگی کی نقل اُتارنا باعثِ صد افتخار سمجھتے ہیں۔ وہ قوم جس کے سپرد دُنیا کی امامت کا فریضہ کیا گیا تھا آج ساری دنیا کے پیچھے ہے۔ کیا اللہ الصّمد پر ایمان رکھنے والی قوم کا یہی اسلوبِ حیات ہونا چاہیئے تھا؟

زندگانی مثلِ انجم تا کجا　　ہستیٔ خود در سحر گم تا کجا
آفتاب استی یکے در خود نگر　　از نجوم دیگراں تابے مخر
تا کجا طوفِ چراغ محفلے　　ز آتشِ خود سوز اگر داری دلے
از پیامِ مصطفےٰ آگاہ شو　　فارغ از اربابِ دون اللہ شو　　(اقبالؒ)

لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ پر ایمان

پھر جس قوم کا ایمان یہ ہو کہ اس کا خدا کسی سے نسل اور خون کی نسبت نہیں رکھتا وہ ربّ العالمین ہے اور اس سے نسبت صرف عبودیت اور تقویٰ کی بنا پر قائم کی جا سکتی ہے، تو کیا یہ ہو سکتا ہے کہ وہ قوم انسانیت کی تقسیم کا معیار، رنگ اور خون، نسل اور قبیلہ قرار دیدے۔ نسب اور نسل کی بنا پر قوموں اور ذاتوں میں بٹ جانا، شعوب و قبائل میں تقسیم ہو جانا عہدِ جاہلیت کے طفلانہ تصورات ہیں جنہیں مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ اسلام ایسی جنّت پیدا کرنے کے لئے آیا تھا کہ جونہی کسی نے کہا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ۔ دَخَلَهَا۔ وہ اس جنت میں داخل ہو گیا جیسے قطرہ سمندر میں مل جاتا ہے کہ دنیا بھر کی قوتیں جمع ہو کر کوشش کریں تو بھی اس قطرہ کو سمندر سے متمیّز نہ کر سکیں۔ اسلام نے رنگ، نسل، زبان اور جغرافیائی حدود (وطن) کی خود ساختہ دیواروں کو ایک ایک کر کے گرا دیا اور یوں وحدتِ انسانیت کا آسمانی پیغام دنیا کے سامنے رکھ دیا۔ اس کے نزدیک انسانیت کی تقسیم کا ایک اور صرف ایک معیار ہے یعنی ایمان اور کفر۔ روئے زمین کے تمام ایمان لانے والے ایک ملّتِ واحدہ اور اس حقیقت سے انکار کرنے والے ایک دوسری قوم۔

گر نسب را جزوِ ملّت کردۂ　　رخنہ در کارِ اخوّت کردۂ
در زمینِ ما نگیرد ریشہ ات　　ہست نا مسلم ہنوز اندیشہ ات
ہر کہ پا در بندِ اقلیم و جد است　　بے خبر از لم یلد لم یولد است

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ

اور جب ایک عبدِ مومن اس امر کا اقرار کرتا ہے کہ اس کے خدا کا کوئی شریک و سہیم نہیں، تو معناً اُس حقیقت کا بھی اعلان کرتا ہے کہ

بندہ اش ہم در نسازد با شریک

خدائے لاشریک کی حکومت قائم کرنے والی قوم بھی عالمِ انسانیت میں لاشریک ہونی چاہیئے۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے

مومنین کی جماعت کو اَعۡلَوۡنَ (۳/۱۳۸)۔ "سب سے بلند کہا ہے۔"

مومنے بالائے ہر بالا ترے　　غیرتِ اُو برنتابد ہمسرے

سورۂ اخلاص کی ان چار چھوٹی چھوٹی آیات پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ خدا کی صفات کے اقرار کے ساتھ ساتھ ان کے اندر جماعتِ مومنین کی عملی زندگی کے لئے کس قدر عظیم الشان اصول مضمر ہیں۔

(۱) ملّتِ واحدۂ اسلامیہ، جس میں کسی قسم کے تحزّب و تشیّع اور کسی نہج کی فرقہ پرستی اور گروہ بندی کا کوئی دخل نہ ہو۔ ایک مرکز اور اس مرکز کا محیط ایک جماعت، ایک شمع اور اس کے گرد جاں نثار پروانوں کا ہجوم۔

(۲)۔ ایسی قوم جو اپنے ارادوں کی تکمیل اور اپنی تدابیر کی پختگی کے لئے کسی دوسرے کی محتاج نہ ہو، بلکہ ساری دنیا اُن کی مدد اور یاوری کی محتاج ہو۔

(۳) پھر اس ملّت میں نسل اور خون کا امتیاز، امتیازِ باطل ہو۔ انسانیّت کی تقسیم کا معیار ایمان و تقویٰ ہو اور بس۔

(۴) دنیا کی کوئی قوم اس ملّتِ واحدہ کی برابری نہ کر سکے۔ یہ سب سے بلند ہو، سب سے آگے ہو۔

ان حقائق کی روشنی میں ایک مرتبہ سورۂ اخلاص کی تلاوت سے عملاً یہ کیفیت پیدا ہو جانی چاہیئے۔ لیکن ذرا سوچئے کہ آج ہماری کیا حالت ہے؟ سورۂ اخلاص کی یہ آیاتِ مقدّسہ آج بھی انہی الفاظ میں پڑھی جاتی ہیں جن میں صدرِ اولیٰ کے مسلمانوں نے انھیں پڑھا تھا، لیکن کیا ان کا نتیجہ آج بھی وہی نکل رہا ہے جو اُس عہدِ سعادت مہد میں مرتب ہوا تھا؟ غور کیجئے کہ بالآخر یہ تفاوت کیوں ہے؟ یہ اس لئے کہ آج ہمارے سامنے صرف قرآن کے الفاظ باقی رہ گئے ہیں۔ ان کی روح ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ہے۔

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی　　شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی

اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ　　در بغل داری کتابِ زندۂ

تا کجا در خاک می گیری وطن

رخت بردار و سرِ گردوں فگن!

۴

خلق و امر

امر

ذات (PERSONALITY) کی ایک بنیادی صفت تخلیق (CREATION) ہے یعنی ہر نشوونما یافتہ ذات کا خاصہ ہے کہ وہ تخلیق کرے۔ (تخلیق اور تولید میں جو فرق ہے اسے سابقہ عنوان میں بتایا جا چکا ہے) لیکن غور کیجئے کہ تخلیق کے مراحل کیا ہیں؟ ایک انجینئر مکان بنانا چاہتا ہے۔ اس کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ وہ اپنے دل میں مکان بنانے کا ارادہ کرتا ہے۔ پھر اس مکان کا نقشہ اپنے ذہن میں تیار کرتا ہے۔ پھر اس نقشہ کو کاغذ پر کھینچتا ہے۔ پھر اس نقشے کے مطابق مکان تعمیر کرتا ہے۔ لوگوں کے سامنے مکان اُس وقت آتا ہے جب وہ اینٹ یا پتھر کی عمارت کی شکل اختیار کر لیتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس محسوس (CONCRETE) شکل میں آنے سے پہلے، مکان کا نقشہ اس انجینئر کے ذہن میں تھا اور نقشے کے ذہن میں آنے سے بھی پہلے اس کا ارادہ اس کے دل میں۔ لہٰذا مکان کی تعمیر کے سلسلہ میں ایک مرحلہ وہ تھا جب وہ مکان انجینئر کے ارادہ اور علم میں تھا اور دوسرا مرحلہ وہ جب وہ محسوس اور مرئی پیکر میں نگاہوں کے سامنے آگیا۔ اگرچہ یہ دونوں مراحل مکان کی تعمیر کی مسلسل کڑیاں ہیں لیکن ظاہر ہے کہ کیفیت اور نوعیت کے اعتبار سے ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ مغربی مفکر پرنگل پیٹی سن (PRINGLE PATTISON) گلہ سنج ہے کہ انگریزی زبان میں ان دونوں مراحل کے لئے ایک ہی لفظ (CREATION) ہے، لیکن عربی زبان میں ان ہر دو مراحل کے لئے الگ الگ الفاظ ہیں[1]۔ قرآنِ کریم نے ان دونوں مراحل کے اظہار کے لئے ان جداگانہ الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ پہلا مرحلہ (جب

تخلیق کے دو مراحل

---

[1] بحوالہ خطباتِ اقبال، صفحہ ۹۷ (آکسفورڈ ایڈیشن)

وہ بننے والی شے علم و ارادہ کے مدارج میں ہوتی ہے یا یوں کہیئے کہ جب وہ ہنوز محسوس اور مرئی پیکر میں نگاہوں کے سامنے نہیں آتی) عالمِ امر کہلاتا ہے اور دوسرا مرحلہ (جب وہ شے محسوس شکل میں سامنے آجاتی ہے) عالمِ خلق۔ قرآن نے اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ (۷/۵۴)۔ کہہ کر ان دونوں مراحل کو خدا کی طرف منسوب کیا ہے، یعنی ہر شے اپنے ابتدائی مرحلہ سے آخری اسٹیج تک اس کے قانون کے مطابق وجود کوش اور پیکر آشنا ہوتی ہے۔

لُغوی معنی

اَلْاَمَرَۃُ ان چھوٹے چھوٹے پتھروں کو کہتے ہیں جو میدانوں یا صحراؤں میں لگا دیئے جاتے ہیں تاکہ ان سے علاقہ کے حدود یا راستہ کے نشانات کا پتہ لگ سکے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اَمْرٌ میں علامت، نشان یا سمت (DIRECTION) کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ اسے، بالفاظِ دیگر یوں کہیئے کہ ہر شے "بن جانے" (BEING) سے پہلے "بن جانے" کی طرف آرہی ہوتی ہے۔ (انگریزی میں اسے کہیں گے (IN THE PROCESS OF BECOMING) - یعنی وہ شئے جو ہنوز وجود (BEING) میں تو نہیں آئی، لیکن اُس سمت کی طرف چلی جارہی ہوتی ہے جس میں آگے چل کر اس نے ایک خاص شکل اور وجود اختیار کر لینا ہوتا ہے۔ اس مرحلہ کو (جب وہ بننے کی سمت جارہی ہوتی ہے) عالمِ امر کہتے ہیں۔ اس میں خدا کے علم و ارادہ سے لے کر، وہ منازل تک شامل ہوتے ہیں جب وہ ابھی (FORM LESS) حالت میں ہوتی ہے۔ یہ امر کے ایک معنی ہیں۔

ایک انجینئر کسی مشین کا تصور کرتا ہے۔ اس تصور کے یہ معنی ہیں کہ وہ ذہن میں ایک نقشہ بناتا ہے کہ اگر اس مشین کے پُرزے اس قسم کے ہوں گے، ان میں اس قسم کی ترتیب رکھ دی جائے، پھر اسے اس قسم کی طاقت سے متحرک کر دیا جائے تو وہ مشین چلنے لگ جائے گی اور اس سے اس قسم کے نتائج مرتب ہونے لگ جائیں گے۔

اَمر اور قانون

ظاہر ہے کہ اس عملِ تخلیق میں ایک چیز تو وہ مشین ہے جو محسوس شکل میں ہمارے سامنے ہے اور دوسرے وہ تدبیر (PLAN) یا قانون (LAW) ہے جس کے مطابق یہ مشین سرگرمِ عمل رہتی ہے۔ اس تدبیر یا قانون کا مرحلہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے، اگرچہ ہم اس مشین پر غور و فکر سے اُن کا اندازہ لگا سکتے یا ان کی بابت معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

جو صورت ایک مشین کی ہے وہی کیفیت تمام اشیائے کائنات کی ہے۔ کارگہِ ہستی میں ہر شے ایک خاص تدبیر (PLAN) کے مطابق بنائی گئی ہے اور ایک خاص قانون (LAW) کے مطابق سرگرمِ عمل ہے۔ یہ

حصّہ جس کا تعلق تدبیر یا قانون سے ہے، عالمِ اَمر سے متعلق ہے۔ اس مقام پر اتنا مزید سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ ہم یہ تو سمجھ سکتے ہیں کہ فلاں چیز کس قانون کے مطابق متحرک اور نتیجہ خیز ہے لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کے لئے وہی قانون کیوں بنایا گیا ہے۔ کوئی دوسرا قانون کیوں نہیں بنا دیا گیا۔ اسے خدا کی مشیّت کہتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے کائنات کے کلّی پروگرام کے پیشِ نظر جس قسم کا قانون مناسب سمجھا بنا دیا۔ ہمارا تعلق اس قانون کے "کیسا" (HOW) سے ہے، "کیوں" (WHY) سے نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امر کا لفظ بعض مقامات میں حکم یا فیصلہ کے معنوں میں بھی آیا ہے، یعنی خدا کا فیصلہ ایسا تھا، اس کا حکم ایسا تھا۔ اس نے یہ قانون اپنے فیصلہ سے بنایا ہے جس کا اسے کُلّی اختیار حاصل ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ عالمِ امر کا وہ حصّہ جہاں اشیائے کائنات کے لئے قوانین مرتّب ہوتے ہیں، ہمارے حیطۂ ادراک سے باہر ہے۔ البتہ جہاں یہ اَمر طبعی قوانین کی شکل میں کارفرما ہوتا ہے، اسے ہم مشاہدہ اور مطالعہ اور غور و فکر سے معلوم کر سکتے ہیں۔ انھیں قوانینِ فطرت کہا جاتا ہے۔ سمجھنے کے لئے یوں کہئے کہ اشیائے کائنات جن قوانین کے تابع رہتی ہیں، ان کے "قبل از فطرت" (PRE-NATURAL) مرحلہ کو قوانینِ مشیّت کہا جاتا ہے اور اس کے بعد کے مرحلہ کو قوانینِ فطرت۔

جس طرح خارجی کائنات میں قوانینِ خداوندی کارفرما ہیں، اس طرح انسانوں کی دنیا میں بھی، ہر عمل ایک خاص قانون کے مطابق نتیجہ خیز ہوتا ہے۔ انسانوں کو یہ قوانین وحی کے ذریعے ملتے ہیں، اس لئے بعض اوقات وحی کے لئے بھی اَمر کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یعنی وحی اس سمت کا تعیّن کرتی ہے جس کے مطابق چل کر کاروانِ انسانیت اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔

اَمر کے ان مختلف معانی کو سامنے رکھ کر قرآن کریم کے متعلقہ مقامات پر غور کیجئے۔ حقیقت سامنے آجائے گی۔

کُنْ فَیَکُوْنُ

سب سے پہلے، "قبل از فطرت" تخلیقی مرحلہ کو لیجئے۔ قرآن میں متعدد مقامات میں ہے کہ

اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ○ (۳۶/۸۲)۔

اس کا امر یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کا ارادہ کرتا ہے تو کہہ دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔

اس سے دو باتیں سمجھنے کے قابل ہیں۔ ایک تو یہ کہ ارادہ کر لینے کے بعد خدا، سچ مچ (ہماری طرح) کُنْ کا لفظ نہیں کہتا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ اس کے ارادہ کے ساتھ ہی عملِ تخلیق شروع ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ فَیَکُوْنُ سے مطلب یہ نہیں کہ اِدھر اللہ نے کُنْ کہا اور اُدھر وہ شے اپنی مکمّل شکل میں وجود پذیر ہو گئی۔ قرآنِ کریم میں متعدد مقامات میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ کائنات میں سلسلۂ ارتقاء جاری ہے اور خدا کی اسکیموں کو اپنے نقطۂ آغاز سے مقامِ تکمیل تک پہنچنے میں ہزارہا ہزار سال کا عرصہ لگ جاتا ہے۔ لہٰذا، کُنْ فَیَکُوْنُ سے مراد یہ ہے کہ خدا کے ارادے کے ساتھ ہی اس شے کے تخلیقی پروگرام کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اس کی تکمیل، اپنے وقت پر، بعد میں جا کر ہوتی ہے۔ ہم نے جو کہا ہے کہ "کُنْ کہنے سے اس شے کے عملِ تخلیق کا آغاز ہو جاتا ہے اور اس کی تکمیل، اپنے وقت پر، بعد میں ہوتی ہے" تو یہ زمان (TIME) کے انسانی تصوّر کے مطابق کہا گیا ہے جس میں ماضی، حال اور مستقبل کے زمانے ہوتے ہیں۔ خدا کے نزدیک زمان کے یہ امتیازات کچھ معنی نہیں رکھتے۔ اس کے سامنے ہر وقت زمانۂ حال (AN ETERNAL NOW) ہے اس لئے اس کے ہاں کُنْ اور فَیَکُوْنُ میں بُعدِ زمانی نہیں ہوتا۔

تخلیق کے بعد اب قانون کی طرف آئیے۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ قانونِ خداوندی میں ایک مرحلہ وہ ہے جہاں یہ قوانین مرتّب ہوتے ہیں۔ اس مرحلہ کے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے، نہ ہی یہ کہ وہ قوانین اس قسم کے کیوں ہیں۔ دوسرا مرحلہ وہ ہے جس میں وہ قوانینِ طبعی کائنات میں نافذ العمل ہوتے ہیں۔ قرآن نے اسے بھی امر ہی سے تعبیر کیا ہے۔ بالفاظِ دیگر، کائنات کے طبعی قوانین بھی "اَمرِ الٰہی" کہلاتے ہیں۔ سورۃ اعراف میں ہے۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ قف یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا لا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ط اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ ط تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ○ (۷/۵۴) نیز (۱۶/۱۲)۔

بے شک تمہارا ربّ وہ اللہ ہے جس نے زمین کو اور آسمانوں کو "چھ" "ایّام" (یعنی چھ ادوار میں جو یکے بعد دیگرے واقع ہوئے) پیدا کیا اور کائنات کے مرکزی کنٹرول کو اپنے ہاتھ میں

لے لیا۔ وہ دن کو (پردۂ) شب سے چھپا دیتا ہے (اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا) رات دن کے پیچھے لپکی آ رہی ہے اور (دیکھو) سورج اور چاند اور (دیگر ستارے) سب اس کے قوانین کے سامنے جھکے ہوئے ہیں۔ یاد رکھو خلق اور امر سب اسی کے اقتدار کے تابع ہے۔ کس قدر بابرکت ہے وہ ذات جس نے کائنات کی نشو و نما کے لئے ایسا محیّرالعقول انتظام کر رکھا ہے۔

سورۂ روم میں ہے۔

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ...(۳۰/۲۵)

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ (بھی) ہے کہ زمین و آسمان اس کے امر سے قائم ہیں!

ارض و سما میں امرِ الٰہی

زمین اور مختلف کرّے، اس کے امر سے قائم ہی نہیں بلکہ اس نے ان کے اندر یہ خاصیتیں ودیعت کر رکھی ہیں کہ وہ اپنے امورِ مفوّضہ کو معیّنہ قاعدے کے مطابق برابر سرانجام دیتے رہیں۔

فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ اَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا .... (۴۱/۱۲)۔

پس اس نے دو ایام (ادوار) میں متعدد کرّے بنا دیئے اور ہر کرّے میں اُس نے وہ امر بھیج دیا۔ (وہ قانون اس کے اندر رکھ دیا جس کے مطابق اس نے سرگرمِ عمل رہنا تھا)

مظاہرِ فطرت میں امرِ خداوندی

تمام مظاہرِ فطرت اسی امر کے مطابق اپنے فرض کی ادائیگی میں سرگرداں ہیں۔ جہاز اسی نظام کے ماتحت سینۂ آب پر تیرتے پھرتے ہیں۔ (۲۲/۶۵)۔ ہوائیں اسی کے مطابق رواں دواں رہتی ہیں تاکہ وہ کشتیوں کو اِدھر اُدھر چلنے میں مدد دیں۔ (۳۰/۴۶؛ ۴۵/۱۲)

وہ مالکِ "خلق و امر" ان تمام اشیاء میں ایک مرتبہ یہ خاصیتیں پیدا کر کے پھر (نعوذ باللہ) معطل ہو کر نہیں بیٹھ گیا، بلکہ تخلیقِ کائنات کے بعد بھی "تدبیرِ امور" برابر جاری ہے اور یہ تدبیر اسی کے مرکزِ قوت و اقتدار (عرشِ عظیم) سے سرانجام پاتی ہے۔

تدبیرِ امور

فرمایا کہ ان سے پوچھئے وَ مَنْ یُّدَبِّرُ الْاَمْرَ..... (۱۰/۳۱) کون تدابیرِ امور کرتا ہے؟ جواب دیا۔

إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِي سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ۝ (۱۰/۳)۔

بے شک تمہارا رب وہ اللہ ہے جس نے زمین و آسمان کو چھ "ایام" میں پیدا کیا۔ پھر ان کا کنٹرول اپنے اقتدار میں رکھا وہی تمام امور کی تدبیر کرتا ہے۔ (نیز دیکھئے ۱۳/۲؛ ۱۲/۹۵)۔

سورۃ السجدہ کی دو آیات میں، کائنات کے تخلیقی مراحل کا ذکر اس حسن و خوبی سے آیا ہے کہ عصر جدید کے سائنٹفک انکشافات بھی اس پر وجد کرتے ہیں۔ پہلے فرمایا کہ "خدا نے کائنات کو چھ مختلف مراحل سے گذار کر موجودہ شکل عطا کی" (۳۲/۴) اس کے بعد کہا کہ،

خدا کا اندازِ تخلیق یہ ہے کہ اس کے عالمِ مشیت میں ایک اسکیم سامنے آتی ہے۔ وہ اس اسکیم کا آغاز اس کے سب سے نچلے درجہ سے کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ، اس کے "امر" کے مطابق مختلف مراحل طے کرتی، اپنے نقطۂ تکمیل کی طرف اٹھتی اور بڑھتی چلی جاتی ہے (۳۵/۱۰)۔ ان ارتقائی مراحل کی مدت، تمہارے حساب و شمار کے مطابق، ہزار ہزار سال کی ہوتی ہے (۳۲/۵)، (بلکہ بعض اسکیموں کے مطابق پچاس پچاس ہزار سال کی۔ ۷۰/۴)۔

چونکہ "نظامِ امر" کے تمام رازہائے سربستہ اسی مالکِ امر و خلق کے حیطۂ علم میں ہیں، اس لئے

امرِ الٰہی اُسی کی طرف لوٹتا ہے

جملہ امورِ کائنات مفید اسکیموں کے ماتحت پختگی حاصل کر کے رفتہ رفتہ اس منزلِ مقصود کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں جو ان کے لئے مقدر کی گئی ہے۔

وَ لِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ (۱۱/۱۲۳)

ارض و سمٰوٰت (بلندیوں اور پستیوں) کے سربستہ راز سب اللہ کے لئے ہیں اور تمام امر اسی کی مقرر کردہ منزل کی طرف لوٹتے ہیں۔

نظامِ عالم میں واقعات و حوادث کی ترتیب اسی نہج سے قرار پائی ہے کہ ہر اسکیم بتدریج اپنے منتہیٰ تک پہنچ جائے۔ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ط وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ع (۸/۴۴) تاکہ اللہ اس امر کو پورا کر دے جو ہونے والا ہے اور تمام امور (پختگی حاصل کرنے کے بعد) خدا کی مقرر کردہ منزل کی طرف لوٹتے ہیں۔ (نیز ۵۷/۵)۔

پھر یہ امور ایسے نہیں کہ ایک اسکیم کی ابتداء کی گئی اور اسے راستہ میں ادھورا چھوڑ کر کسی دوسری چیز کو شروع کر دیا یا بعض امور میں آخر تک کامیابی ہوگئی اور بعض میں ناکامی۔

ہر تدبیر مکمّل ہوتی ہے

ایسی باتیں انسانی کوششوں میں ہوتی ہیں۔ اللہ کی ذات اس سے بلند و بالا ہے۔ اس کا امر اٹل ہے اور اس کی ہر اسکیم یقیناً کامیاب ہوتی ہے اِنَّ اللّٰہَ بَالِغُ اَمۡرِہٖ ؕ قَدۡ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیۡءٍ قَدۡرًا ۝ (۶۵/۳) یقیناً اللہ اپنے امر (اسکیم) کو انتہا تک پہنچا کے رہتا ہے۔ اس نے ہر شے کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے اس لئے کہ اس کا ہر امر واقع ہو کر رہتا ہے وَ کَانَ اَمۡرُ اللّٰہِ مَفۡعُوۡلًا ۝ (۳۳/۳۷ ز ۴/۴۷)۔

امرِ الٰہی کے اندازے

وَ کُلُّ اَمۡرٍ مُّسۡتَقِرٌّ ۝ (۵۴/۳)۔ ہر امر کو اپنے مستقر تک پہنچنا ہوتا ہے۔ مختلف منازل و مراحل طے کرنے کے بعد اسے ایک مقامِ معیّنہ پر قرار پکڑنا ہوتا ہے۔ ان امورِ مقدرہ کو ان کے مستقر تک لے جانے کے لئے تمام اسباب و علل پیدا کئے جاتے ہیں جن میں بعض تو ذہنِ انسانی میں آسکتے ہیں اور بعض اس سے ماوراء ہوتے ہیں۔

وَ اللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰۤی اَمۡرِہٖ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ۝ (۱۲/۲۱)

اللہ اپنے امر (اسکیم) پر (پوری طرح) غالب ہوتا ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس (کی حقیقت) کو سمجھ نہیں سکتے۔

عذابِ خداوندی بھی امر سے متعلق ہے

جس طرح خارجی کائنات میں خدا کا امر (قانونِ خداوندی) کارفرما ہے اس طرح انسانی دنیا میں بھی اعمال کے نتائج اُس کے قانون (امر) کے مطابق مرتب ہوتے ہیں۔ افراد کے اعمال کے نتائج بھی اور اقوام کے بھی۔ جسے عام طور پر جزا اور سزا کہا جاتا ہے وہ خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق اعمال کے نتائج ہی کا دوسرا نام ہے۔ جب قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی سے قوموں پر تباہی آتی ہے تو اُسے بھی امرِ الٰہی سے تعبیر کیا جاتا ہے، یعنی یہ کچھ بھی خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق ہوتا ہے۔ قرآن نے اقوامِ سابقہ کی تباہیوں اور بربادیوں کا ذکر انہی الفاظ میں کیا ہے۔ (ان امور کی تفصیل جیسے نور، برقِ طور اور شعلۂ مستور

میں آچکی ہے۔ اس مقام پر چند ایک مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مثلاً طوفانِ حضرت نوحؑ کے ضمن میں ان کی قوم سے کہا گیا۔

فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَ يَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ٥ (۳۹/۴۰-۱۱)...فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُ ۙ...... (۲/۳۹)

(نوحؑ نے ان سے کہا) سو تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ وہ کون ہے جس پر رسوا کن عذاب آتا ہے اور ہمیشہ رہنے والا عتاب نازل ہوتا ہے۔" یہاں تک کہ جب ہمارا امر قریب آپہنچا اور زمین سے پانی نے جوش مار کر نکلنا شروع کیا۔

جب حضرت نوحؑ کے بیٹے نے کہا کہ میں کسی پہاڑ پر جا کر پناہ لے لوں گا، تو باپ نے کہا۔

لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ (۱۱/۴۳)

آج اللہ کے امر سے کوئی بچانے والا نہیں۔ وہی (بچے گا) جس پر اللہ رحم کرے گا۔

اور جب اس سیلابِ فنا کے رک جانے کا وقت آیا تو فرمایا کہ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ...... (۱۱/۴۴)۔ امر اختتام تک پہنچ گیا اور مکمل ہو گیا۔

قوم عاد کی تباہی کے سلسلہ میں فرمایا۔ وَ لَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا...... (۱۱/۵۸)۔ جس وقت ہمارا امر آپہنچا۔ قوم ثمود کے متعلق یہی فرمایا۔ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا......(۱۱/۸۲) حضرت لوطؑ کو اس امر کا علم دے دیا گیا تھا۔

وَ قَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ٥ (۱۵/۶۶)۔

اور ہم نے لوطؑ کی طرف یہ امر بھیج دیا تھا کہ صبح ہوتے ہی ان کی قوم کی جڑیں کٹ جائیں گی۔

قوم شعیبؑ پر جو عذاب آیا اسے بھی امرِ الٰہی کہا گیا۔ (وَ لَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا......(۱۱/۹۴)۔ بنی اسرائیل نے جب حضرت موسیٰؑ کی عدم موجودگی میں بچھڑے کی پرستش شروع کر دی تو انہوں نے آکر کہا کہ (اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ (۷/۱۵۰)۔ تم نے اپنے ربّ کے امر میں کس قدر جلدی کی؟ عہدِ رسالتمآب کے منافقین کے ضمن میں فرمایا؛

...... فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ۝ (۵/۵۲)......

وہ وقت دُور نہیں جب اللہ تمہیں (اے رسول) فتح دے گا یا اس کی طرف سے کوئی اور امر ظاہر ہوگا اور اس وقت یہ لوگ اس بات پر شرمندہ ہوں گے جو انھوں نے اپنے دلوں میں چھپا رکھی ہے۔

اہلِ کتاب کے متعلق ارشاد ہوا۔

فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ......(۲/۱۰۹)

پس تم عفو و درگزر سے کام لو۔ یہاں تک کہ اللہ کا امر آجائے

خدا کا قانون یہ ہے کہ جس درخت کا بیج ہوگا اُس میں سے وہی درخت پیدا ہوگا اور اس درخت میں اُسی قسم کے پھول اور پھل آئیں گے۔ ظاہر ہے کہ بیج کو درخت بنانے اور درخت کو بار آور کرنے کے لئے فطرت کی بہت سی قوتیں باہمی تعاون سے مصروفِ عمل ہوتی ہیں ان میں سے کئی ایک قوتوں کے متعلق انسان نے معلومات حاصل کرلی ہیں اور کئی ایسی ہیں جن تک اس کے ذہن کی رسائی نہیں ہوئی۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں بعض ایسے مؤثرات بھی ہوں جن کی کنہ و حقیقت انسان کی سرحدِ ادراک سے باہر ہو۔ وہ قوتیں جو قانونِ خداوندی کو نتیجہ خیز بناتی ہیں، قرآن کی اصطلاح میں ملائکہ کہلاتی ہیں۔ (تفصیل اس کی میری کتاب "ابلیس و آدم" میں بیان کی گئی ہے) قرآنِ کریم نے ملائکہ کے متعلق کہا ہے کہ وہ ہر کام اللہ کے امر کے مطابق کرتے ہیں۔

ملائکہ اور امرِ الٰہی

وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ (۲۱/۲۷) وہ بامرِ الٰہی انسان کی حفاظت کرتے ہیں۔ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ (۱۳/۱۱)۔ اسی کے امر سے ان کا نزول ہوتا ہے۔ (وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ...... (۱۹/۶۴)) اور وہ وحیِ الٰہی کے حامل و قاصد ہیں۔

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ ....(۱۶/۲)۔

وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے ملائکہ کو اپنے امر سے الروح (وحی) کے ساتھ

بھیجتا ہے[1]۔

اِلقارِ وحی بھی امر اللہ سے ہوتا ہے۔

......یُلْقِی الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِہٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ......(۴۰/۱۵)

وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنے اَمر سے وحی کا اِلقار کرتا ہے[2]۔

کتابِ حضرت موسیٰؑ کے سلسلہ میں فرمایا۔

وَ مَا کُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِیِّ اِذْ قَضَیْنَآ اِلٰی مُوْسَی الْاَمْرَ......(۲۸/۴۴)

اور تم (اے رسول) اس وقت غربی جانب نہ تھے جب ہم نے موسےٰؑ کی طرف امر بھیجا۔

وحی بھی امرِ الٰہی ہے

یہاں اَمر سے مراد وحیٔ الٰہی ہے۔ دوسری جگہ ہے ۔ وَ اٰتَیْنٰھُمْ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ (۴۵/۱۷)۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو اَمر کی واضح دلیلیں دیں، یہاں بھی اَمر سے مقصود وحیٔ خداوندی ہے یا احکام شریعتِ موسویؑ۔ اس سے اگلی آیت میں ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰکَ عَلٰی شَرِیْعَۃٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْھَا......(۴۵/۱۸)

پھر ہم نے تمہیں (اے رسول) دین کے ایک خاص طریقہ پر کر دیا۔ سو تم اسی طریقہ کا اتباع کئے جاؤ۔

اَمر بمعنی دین

ان مقامات پر اَمر سے مقصود دین ہے اور دین اور وحی ایک ہی چیز ہے۔ اسی لئے قرآنِ کریم اور اس کے احکامات کو بھی دوسری جگہ امرُ اللہ کہا گیا ہے۔ سورۂ طلاق میں عورتوں سے متعلق احکام کے ضمن میں فرمایا۔

ذٰلِکَ اَمْرُ اللّٰہِ اَنْزَلَہٗٓ اِلَیْکُمْ......(۶۵/۵)۔

یہ اللہ کا اَمر (حکم) ہے جسے اس نے تمہاری طرف نازل کیا ہے!

یعنی وہ قوانین جو بذریعہ وحی دیئے گئے ہیں تاکہ انسانی معاشرہ ان کے مطابق متشکل کیا جائے۔

لیلۃ القدر اور امرِ الٰہی

وہ شب جس میں نزولِ قرآن کا آغاز ہوا تھا، اس میں تفریقِ امور (حق و باطل میں تفریق) ہوئی تھی۔

---

[1] "بھیجتا تھا"، کیونکہ نبی اکرمؐ کے بعد وحی کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ [2] "کرتا تھا"۔

فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ ۙ أَمْرًا مِّنْ عِندِنَا ۚ ...(۴۴/۴-۵)

اس میں ہر حکمت والے امر کی تفریق ہوئی۔ وہ امر جو ہماری طرف سے ہوتا ہے۔

وہی رات جسے لیلۃ القدر کہا گیا ہے۔

تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِم مِّن كُلِّ أَمْرٍ ۙ (۹۷/۴)۔

جس میں ملائکہ اور الرّوح اپنے رب کے قانون کے مطابق نازل ہوتے ہیں، ہر امر کو لئے ہوئے۔

الرّوح امرِ ربّ ہے اور الرّوح بھی امرِ الٰہی ہے۔

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ۖ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ۝ (۱۷/۸۵)۔

اے رسول! یہ لوگ تم سے الرّوح کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ تم کہہ دو کہ "روح" میرے پروردگار کے امر سے ہے اور تمہیں (امورِ الٰہیہ کا) جو علم دیا گیا ہے وہ بہت تھوڑا ہے۔

یہاں الرّوح سے مراد وحیٔ الٰہی ہے۔ اس کی تفصیل کتاب "ابلیس و آدم" میں ملے گی۔

امر بمعنی حکم بعض مقامات میں امر مجرّد حکم کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً انبیاء کرامؑ بامرِ الٰہی (بحکمِ خداوندی) ہدایت کرتے تھے يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا..... (۲۱/۷۳) دوسری جگہ اس کے لئے اذن کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ نبی اکرمؐ کے متعلق فرمایا وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ (اللہ کی طرف اس کے اذن (قانونِ خداوندی) کے مطابق دعوت دینے والا ۳۳/۴۶) بنی اسرائیل کے ائمہ بھی امرِ الٰہی کے مطابق ہدایت کرتے تھے (وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا ۳۲/۲۴)۔ (اور ہم نے ان میں سے بہت سے پیشوا بنا دیئے تھے جو ہمارے امر سے ہدایت کرتے تھے) یہاں امر سے مراد احکامِ خداوندی، دینِ حضرت موسیٰؑ بھی ہو سکتا ہے کیونکہ جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، امر کے معنی دین اور احکامِ الٰہی کے بھی ہیں۔ ان آیات میں بھی امر کے معنی قانونِ خداوندی ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک خارجی کائنات یا انسانی معاشرہ کا تعلق ہے، حکم یا اذن یا امر سے مراد قوانینِ خداوندی ہے جس کے مطابق یہ تمام کاروبار سرانجام پاتے ہیں۔

اِذن اور اَمر سورۂ سبا میں اُن "جنّات" کا ذکر ہے جو حضرت سلیمانؑ کے خدمت گزار تھے۔ ان کے متعلق ذکر کرتے ہوئے ایک ہی آیت میں اِذن اور اَمر کے مرادف الفاظ آئے ہیں۔

.......وَ مِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ؕ وَ مَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝ (۳۴/۱۲)

اور جنّات میں سے (بعض) وہ تھے جو (حضرت سلیمانؑ) کے حضور، اپنے رب کے اِذن سے کام کرتے تھے اور ان میں سے جس نے ہمارے امر سے سرتابی کی، ہم اسے دوزخ کے عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔

"جنّات" سے مراد وہ وحشی قبائل ہیں جو مملکتِ حضرت سلیمانؑ میں مختلف خدمات سرانجام دیتے تھے۔ (تفصیل میری کتاب "ابلیس و آدم" میں ملے گی)۔

خالقیّت

سابقہ عنوان میں بتایا جاچکا ہے کہ خدا کے پروگرام کے مطابق تخلیق کے مراحل دو ہیں. پہلا مرحلہ عالمِ امر کا ہے جس میں شئے متعلقہ ہنوز اپنے غیر مرئی اور غیر محسوس منازل میں ہوتی ہے. دوسرا مرحلہ تخلیق کا ہے جس میں وہ شئے مشہود طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہے. یہ تقسیم عمومی ہے، ورنہ **خلق** کا لفظ ہر مرحلہ پر بولا جاسکتا ہے.

لُغوی معنی

خلق کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کو ماپنا، اس کا اندازہ کرنا، کسی شئے کو دوسری شے کے مطابق بنانا، کسی شئے کا تناسب و توازن درست کرنا. ان معانی کے اعتبار سے **خلق** کے معنی ہوں گے مختلف عناصر میں تناسب و توازن پیدا کر کے، ایک خاص اندازے اور پیمانے کے مطابق کسی چیز کو بنانا. اس لحاظ سے دیکھئے تو تخلیق کے بھی دو مراحل ہوں گے. ایک تو مختلف عناصر کو عدم سے وجود میں لانا. اس کے لئے قرآن نے بدیع اور فاطر کے الفاظ استعمال کئے ہیں (ان کا بیان آگے چل کر آئیگا) اور دوسرا مرحلہ، ان پیدا کردہ عناصر میں، مختلف تراکیب سے نئی نئی چیزیں بناتے چلے جانا. اس میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو شے ایک خاص ترتیب اور پیمانے کے مطابق ایک مرتبہ بنادی جائے اسے، اسی طرح پھر دہراتے جائیں، یعنی وہ بار بار اسی انداز سے بنتی جائے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تخلیق شدہ چیزوں میں نئے نئے اضافے ہوتے جائیں. قرآن نے ان دونوں گوشوں کا ذکر کیا ہے.

پہلے گوشے کے متعلق سوال کیا جاتا ہے کہ اَمَّنْ يَّبْدَءُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ (۲۷/۶۴)

ابتدا اور اعادہ

وہ کون ہے جس نے تخلیق کی ابتدا کی اور پھر اسے دہرائے جاتا ہے.

جواب دیا جاتا ہے کہ؛

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○ (۳۰/۱۱)۔
اللہ نے تخلیق کی ابتدا کی ہے، وہی اسے دہراتا ہے اور تمہارا ہر قدم اسی کی متعین کردہ منزل کی طرف اُٹھتا ہے۔

اس سے ذرا آگے ہے۔

وَ هُوَ الَّذِىْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَ هُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ (۳۰/۲۷)
خدا وہ ہے جو خلقت کی ابتدا کرتا ہے اور پھر اس کو دہراتا ہے۔ یہ سب کچھ اس کے لئے بہت آسان ہے۔ (نیز ۲۹/۱۹، ۱۰/۳۴)۔

يُعِيْدُهٗ کے معنی محض "دہرانا" ہی نہیں، اس سے مراد گردشیں دینا بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تخلیق کے نقطۂ آغاز کے بعد، وہ (خدا) اسے گردشیں دے کر مختلف ارتقائی مراحل سے گزارتا اور اس طرح اسے اس کے نقطۂ تکمیل تک لے جاتا ہے۔ اشیائے کائنات کا مختلف منازل و مراحل میں سے گزر کر تکمیل تک پہنچنے کا سلسلہ تو انسان کی سمجھ میں آسکتا ہے اور (عصرِ حاضر کے نظریۂ ارتقار کے مطابق) اب یہ سائنٹفک حقیقت بن کر بھی سامنے آچکا ہے لیکن خلقت کی ابتدا یعنی اس کے عدم سے وجود میں آنے کا انداز انسان کے حیطۂ ادراک میں نہیں آسکتا۔ اسی لئے قرآنِ کریم اس کی تفصیل میں نہیں گیا، صرف اتنا کہہ کر آگے بڑھ گیا ہے کہ خدا بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۲/۱۱۷) یا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۶/۱۴) ہے۔ یہ بدیع یا فاطر ہونا وہی ہے جسے كُنْ فَيَكُوْنُ کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ "كُنْ فَيَكُوْنُ" کے متعلق سابقہ عنوان میں بتایا جاچکا ہے کہ اس سے مفہوم کیا ہے۔ اس مقام پر اس کی وضاحت کی گئی تھی کہ اس سے یہ مراد نہیں کہ ہر شے یونہی کہیں سے پھوٹ کر نکل پڑتی ہے۔ نظامِ کائنات میں ہر شے کی تخلیق ایک خاص قانونِ الٰہی کے مطابق عمل میں آتی ہے۔ بیج کو درخت، قطرے کو گہر بننے کے لئے کئی مراحل طے کرنے پڑتے ہیں۔ ان تمام امور کے متعلق قرآنِ کریم میں مذکور ہے کہ یہ مختلف مراحل، مختلف مدارج، مختلف طبقات میں سے گزر کر اپنی آخری اور مکمل صورت اختیار کرتے ہیں۔ اس لئے "كُنْ فَيَكُوْنُ" سے مراد یہ ہے کہ کسی شے کی ابتدار کے لئے اللہ کو کسی سامان اور اسباب کی ضرورت نہیں۔ ان کی ابتدا اس کے حکم و ارادہ کے ماتحت ہوتی ہے اور پھر اسی کے متعین فرمودہ قوانین کے ماتحت وہ مختلف مدارج طے کر کے اپنی آخری شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

سمٰوٰت و الارض یہ حقیقت ہے کہ تمام سلسلۂ کائنات اللہ ہی نے پیدا کیا ہے لیکن قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ جس حقیقت کو وہ زیادہ گہرائی سے دل پر نقش کرنا چاہتا ہے اسے مختلف پیرایوں میں بیان کرتا ہے۔ مثلاً بطور استفہام مذکور ہے کہ اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ (۲۷/۶۰)۔ وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے؟ اور کبھی اس حقیقت کو اس انداز سے سامنے لایا گیا کہ یہ لوگ جو قرآن کی اس طرح مخالفت کرتے ہیں، اگر ان سے بھی پوچھو کہ خالق ارض و سما کون ہے، تو یہ بھی اس امر کا اعتراف کریں گے کہ سلسلۂ کائنات کا خالق خدا ہی ہے۔ مثلاً

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۙ (۴۳/۹)؛ (نیز ۳۹/۳۸؛ ۳۱/۲۵)؛ (۲۹/۶۱)۔

اگر ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کر دیا تو وہ یقیناً یہی کہیں گے کہ اسے خدائے عزیز و علیم نے پیدا کیا۔

کہیں وہ اسی حقیقت کو اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ جو کچھ عالمِ موجودات میں ہے اس کا خالق تو وہی خدائے حقیقی ہے، لیکن اگر تم اس کے سوا کسی اور کو بھی خدا مانتے ہو تو بتاؤ کہ اس خدا نے کیا پیدا کیا ہے؟ سورۂ لقمان میں زمین و آسمان کی مخلوقات کے تذکرہ کے بعد فرمایا۔

هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ؏ (۳۱/۱۱)۔

یہ تو سب اللہ کی تخلیق ہے۔ لیکن مجھے بتاؤ کہ اس کے سوا (جنہیں تم خدا سمجھتے ہو) انہوں نے کیا پیدا کیا ہے۔ نہیں! یہ حد سے گزرنے والے لوگ تو کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں!

پھر ان سوالات کے جواب بھی وہ خود ہی دیتا ہے کہ یہ ان کی بھول ہے جو دوسروں کو خدا بنا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ اسی نے پیدا کیا ہے اور وہی خالقِ کل ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ ؏ (۶/۱)

سب حمد اس خدا کے لئے ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور جس نے روشنی اور اندھیرے کو بنایا ہے!

اس کے ساتھ ہی قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلۂ کائنات کو یونہی عبث و بیکار، بے مقصد و بے معنی، بے غرض و بے غایت پیدا نہیں کر دیا، بلکہ حکمتِ بالغہ کے اقتضا سے پیدا کیا ہے۔ اس کی تخلیق کا ایک خاص مقصد ہے۔ مادّہ پرست چونکہ اس نظام کے پیچھے کسی بالارادہ قوّت کے وجود کے قائل نہیں، اس لئے ان کا عقیدہ ہے کہ تمام موجودات ایک اندھی فطرت (BLIND NATURE) سے یونہی بلا غرض و غایت، بلا مقصد و مصلحت ظہور میں آگئی ہیں اور اسی طرح فنا ہو جائیں گی۔ قرآنِ کریم میں اس عقیدہ کی تردید مختلف انداز و اسلوب سے کی گئی ہے۔ فرمایا۔

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ؕ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ؕ (۳۸/۲۸)

اور ہم نے ارض و سماوات اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اسے یونہی باطل نہیں پیدا کر دیا۔ ایسا تو ان لوگوں کا ظن ہے جو خدائے حکیم کے وجود سے انکار کرتے ہیں۔ ان کفار کے لئے نارِ جہنم (کی تباہی اور بدبختی ہے۔

علم الاشیاء اور اسلام

اسی لئے کہا کہ مومنین کی جماعت کا کام یہ ہونا چاہیئے کہ وہ دنیا کی ایک ایک چیز کو لیں اور عمر بھر کے تجربات و مشاہدات، ایک زمانہ کی تحقیق و تفتیش (RESEARCH) کے بعد یہ ثابت کر دیں کہ اللہ نے کسی چیز کو عبث و بے کار پیدا نہیں کیا۔ مغرب آج اس امر پر ناز کرتا ہے کہ انہوں نے علومِ طبیعی میں بڑی ترقّی کی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ امر ہے واقعی موجبِ فخر و ناز۔ قرآنِ کریم نے جب کہا تھا کہ آدم مسجودِ ملائکہ ہے اور سلسلۂ کائنات، انسان کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے (تفصیل "ابلیس و آدم" اور "اسلام کیا ہے؟" میں ملے گی) تو جو افراد یا اقوام فطرت کی قوّتوں کو مسخر کرتی ہیں، وہ اس مقصد کو پورا کرتی ہیں، لیکن قرآنِ کریم نے چودہ سو سال پہلے جماعتِ مومنین کے متعلق کہا تھا کہ

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۚ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا

عَذَابَ النَّارِ ۝ (۱۸۹---۳/۱۹۰)۔

یقیناً ارض و سماوات کی تخلیق اور دن اور رات کی گردش (اختلاف) ان صاحبانِ علم و بصیرت کے لئے بڑی ہی نشانیاں ہیں۔ وہ صاحبانِ علم و بصیرت جو کھڑے، بیٹھے، لیٹے قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں، یعنی ارض و سماوات کی تخلیق میں غور و تفکر کر کے (اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ) اے ہمارے پروردگار تو نے اس کارگہ کائنات میں کسی شے کو نہ بے فائدہ پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی مقاصد کے لئے یقیناً تیری ذات اس سے بلند ہے (کہ یہ سب کچھ یونہی عبث بنا دیا ہو)۔ سو (اے اللہ) ہمیں "آگ کے عذاب" سے محفوظ رکھنا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ "اللہ کے ذکر" سے کیا مفہوم ہے، یعنی فطرت کے مشاہدہ اور مطالعہ سے اس حقیقت تک پہنچنا کہ یہ سلسلہ قوانینِ خداوندی کے مطابق سرگرمِ عمل ہے اور کائنات کی کوئی شے عبث و بیکار نہیں پیدا کی گئی۔ لیکن ایک حکیمِ مومن اور حکیمِ مغرب میں فرق یہ ہو گا کہ حکیمِ مغرب اشیائے فطرت کے متعلق انکشافات کے بعد ان کی غرض و غایت کے متعلق ظن و قیاس کی وادیوں میں سرگرداں پھرتا رہے گا۔ وہ مختلف "اجزائے کائنات" کے خواص و جوہر تو تلاش کرے گا لیکن ان مفردات کے مجموعہ یعنی کل کائنات کو بے مقصد و بے معنی قرار دے گا۔ وہ "مخلوق" (پیدا شدہ اشیاء) کے فوائد و منافع کو کرید کرید کر ڈھونڈے گا لیکن اس فائدہ مند اور نفع رساں مخلوق کے خالق کے متعلق یہ عقیدہ رکھے گا کہ (وہ معاذ اللہ) ایک "اندھی فطرت" ہے جو مقصد، ارادہ اور حکمت سے عاری ہے، یعنی وہ مشین کے ایک ایک پرزے کو مفید بتائے گا، لیکن ان پرزوں کے مجموعہ یعنی مشین کو بے کار قرار دے گا اور اس مشین کے بنانے والے کاریگر کو (نعوذ باللہ) "عقل کا اندھا" سمجھے گا۔ آپ خود اندازہ لگائیے کہ یہ عقل پرستی ہے یا عقل کا ماتم! برعکس اس کے ایک حکیمِ مومن انہی انکشافات سے یہ ثابت کرے گا کہ تخلیقِ کائنات ایک "اندھی فطرت" کا کام نہیں، بلکہ یہ ایک ایسی ذات کا فعل ہے جو حکیم و علیم و بصیر و خبیر ہے۔ وہ پرزوں کی افادیت سے کل مشین کے مفید اور کارآمد ہونے کو ثابت کرے گا اور کل مشین کے مفید ہونے سے مشین کے خالق کو علم و حکمت والا اور اس سے اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ یہ سلسلہ کائنات یونہی بے غرض و بلا مقصد وجود میں نہیں آگیا، بلکہ خدائے حکیم و بصیر اپنی حکمتِ بالغہ کے ماتحت اسے ایک جلیل القدر مقصد کے حصول کے لئے وجود میں لایا ہے، یعنی ایک حکیم مومن اپنے اس ایمان کو جو "غیب" پر مبنی تھا محسوس و مشہود تجارب کے جیتے جاگتے نتائج کی رُو شنی

میں علم وبصیرت سے مستحکم کرتا چلا جائے گا اور اس طرح ثابت کردے گا کہ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ قف عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیْ (۱۲/۱۰۸) میں (یعنی نبی اکرمؐ) اور میرے متبعین جو خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں، تو علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتے ہیں۔ مسلمان کا تو انداز یہ ہے کہ وہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، موجودات عالم کی ایک ایک چیز میں تفکّر و تدبّر کرتا ہے۔ وہ چلتا ہو تو نرگس و لالہ کی شگفتگی و شیفتگی اسے دعوتِ نظّارہ دے، وہ بیٹھے تو ریت کے ایک ایک ذرّہ میں اسے لاکھوں آفتاب چھپے نظر آئیں اور وہ لیٹے تو آسمان کی مرصّع چھت فلکیات کے سربستہ راز اس پر کھول دے اور اس طرح وہ ایک ایک چیز پر غور کر کے یہ ثابت کردے کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلاً ط (اے اللہ تو نے اس سلسلۂ کائنات کو باطل پیدا نہیں کیا) ایسے دین کے متعلق یہ کہنا کہ یہ علومِ سائنس کے خلاف ہے کس قدر حقیقت سے چشم پوشی ہے۔ لیکن دوسروں کا کیا گلہ جب خود مسلمان اپنے طرزِ عمل سے یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ خدائے حیّ و قیوم کی یہ زندہ و پائندہ آیات محض "ثواب" کی خاطر پڑھنے کے لئے ہیں اور "اللہ کے ذکر" سے مطلب تسبیح کے دانے گننے ہیں۔ جب مسلمان نے قرآن کا صحیح مفہوم سمجھا تھا تو دنیا نے دیکھ لیا تھا کہ ان کے ہاں ؎

سائنس اور مسلمان

ولایت، پادشاہی، علمِ اشیاء کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں! فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں (اقبالؒ)

پھر یہ کہنے سے کہ یہ سلسلۂ کائنات باطل نہیں، ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا۔ بعض فلاسفروں کا نظریہ ہے کہ جن اشیاء کو ہم گرد و پیش دیکھتے ہیں، ان کا وجود ذہنِ انسانی سے خارج کہیں نہیں۔ یہ صرف ہمارے تخیّلات ہی کے مظاہر ہیں۔ کوئی شے موجود فی الخارج نہیں ہوتی۔ اس قسم کا عقیدہ ہندوؤں کے ہاں بھی پایا جاتا ہے جس کی رُو سے وہ اس کائنات کو مایا (سراب) کہتے ہیں، یعنی جو در اصل موجود نہیں بلکہ محض ذہنِ انسانی کی فریب خوردگی کا نام ہے۔ اس نظریہ کے فلسفیانہ پہلو پر کسی دوسرے مقام پر بحث کی جائے گی، لیکن کائنات کو فریب اور سراب تصوّر کر لینے سے انسان کی عملی زندگی پر جو ہلاکت آفریں اثرات مرتّب ہوتے ہیں، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ اسی لئے قرآن نے اس کی صراحت کر دی کہ یہ سلسلۂ کائنات باطل نہیں، حق ہے۔ اس کی تخلیق بالحق اور ایک مقصد کو لئے ہوئے ہے۔ نیز، بالحق کے معنی ہیں تعمیری نتائج مرتّب کرنے کے لئے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَ يَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ۙ (۱۴/۱۹) ؛ (نیز ۱۶/۳)۔

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے ارض و سمٰوٰت کو بالحق پیدا کیا ہے۔ اگر وہ چاہے تو تمہیں معدوم کر دے اور تمہاری جگہ ایک نئی مخلوق پیدا کر دے۔

کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے

بالحق کے معنی یہ بھی ہیں کہ ہر شے ایک خاص مقصد کے پیش نظر پیدا کی گئی ہے۔ وہ اس عظیم الشان مشینری میں جس جگہ رکھی گئی ہے بالکل فٹ (FIT) ہے اور جس مقصد کے لئے اس کی تخلیق ہوئی ہے، وہ اس کی سر انجام دہی کے لئے سرگرمِ عمل ہے۔ اس سے ذہن اس حقیقت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ اس سلسلہ کو چلانے والی قوت کوئی اندھی فطرت نہیں، بلکہ ایک علیم و حکیم ہستی ہے جو خود بھی حق ہے اور اس نے جو کچھ پیدا کیا وہ بھی حق ہے یعنی اس سلسلۂ کائنات کے حق ہونے سے خود خالقِ کائنات کے حق ہونے کی دلیل ملتی ہے۔ یہی وہ آیات، وہ نشانیاں ہیں جن سے قلبِ مومن ایقان و طمانیت کی جنت حاصل کرتا ہے۔

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۠ (۲۹/۴۴) ؛ (۳۰/۸)۔

اللہ نے زمین و آسمان کو بالحق پیدا کیا ہے۔ یقیناً اس میں ایمان والوں کے لئے نشانیاں ہیں!

اس سلسلۂ کائنات کا بالحق ہونا ایک بدیہی امر ہے۔ یہ جس نظام کے ماتحت رواں دواں چل رہا ہے، اس میں کبھی ایک ذرّہ بھر بھی فرق نہیں آتا۔ اگر یہ یونہی پیدا ہو گیا ہوتا تو کبھی کا درہم برہم ہو چکا ہوتا۔ آپ نہیں دیکھتے کہ ریلوے کے نظم و نسق میں جب کبھی ذراسی غلطی ہو جاتی ہے، یعنی وہ "حق" سے ذرا ادھر اُدھر ہو جاتا ہے، تو اس میں کس قدر فساد برپا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یہ تسخیرِ شمس و قمر، یہ تکویرِ لیل و نہار، یہ ہر شے کا اپنے اپنے اندازے کے ماتحت ٹھیک وقت اور معیّنہ انداز کے مطابق اپنے فرائض کو سرانجام دیئے جانا، کیا اس پر دال نہیں کہ یہ ایک حکیم و خبیر ہستی کی حکمتِ بالغہ کا نتیجہ ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَ يُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ۝ (۳۹/۵)۔

اس نے ارض و سمٰوٰت کو بالحق پیدا کیا ہے۔ وہ رات کو دن (کی چادر میں) اور دن کو (رات کے نقاب) میں ڈھانپ دیتا ہے اور چاند اور سورج کو اپنے قوانین کے تابع رکھے ہوئے ہے۔ ہر شئے ایک وقتِ معین تک کے لئے چلتی رہے گی (اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں منہمک رہے گی) وہ تمام غلبہ و قوت کا مالک اور حفاظت کا ضامن ہے۔

ان آیات سے معلوم ہو گیا کہ یہ سلسلۂ کائنات یونہی بلا غرض و غایت نہیں پیدا کر دیا۔

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ ۝ (۲۱/۱۶)، (۳۸-۳۹/۴۴)۔

اور ہم نے زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، اسے یونہی کھیلتے ہوئے پیدا نہیں کر دیا۔

قرآنِ کریم نے ایک لفظ لٰعبین سے جہاں تخلیقِ کائنات کے بالحق ہونے کی طرف اشارہ کر دیا، وہاں ایک باطل عقیدہ کی بھی تردید کر دی۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ پرتھوی اور آکاش، ایشور کی لیلا ہے۔ یعنی ارض و سمٰوٰت کی پیدائش سے خدا (نعوذ باللہ) ایک کھیل کھیل رہا ہے، اپنا جی بہلا رہا ہے۔ جب کھیل سے اکتا جائے تو، جیسے بچے اپنے مٹی کے گھروندے کو خود ہی پامال کر دیتے ہیں، اسی طرح اس سلسلہ کو بھی درہم برہم کر دیگا۔ اسی بنا پر ان کے ہاں خدا (شوجی) کا ایک نام نٹ راجن (NATARAJAN) یعنی کھلاڑیوں کا راجہ، بہت بڑا کھلاڑی، ہے۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن نے محض باطل کہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس کے ساتھ لفظ لٰعبین کا اضافہ کر کے وضاحت کے ساتھ اس عقیدہ کی تردید کر دی۔ ظاہر ہے کہ آج سے چودہ سو برس پیشتر عرب میں کسی کو علم بھی نہ ہو گا کہ اس قسم کا کوئی عقیدہ بھی دنیا میں موجود ہے۔

نظامِ کائنات میں تدبّر

پھر چونکہ یہ سلسلۂ کائنات بالحق پیدا کیا گیا ہے، اس لئے اس کے متعلق غور و فکر کی بار بار تاکید کی گئی ہے۔ جو چیز بلا غرض و غایت یونہی وجود میں آگئی ہو یا جو محض تفریحاً کھیلنے کے لئے بنا دی گئی ہو، اس میں غور و تدبر کی کون دعوت دیتا ہے؟ غور و تدبر کا تو سوال ہی اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کوئی نظام کسی خاص حکمت کے ماتحت چل رہا ہو۔ کہیں کہا۔ اَوَ لَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ (۷/۱۸۵) "کیا یہ لوگ ملکوتِ ارض و سمٰوٰت (نظامِ عالم) میں اور ان چیزوں میں جو اللہ نے پیدا کی ہیں، غور نہیں کرتے"، اور کہیں یہ کہ مظاہرِ فطرت میں صاحبانِ عقل و بینش کے لئے نشانیاں ہیں۔

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ..... لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ○ (۲/۱۶۴)
(۲۵ ــــ ۳۰/۲۰)

یقیناً زمین و آسمان کی پیدائش میں، اختلافِ لیل و نہار میں، ان کشتیوں (جہازوں) میں جو سمندروں میں چلتی ہیں اور جن سے لوگ فائدہ حاصل کرتے ہیں اور اس پانی میں جسے اللہ فضائے آسمانی سے نازل کرتا ہے اور اس سے زمینِ مردہ کو حیاتِ تازہ عطا کرتا ہے اور اس میں ہر ذی حیات کو پھیلاتا ہے اور ہواؤں کے رُخ کی تبدیلی میں اور پستی اور بلندی کے درمیان (تیرتے ہوئے) بادلوں کی تسخیر میں عقل و فکر سے کام لینے والوں کے لئے حقیقت تک پہنچنے کی نشانیاں ہیں۔

حسنِ تخلیق

صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ دعوت دی اور کہا کہ اس نظامِ قدرت میں غور و فکر کرو اور دیکھو کہ اتنے بڑے عظیم الشان اور محیّر العقول سلسلۂ کائنات میں کہیں کسی جگہ کوئی نقص، کوئی اختلال، کوئی جُھول، کوئی بے قاعدگی، کوئی غیر موزونیت، کوئی نامناسبت، کوئی غلطی، کوئی سلوٹ نظر آتی ہے؛ کہیں انگشت نمائی کی گنجائش ہے؟

اَلَّذِیۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ هَلۡ تَرٰی مِنۡ فُطُوۡرٍ ○ ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ کَرَّتَیۡنِ یَنۡقَلِبۡ اِلَیۡکَ الۡبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِیۡرٌ ○ (۶۷/۳-۴)۔

وہ ذات جس نے متعدد کرّے درجہ بدرجہ (اوپر تلے) پیدا کئے، تم خدا کی تخلیق میں کہیں کوئی جُھول یا خلل نہیں پاؤ گے۔ ذرا (بہ نگاہِ تعمق) غور سے دیکھو۔ کیا کہیں کوئی خلل نظر آتا ہے؟ ہاں دوبارہ نگاہ دوڑاؤ (اور تلاش کرو کہ کوئی سُقم دکھائی دیتا ہے) تمہاری کوششوں کے باوجود نگاہ ناکام درماندہ و داماندہ (نہاں خانۂ چشم کی طرف) لوٹ آئے گی (اور کہیں کوئی سقم نہ پا سکے گی)۔

سطح بیں نگاہوں کو اس نظامِ کائنات میں کوئی نظم و ربط، کوئی تناسب و توازن نظر نہیں آتا، لیکن جوں جوں انسان کا علم و تجربہ وسیع ہوتا جاتا ہے اس کی تحقیقات اسے اس اٹل نتیجہ کی طرف لئے جاتی ہیں کہ مَا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ تخلیقِ خداوندی میں کوئی شکن نہیں، چادرِ مہتاب میں کوئی سلوٹ نہیں۔

مخلوق کا گھٹنا بڑھنا مشیت کے ماتحت ہے

پھر اگر یہ سلسلۂ کائنات یونہی اتفاقیہ وجود میں آگیا ہوتا، تو جو کچھ ایک دفعہ بن چکا تھا بنا رہتا۔ روح اور مادہ کو قدیم ماننے والے یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جتنی روحیں بن چکی ہیں، ان میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی اور مادہ بھی گھٹ بڑھ نہیں سکتا۔ اب صرف قالب بدلتے ہیں۔ سانچوں میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ یا، دوسری طرف یورپ کے مادہ پرستوں کا یہ نظریہ کہ

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انہی اجزاء کا پریشاں ہونا

ان کے نزدیک، نظامِ کائنات سلسلۂ ارتقاء کی مختلف منازل کا نام ہے، ورنہ یہاں نہ کچھ گھٹ سکتا ہے نہ بڑھ سکتا ہے۔ لیکن خدائے حکیم و خبیر کا پیدا کردہ جہان اس انداز کا نہیں کہ اسے پیدا کرنے کے بعد وہ (نعوذ باللہ) ایک عضوِ معطّل بن کر بیٹھ گیا ہو۔ یورپ کے فلسفیوں کا خیال ہے، کہ سلسلۂ کائنات ایک گھڑی کی مانند ہے جو ایک دفعہ کوکنے کے بعد خود بخود چلتی رہتی ہے۔ یہ عقیدہ بھی ذہنِ انسانی کی پیداوار ہے، حقیقت پر مبنی نہیں۔ جس ہستی میں یہ قدرت ہے کہ وہ کائنات کو عدم سے وجود میں لے آئے اور ایسے قوانین وضع کر دے جن کے مطابق یہ اس حسن و خوبی سے سرگرمِ عمل رہے، اس کے متعلق یہ سمجھنا کہ اتنا کچھ کرنے کے بعد اس کی قوتیں معطّل ہو گئیں، وہ بے کار بن کر بیٹھ گیا، علم نہیں جہالت ہے۔ اتنی عظیم الشان قوتوں کا مالک اور بیکار! کیا آپ کی عقل اسے تسلیم کرتی ہے؟ کیا مشاہدہ اور تجربہ یہی کہتا ہے؟ تعطّل تو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب تمام قوتیں ختم ہو کر زندگی موت میں تبدیل ہو جائے۔ زندہ اور قوتوں والا زندہ، حیٌّ اور اس کے ساتھ ہی قیّومٌ، وہ کبھی مر ہی نہیں سکتا۔ مرنا تو ایک طرف، اسے تو اونگھ تک نہیں آ سکتی۔ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (۲/۲۵۵) اس لئے نظریۂ تعطّل، یعنی خدا کا بے کار بیٹھ جانا حقائق سے چشم پوشی کی دلیل ہے۔ نظامِ کائنات کے رگ و پے میں اس کی حکمت اور مشیّت ہر وقت جاری و ساری ہے۔ وہ پیدا کرتا ہے، پھر قانونِ مشیّت کے مطابق، جس کی اصل اس کے علم میں ہے، جسے باقی رہنا نہیں ہوتا اُسے محو کر دیتا ہے اور جس میں باقی رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اسے ثابت رکھتا ہے۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ○ (۱۳/۳۱)

کائنات میں محو و ثبات خدا کے قانونِ مشیّت کے مطابق عمل میں آتا رہتا ہے۔ اس قانون کی

اصل علم خداوندی میں ہے۔

وہ پیدا کرنے کے بعد اب تخلیق سے غافل نہیں ہو گیا۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَ مَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ○ (۲۳/۱۷)۔

اور یقیناً ہم نے تمہارے اُوپر متعدد راستے بنائے ہیں اور ہم تخلیق سے غافل نہیں ہو گئے۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

صرف آرائش و تزئین ہی نہیں، بلکہ نت نئی مخلوق پیدا کرتا رہتا ہے۔

يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ (۳۵/۱)۔

وہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق مخلوق میں اضافے کرتا رہتا ہے۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است (اقبالؒ)

یہاں تک تو تخلیق کے مختلف گوشوں کا ذکر تھا۔ لیکن قرآن نے ان تمام تفاصیل و اطناب کو ایک فقرہ میں سمٹا دیا ہے جہاں کہا کہ خدا خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ہے یعنی ہر شئے کا پیدا کرنے والا۔ (۶/۱۰۲ ; ۳۹/۶۲ ; ۴۰/۶۲)۔

یہ تو تھا ایجابی پہلو، یعنی یہ دعویٰ کہ ہر شئے کا خالق وہی ہے۔ لیکن حقیقت کو غیر مبہم طور پر ذہن نشین کرانے کے لئے سلبی طریقِ بیان سے واضح کر دیا کہ اس کے سوا کسی اور نے کچھ پیدا ہی نہیں کیا۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ج (۳۵/۴۰) ; (۴۶/۴)۔

پوچھو کہ جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو ان کی بابت تم نے کبھی غور بھی کیا ہے۔ ذرا مجھے بتاؤ تو سہی کہ انہوں نے زمین میں کیا پیدا کیا ہے یا آسمانوں کے کس حصہ میں ان کی شرکت ہے؟

کہیں استفہامِ انکاریہ کی صورت میں یہی سوال کیا گیا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَیْرُ اللّٰهِ یَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۖ٘ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ○ (۳۵/۳)۔

اے نوعِ انسانی! اللہ کی نعمت کو یاد کرو جو اس نے تم پر (ارزانی) فرمائی۔ کیا اللہ کے سوا زمین اور آسمانوں میں کوئی اور خالق بھی ہے جو تمہیں رزق دیتا ہو۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ پھر تم کدھر پھرے جا رہے ہو؟

معبودانِ باطل خود مخلوق ہیں جن کی تم پرستش کرتے ہو (وہ انسان ہوں یا مظاہرِ فطرت) وہ خود خدا کے پیدا کردہ ہیں۔

وَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا یَخْلُقُوْنَ شَیْـًٔا وَّ هُمْ یُخْلَقُوْنَ ؕ (۱۶/۲۰)؛ (۲۵-۳۶ /۵۲)۔

اور جن کو یہ لوگ خدا کے سوا پکارتے ہیں، انہوں نے کسی چیز کو پیدا نہیں کیا وہ تو خود پیدا کردہ ہیں!

یہ باطل خدا صرف مٹی اور پتھر کے بُت ہی نہیں بلکہ وہ زندہ خدا بھی ہیں جن کی پرستش ان کی زندگی یا موت کے بعد کی جاتی ہے۔ ان کی بے بسی کے متعلق کہا۔

وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا یَخْلُقُوْنَ شَیْـًٔا وَّ هُمْ یُخْلَقُوْنَ وَ لَا یَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا وَّ لَا یَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّ لَا حَیٰوةً وَّ لَا نُشُوْرًا ○ (۲۵/۳)۔

اور لوگوں نے خدا کے سوا الٰہ تجویز کر رکھے ہیں، جو کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتے، بلکہ وہ خود مخلوق ہیں اور نہ ہی وہ اپنی ذات کے لئے کسی نفع یا نقصان کے مالک ہیں (چہ جائیکہ دوسروں کو نفع پہنچانے کی قدرت رکھتے ہوں) اور نہ ہی ان کو موت یا زندگی پر یا کسی (مردہ) کو دوبارہ زندہ کر دینے پر قدرت حاصل ہے۔

دوسری جگہ فرمایا کہ اگر خدا کے علاوہ کوئی اور خالق بھی ہوتا اور دونوں کی مخلوق آپس میں مل جاتی تو یہ شُبہ

بھی ہو سکتا تھا کہ خالق کوئی اور بھی ہے۔ لیکن جب ایسا نہیں تو پھر دھوکا کیسے لگ سکتا ہے۔

اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰہِ شُرَکَآءَ خَلَقُوْا کَخَلْقِہٖ فَتَشَابَہَ الْخَلْقُ عَلَیْہِمْ ؕ قُلِ اللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ وَّ ھُوَ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ ۝ (۱۳/۱۶)

یا جن کو یہ خدا کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں کیا انہوں نے خدا کی مخلوق کی مانند کچھ پیدا کیا ہے اور اس طرح مخلوق کے بارے میں ان کو کچھ شبہ ہو گیا ہے۔ کہیئے کہ ہر شے کا خالق (صرف) اللہ ہے اور وہ واحد ہے اور یگانہ اور غالب ہے۔

کوئی بڑی شے تو ایک طرف، غیر خدا تو ادنیٰ سے ادنیٰ چیز بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ (دیکھئے ۲۲/۷۳—۷۴) جب یہ تمام اشیاء جنہیں انسان کی غلط نگہی معبود بنا لیتی ہے، خدا کی پیدا کردہ ہیں، تو خالق یقیناً اپنی مخلوق کے متعلق جانتا ہے کہ اس میں کس کس کام کی صلاحیتیں ہیں۔ لہٰذا، جب وہ (خالق) کہتا ہے کہ میری مخلوق میں سے کسی کو اس کی مقدرت نہیں کہ وہ کسی شے کی تخلیق کر سکے، تو یہ حقیقتِ حال کا بیان ہے۔

اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَ ھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ۝ (۶۷/۱۴)

کیا جس نے پیدا کیا ہے وہ نہیں جانتا؟ اور وہ تو بڑا باریک بیں اور پورا باخبر ہے۔

وہ خوب جانتا ہے کہ اس کی مخلوق میں کیا کیا جوہر مضمر ہیں اور اُن کی امکانی حدود کہاں جا کر ختم ہو جاتی ہیں۔

وَ ھُوَ بِکُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمُۨ ۙ (۳۶/۷۹)

اور وہ تمام مخلوق سے خوب واقف ہے۔

واضح رہے کہ ان مقامات میں جہاں کہا گیا ہے کہ کسی غیر خدا میں تخلیق کی قدرت نہیں، تو اس سے مُراد کسی شے کو عدم سے وجود میں لانا ہے۔ ورنہ تخلیق کے جو دوسرے معنی ہیں (یعنی مختلف عناصر میں ترتیب نو سے ایک نئی چیز بنا دینا) تو اس عملِ تخلیق کی انسان میں صلاحیت ہے۔ جب قرآن نے خدا کو اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ (۲۳/۱۴ ؛ ۳۷/۱۲۵) کہا ہے تو اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ خالق، خدا کے علاوہ اور بھی ہو سکتے ہیں۔ البتہ وہ احسن الخالقین ہے، یعنی دوسروں کی تخلیق میں وہ کمالِ حسن و زیبائی اور مکمل توازن و تناسب نہیں ہو سکتا جو خدا کی تخلیق میں پایا جاتا ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ غور کیجئے کہ جب کوئی جماعت ان افراد پر مشتمل ہو جن کی ذات کی نشوونما ہو رہی ہو (یعنی اُن میں صفاتِ خداوندی کی نمود ہو رہی ہو) تو اس جماعت کی پہلی خصوصیت یہ ہو گی کہ وہ خدا کے تخلیقی

پر دگرام میں اس کی رفیق ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جو اقبالؔ نے کہا ہے کہ

ہر کہ اُو را قوتِ تخلیق نیست
نزدِ ما جز کافر و زندیق نیست

مومن کی بنیادی صفت تخلیق ہے اور تخلیق بھی اس انداز کی کہ جس طرح اللہ کی صفت یہ ہے کہ وہ جب کسی شے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔ مومن کی بھی (علیٰ حدِ بشریت) یہ کیفیت ہونی چاہیئے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرے تو یہ ارادہ تکمیل تک پہنچ کر رہے۔ جس طرح اس کا خدا اپنے ارادوں کی تکمیل میں کسی غیر کا محتاج نہیں، اس طرح جماعتِ مومنین کا بھی یہ عالم ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے مقاصد کے حصول میں کسی غیر کی دست نگر نہ ہو۔ یہ جماعت دنیا میں نئے نئے مدّعا، زندہ مقاصد، اور تابندہ آرزوؤں کی تخلیق کا موجب ہو گی۔

مقصد از آسمان بالاترے — دل ربائے، دل ستانے، دل برے
باطلِ دیرینہ را غارت گرے — فتنہ در جیبے، سراپا محشرے

جب اُن کا خدا جمود و تعطّل کا پیکر، پتھر کی مورتی نہیں، بلکہ خلّاق و فعّال ہے، تو کیا انہیں زیب دیتا ہے کہ یہ پتھروں کی سی جامد معطّل زندگی بسر کریں؟ انہیں بھی (بشریت کی وسعتوں کے اندر) خلّاق و فعّال ہونا چاہیئے۔ انہیں اپنی دنیا کا آپ خالق ہونا چاہیئے اور اس جہانِ نو کی تخلیق میں کوئی ان کا شریک و سہیم نہیں ہونا چاہیئے۔ یہی سِرّ مومن ہے۔ یہی "ضمیرِ کُن فکاں" ہے۔ یہی قرآن کا پیغام ہے۔

خیز و خلاقِ جہانِ تازہ شو
شعلہ در بر کن، خلیل آوازہ شو

(اقبالؒ)

٦

ربُوبیّت

معنی

تخلیق کے بعد، پہلا مرحلہ ربوبیت کا ہے۔ یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ "کن فیکون" کے معنی یہ نہیں کہ خدا کے "کن" کہنے سے وہ شے اپنی مکمل شکل میں یک لخت وجود میں آجاتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس سے اس کی تخلیق کے سلسلہ کا آغاز ہو جاتا ہے اور وہ بتدریج مختلف ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی، اپنے نقطۂ تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔ کسی شے کو اس کے نقطۂ آغاز سے بتدریج مقامِ تکمیل تک پہنچانا اور اس کے لئے اس کی پوری پوری نگہداشت کرنا، ربوبیت کہلاتا ہے اور ایسا کرنے والے کو ربّ کہتے ہیں۔ اس کے عام معنی "نشوونما دینے والا" ہوں گے، یعنی ربوبیت کے معنی ہوں گے کسی شے کی ابتدا سے انتہا تک، تمام مراحل میں، اس کی نگہ و پرداخت کرنا، پرورش کرنا، اسے پروان چڑھانا، تکمیل تک پہنچانا۔ قطرے کو گہر ہونے تک، بیج کے درخت بننے تک، آب و گل کے ہیولیٰ (طینِ لازب) کے انسان کی صورت اختیار کرنے تک، راستہ میں جس قدر مراحل آئیں، ان میں اس کی نگہ و پرداخت کرنا۔ اس کے حسبِ حال وہ اسباب مہیا کرنا جو اس کی ضروریات کے کفیل ہوں اور جس پر اس کی زندگی کا انحصار ہو۔ یہ انتظام کہ بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کی پرورش کے لئے دودھ کے چشمے اُبل پڑیں، کسی انسان کے بس کی بات نہ تھی۔ یہ اُس خالقِ کائنات کی شانِ ربوبیت کا کرشمہ ہے۔ پھر اس سلسلۂ ربوبیت کی ان کڑیوں پر بھی غور کیجئے کہ بچہ کی پیدائش سے دو اڑھائی سال کے عرصہ تک، اس کی پرورش کے مقتضیات کے مطابق، اس کی اس غذا میں کس قدر تغیرات خود بخود

ربُوبیت کے کرشمے

واقع ہوتے رہتے ہیں۔ چونکہ ابتداءً بچے کا معدہ نازک ہوتا ہے، اس لئے شروع شروع میں دودھ میں مائیت (یعنی پانی کا حصہ) زیادہ اور دہنیت (چکنائی کے اجزاء) کم ہوتے ہیں۔ جوں جوں بچہ بڑھتا ہے، اس کے معدہ میں زیادہ قوی غذا ہضم ہونے کی صلاحیت آتی جاتی ہے اور اس صلاحیت کے ساتھ ساتھ منزل بہ منزل دودھ میں مائیت کم ہوتی جاتی ہے اور دہنیت زیادہ، حالانکہ دودھ پیدا کرنے کی "مشینری" بھی وہی ہوتی ہے اور جن اجزاء سے ماں کے جسم میں دودھ بنتا ہے، وہ بھی وہی ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ جب بچے میں دوسری غذا ہضم کرنے کی طاقت پیدا ہوجاتی ہے تو دودھ کے یہ چشمے سوکھ جاتے ہیں۔ جن بچوں کو مصنوعی غذا (ARTIFICIAL FEEDING) پر رکھا جاتا ہے، ان کی غذا کے لئے چارٹ تیار کئے جاتے ہیں جن میں بتایا جاتا ہے کہ عمر کے تناسب کے لحاظ سے دودھ اور پانی کی مقدار کا تناسب کس طرح گھٹتا بڑھتا رہے گا۔ اس تناسب کا اصول، فطرت کے اسی قاعدہ پر رکھا جاتا ہے جسے وہ بچے کی غذا کے سلسلہ میں ملحوظ رکھتی ہے۔ اس ایک نظام سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کیا یہ انتظام ایک "اندھی فطرت" کا ہے؟ یعنی اس قدر عقل و فہم، علم و تجربہ کا مالک انسان جس انتظام سے رہنمائی حاصل کرکے بچے کے حسبِ حال غذا تیار کرتا ہے، کیا اس انتظام کی موجدات "ایک اندھی فطرت" ہوسکتی ہے؟ یہ تو صرف ایک مثال ہے ورنہ نظامِ کائنات کے اس وسیع و عریض سلسلہ میں جس شے پر آپ کی نگاہ جائیگی، آپ دیکھیں گے کہ ابتداء سے انتہا تک، ہر منزل میں، اس کی بقاء اور استحکام کے لئے جس قدر سامانِ زندگی کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے حسبِ حال فطرت کی طرف سے سب کچھ موجود ہوتا ہے۔ انسان کی زندگی کے لئے ہوا، پانی، روشنی اور خوراک اجزائے لاینفک ہیں۔ ہوا کا یہ عالم ہے کہ انسان سفر و حضر، پستی و بلندی، دن رات میں جہاں ہو، ہوا کا ذخیرہ خود بخود اس کے ساتھ رہتا ہے اور اسے احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کس وقت سانس لیتا ہے حتیٰ کہ سوتے میں بھی یہ عمل از خود جاری رہتا ہے۔ یہی کیفیت روشنی کی ہے۔ پانی کو ہر مقام پر پہنچانے کے لئے "واٹر سپلائی" کا جو انتظام خدا کے نظامِ ربوبیت نے کیا ہے، اس پر غور کرکے نگہِ بصیرت ورطۂ حیرت میں گم ہوجاتی ہے سورج کی کرنیں سمندر کے کھارے پانی سے صاف اور مقطر پانی کشید کرکے فضا میں لے جاتی ہیں اور کثافتوں کو وہیں چھوڑ جاتی ہیں۔ یہ آبِ زُلال، بادلوں کے مشکیزوں میں بھرا ہوا اِدھر اُدھر اڑتا رہتا ہے اور جہاں ضرورت ہوتی ہے اس مشکیزہ کا منہ کھول دیا جاتا ہے۔ جتنا ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے اسے پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف کے (RESERVOIRS) میں محفوظ کرکے رکھ دیا جاتا ہے جو گرمی کے دنوں میں رفتہ رفتہ میدانوں میں آتا رہتا ہے۔ میدانوں میں جس قدر پانی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ استعمال میں آجاتا ہے اور باقی ماندہ کچھ آگے بڑھ کر پھر سمندر میں جا ملتا ہے اور کچھ زمین میں جذب

ہو کر کنوؤں اور چشموں کی شکل میں محفوظ رہتا ہے۔ کیا یہ انتظام کسی "اندھی فطرت" کے تصور میں بھی آسکتا تھا؟ کیا یہ تمام نظم و نسق یونہی وجود میں آسکتا تھا؟ خوراک کے متعلق دیکھئے کہ اس زمین سے کیا کچھ پیدا نہیں ہوتا اور یہ سب کچھ بلا قیمت ملتا ہے! کسی چیز پر کوئی ٹیکس نہیں، کوئی حدود بندی نہیں۔ شاید یہ کہا جائے کہ انسان کو اپنی زندگی قائم رکھنے کے لئے، ارتباطِ جسم و جاں کی خاطر، جس قدر مصیبتیں اُٹھانی پڑتی ہیں تو اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس پر ہر طرف سے ظلم ہی ظلم کیا گیا ہے۔ لیکن ذرا بہ نگاہِ تعمّق غور کرنے سے آپ از خود اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ

میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے بے دُرد و صاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

غیر خداوندی نظامِ معیشت

خدائے ربّ العالمین کا انتظام تو آسانیوں اور آسائشوں ہی کو لئے ہوئے تھا، لیکن جب انسان نے اسے اپنے قبضہ میں لے لیا اور خدا کے عطا کردہ ذخائر کی تقسیم اپنے مقاصد و مصالح کے مطابق شروع کردی، تو نوعِ انسانی پر مصیبتوں کے بادل اُمنڈ آئے۔ یہ مصائب و مشکلات انسان کی خود ساختہ ہیں۔ اگر سامانِ نشوونما کی تقسیم قوانینِ خداوندی کے مطابق کی جائے تو دیکھئے انسان کیسی جنّت کی زندگی بسر کرتا ہے؟ کس قدر قیامت ہے کہ ایک چیونٹی اور ایک چڑیا تو اپنی زندگی سکون و اطمینان سے بسر کرے اور اشرف المخلوقات انسان کی زندگی دوزخ سے بھی بدتر ہو! بچہ جب تک دایۂ فطرت کی گود میں رہتا ہے اس پر کسی قسم کی تنگی اور عُسرت نہیں آتی (اگر آتی ہے تو وہ بھی انسان کے خود ساختہ نظام کی وجہ سے آتی ہے) لیکن جونہی وہ دُودھ چھوڑ کر انسانی نظام کی دنیا میں پہنچتا ہے، اس پر مشکلات کے پہاڑ گرنے شروع ہو جاتے ہیں۔ قرآن کا مقصد یہ ہے کہ جس نظامِ زندگی کو انسان نے اپنے ہاتھ میں لے کر اس جنّتِ ارضی کو دوزخ بنا دیا ہے، اسے اُن خطوط پر قائم کر دیا جائے جو خدائے ربّ العالمین نے ربوبیتِ عامہ کے لئے متعیّن کئے ہیں۔ یہ قوانین قرآن کی دفتین میں محفوظ ہیں جس کی ابتدا اس آیت سے ہوتی ہے کہ

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۱/۱)
ہر طرح کی حمد اس اللہ کے لئے ہے جو تمام کائنات کا نشوونما دینے والا ہے۔

یعنی قرآن میں سب سے پہلے اللہ کی جس صفت کا ذکر کیا گیا وہ ربوبیت ہے اور یہ ربوبیت کسی خاص نوعِ مخلوق، کسی خاص گروہ، کسی خاص قوم کی نہیں، بلکہ ساری دنیا کی ربوبیت، تمام سلسلۂ کائنات کی ربوبیت ہے۔

قرآنِ کریم میں قریب چالیس مرتبہ ربّ العٰلمین کے الفاظ کا اعادہ ہوا ہے تاکہ اس ہمہ گیر نظامِ ربوبیت کی اہمیت قلبِ انسانی پر اچھی طرح سے مرتسم ہو جائے۔ اسی کی تفصیل میں دوسری جگہ ہے۔

قَالَ فِرْعَوْنُ وَ مَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۝ (۲۶/۲۳-۲۴)

فرعون نے (حضرت موسیٰ سے) پوچھا کہ ربّ العالمین کون ہے (حضرت موسیٰ نے کہا) کہ وہ اجرامِ سماوی اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب ہے۔ اگر تم یقین کرو تو!

قریب پندرہ مختلف مقامات پر ربوبیتِ کائنات کی اس حقیقت کو مختلف انداز سے دہرایا گیا ہے۔ کہیں نوعِ انسانی کی ربوبیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ربّ النّاس

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ (۱۱۴/۱)

کہیئے کہ میں خدائے ربّ النّاس کے قوانین کی حفاظت میں آنا چاہتا ہوں۔

کہیں ان تمام تفصیلات کو سمیٹ کر ایک ٹکڑے میں سمو دیا کہ وہ "تمام اشیاء" کا ربّ ہے۔

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّ هُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ۭ..... (۶/۱۶۵)

کہو کہ کیا میں اللہ کے سوا کسی اور ربّ کی تلاش کروں حالانکہ وہ تو ہر شے کا ربّ ہے

رَبُّ کُلِّ شَیۡءٍ

ہر شئے کا خالق بھی وہی ہے اور ہر شئے کا ربّ بھی وہی ہے۔ اس محیر العقول کارگہِ عالم میں ایک ذرّۂ ناچیز سے لے کر ان عظیم الشّان کرّوں تک اور ان سے بھی آگے خدا جانے کہاں کہاں تک، ہر شئے کی ابتدا سے انتہا تک، ہر مرحلۂ زندگی میں اس کی نشوونما کے تمام سامان مہیّا کرنا، ہر شئے کی نگہداشت کرنا اسی خدائے ربّ العٰلمین کے شایانِ شان ہے۔ مثلاً قرآنِ کریم میں ہے:۔

رَبُّ العرش

رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ [1] ۝ (۲۳/۱۱۶)

عرشِ کریم کا مالک!

---

[1] اس کا قریب چھ مرتبہ اعادہ ہوا ہے۔

یعنی قوتوں کے اس مرکز کا مالک جہاں سے یہ تمام نظامِ کائنات اس حُسن و خوبی کے ساتھ چل رہا ہے، اللہ ہی ہے۔ تمام موجودات کی تخلیق، ربوبیت اور نظم و نسق، صرف اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ نظامِ فطرت کے مختلف شعبوں اور متنوّع گوشوں کے متعلق بھی مختلف آیات میں اشارہ فرمادیا کہ ان تمام کا مالک و مختار خدا ہے۔

نظامِ فطرت کا رب

وَ اَنَّہٗ ھُوَ رَبُّ الشِّعۡرٰیۙ (۵۳/۴۹)۔

اور ستارۂ شعریٰ (SIRIUS) کا رب وہی ہے[1]۔

سورۂ الرحمٰن میں ہے۔

رَبُّ الۡمَشۡرِقَیۡنِ وَ رَبُّ الۡمَغۡرِبَیۡنِ ۚ (۵۵/۱۷)۔

مشرقین اور مغربین کا رب۔

دوسری جگہ اسے رَبُّ الۡمَشَارِقِ کہا گیا ہے (۳۷/۵)۔ سورۂ معارج میں ربُّ المشارق والمغارب (۷۰/۴۰) اور ایک جگہ ربُّ الفلق (۱۱۳/۱)۔ اسی طرح مرکزِ اسلام، یعنی مکۂ معظمہ کا بھی رب کہا گیا ہے (۲۷/۹۱) اور ربُّ العزّت بھی (۳۷/۱۸۰)، یعنی غلبہ و اقتدار کا مالک۔

جیسا کہ اُوپر لکھا جا چکا ہے، اگر دنیاوی نظامِ معیشت و معاشرت کو قوانینِ خداوندی کے مطابق چلایا جائے، تو سامانِ زندگی کے متعلق انسان کو کبھی کوئی دقت اور مشکل پیش نہیں آسکتی۔ اسی کے معنی ہیں، اللہ کو اپنا رب تسلیم کرنا، یعنی اپنے معاشرہ کو اُس کے نظامِ ربوبیت کے مطابق متشکّل کرنا۔ جماعتِ مومنین کی زندگی کا شعار و مقصد یہی ہے۔ اسی کا اعلان نبیِ اکرمؐ کی زبان سے ان الفاظ میں کردیا گیا کہ

قُلۡ اَغَیۡرَ اللّٰہِ اَبۡغِیۡ رَبًّا وَّ ھُوَ رَبُّ کُلِّ شَیۡءٍ ؕ (۶/۱۶۵)۔

کہیئے کہ کیا میں اللہ کے سوا کسی اور رب کی تلاش کروں۔ حالانکہ وہ تو ہر شئے کا ربّ ہے!

اس ربوبیت میں اور کوئی اس کا شریک نہیں۔

یَھۡدِیۡۤ اِلَی الرُّشۡدِ فَاٰمَنَّا بِہٖ ؕ وَ لَنۡ نُّشۡرِکَ بِرَبِّنَاۤ

---

[1] اس کے معنی عقل و شعور بھی ہوسکتے ہیں۔

اَحَدًا ؒ (۷۲/۲)۔

(وہ قرآن) جو سیدھے راستے کی طرف راہ نمائی کرتا ہے۔ سو ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور ہم اپنے ربّ کے ساتھ اور کسی کو شریک نہیں قرار دیتے۔

یعنی ہمارے معاشرہ کا نظام خالص خدا کے قوانینِ ربوبیت کے مطابق ہوگا۔ یہ نہیں کہ کچھ اجزا ان قوانین سے لے لئے اور کچھ انسانی تصوّرات سے اور اس طرح ان کے امتزاج سے ایک ضابطۂ قوانین مرتب کر لیا۔ یہ کھلا ہوا شرک ہے جس کی اسلام میں قطعاً اجازت نہیں۔ بندۂ مومن خدا کے نظامِ ربوبیت میں کسی اور کو شریک نہیں کر سکتا۔ چنانچہ سورۂ کہف میں ایک عبدِ مومن کی مثال بیان کی گئی ہے جو کہتا ہے کہ

لٰكِنَّا هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَ لَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ○ (۱۸/۳۸)

"لیکن میرا ربّ تو اللہ ہے جس کے ساتھ میں کسی اور کو شریک نہیں ٹھہراتا۔"

یہ عقیدہ کہ پیدائش کسی اور خدا (برہما) کے ہاتھ میں ہے اور ربوبیت کسی اور خدا (وشنو) کے ہاتھ میں، خدا کی حقیقت سے بے خبری کی دلیل ہے۔ سب کچھ اسی ایک خدا نے پیدا کیا ہے اور وہی ان سب کو مراحلِ زندگی طے کرا کے تکمیل تک پہنچانے والا ہے۔

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ○ج (۴۱/۹)۔

کہو کہ کیا تم ایسی ذات سے انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو مراحل میں پیدا کیا اور تم اس کے ساتھ اوروں کو شریک ٹھہراتے ہو۔ (حالانکہ) وہ تمام کائنات کا ربّ ہے۔

ربوبیت نہ کسی دیوی دیوتا کے ہاتھ میں ہے، نہ کسی انسان کے۔ یہ حقیقت کسی تشریح کی محتاج نہیں کہ انسان کسی دوسرے انسان کے سامنے جھکتا اس وقت ہے جب وہ سمجھتا ہے کہ میری ضروریاتِ زندگی اس کے قبضہ میں ہیں۔ مبدارِ فیض کی کرم گستری نے رزق کے سرچشمے تمام انسانوں کے لئے بلامزد و بلامعاوضہ سطحِ زمین کے وسیع و عریض دسترخوان پر پھیلا دیئے ہیں۔ (سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ○ (۴۱/۱۰) ہر ضرورتمند کے لئے یکساں طور پر)۔ لیکن مستبد قوتیں ان سرچشموں کو اپنی ملکیت میں لے لیتی ہیں اور اس کے بعد جو جی میں آئے بھوکے انسانوں سے کرا لیتی ہیں۔ فرعون نے اپنے دعوئے "خدائی" کے ثبوت میں ہی کہا تھا کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ؗ (۷۹/۲۴) (میں تمہارا سب سے بڑا پرورش کرنے والا ہوں)۔ اور ایک فرعونِ موسیٰ ہی پر کیا موقوف ہے

ہر زمانے کے فرعون اپنی "خدائی" کو مستحکم رکھنے کے لئے یہی کچھ کرتے ہیں۔ قرآن دنیا سے استبداد مٹانے کے لئے آیا ہے، چنانچہ اس نے قریب ساڑھے نو سو مرتبہ اس حقیقت کو مختلف اسالیب و انداز سے دہرایا ہے کہ تمہارا رب صرف اللہ ہے۔ ربوبیت کسی اور کے اختیار میں نہیں۔ تم جو سمجھ رہے ہو کہ سازوسامانِ زندگی مستبد قوتوں کے قبضۂ قدرت میں ہے، تو یہ صرف اس وقت تک ہے جس وقت تک تم ایسا سمجھ رہے ہو۔ جس وقت تم ایسا سمجھنا چھوڑ دو گے (یَکْفُرُ بِالطَّاغُوْتِ) اور اس پر ایمان لے آؤ گے کہ ربوبیت کی مالک وہی ذاتِ خداوندی ہے (یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ) تمہارے اندر انقلاب پیدا ہو جائے گا۔ تمہاری نگاہوں کے زاویے بدل جائیں گے اور جب تمہاری نفسیاتی کیفیت میں ایسا تغیر واقع ہو جائے گا، تو دنیا کی کوئی قوت تم سے اپنی "خدائی" کا اقرار نہ لے سکے گی کہ

این صنم تا سجدہ اش کردی خداست

چوں یکے اندر قیام آئی فناست (اقبالؒ)

اللہ کو رب ماننے والوں کی تو کیفیت ہی عجیب ہوتی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○ (۴۱/۳۰)۔

"جن لوگوں نے کہہ دیا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس (ایمان) پر جم کر کھڑے ہو گئے، ان پر (تسکین و طمانیت کے) فرشتے نازل ہوتے ہیں (جو کہتے ہیں کہ) مت خوف کھاؤ، بالکل نہ گھبراؤ اور اس جنت کی بشارت لو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔"

سورۂ احقاف میں ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَ لَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ج (۴۶/۱۳)۔

یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اس ایمان پر جمے رہے تو ان پر کسی قسم کا خوف اور حزن نہ ہو گا۔

حقیقی آزادی | قلبِ انسانی جب ایسے ایمانِ محکم کا مسکن ہو جاتا ہے تو پھر انسان اللہ کے سوا کسی کے

سامنے نہیں جھکتا۔ اس کے دروازہ کے علاوہ اور کسی آستانہ پر جھولی نہیں پھیلاتا اور اس کے سوا کسی کا غلام نہیں رہتا۔ یہ خود اس ربِ حقیقی کا ارشاد ہے۔

وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ...... (۱۷/۲۳)

اور تیرے رب کا یہ حکم ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی محکومی اختیار نہ کرو!

لہٰذا خدا کی ربوبیت پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے سوا کسی اور کی محکومی اختیار نہ کی جائے۔ دنیا میں ہر صاحبِ قوت کو آقا سمجھ کر اس کے سامنے جھک جانا، جو بلند ڈیوڑھی نظر آئے وہاں جھولی پھیلا دینا خودی کی تذلیل ہے، ننگِ انسانیت ہے۔ حضرت یوسفؑ نے اپنے قیدخانہ کے ساتھیوں سے یہی کہا تھا۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ؕ (۱۲/۳۹)

اے قیدخانہ کے رفیقو! کیا بہت سے آقا (رب) اچھے ہیں یا صرف ایک اللہ جو بڑی قوتوں کا مالک ہے۔

غلامی کی زنجیریں

لیکن انسان اپنے قید و بند کے اسباب و ذرائع کو ایک ہی مقام تک محدود تھوڑا رکھتا ہے؟ یہ مختلف گوشوں سے غلامی کے طوق خریدتا ہے۔ اگر ایک زنجیر اُسے زبردستی پہنائی جاتی ہے تو دس زنجیریں یہ خود پہن لیتا ہے۔ یہ وہ زنجیریں ہیں جو تقدس اور عقیدت کے راستے اس کے قلب و ذہن پر مسلط ہوتی ہیں۔ قرآن نے متعدد مقامات پر ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جنہیں واضح طور پر کہہ دیا گیا تھا کہ صرف ایک خدا کو اپنا رب تسلیم کرنا، لیکن انھوں نے خدا سے ورے انبیاء اور ملائکہ ہی کو اپنا رب قرار دے لیا۔

وَ لَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَ النَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ؒ (۳/۷۹)

(ایک ربانی انسان) تمہیں یہ کبھی نہیں کہے گا کہ تم ملائکہ اور انبیاء کو رب بنالو۔ کیا وہ تمہیں اسلام لانے کے بعد کفر اختیار کرنے کا حکم دے گا!

وہ اس سے بھی آگے بڑھے اور اپنے علماء و مشائخ کو اپنا آقا تسلیم کر لیا۔

اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ

دُوْنِ اللّٰہِ (۹/۳۱)۔

"انہوں نے خدا سے ورے اپنے علماء و مشائخ کو ہی اپنا آقا (ربّ) بنالیا!"

علماء و مشائخ کی عبودیت

علماء و مشائخ کو آقا تسلیم کرنا اس کے سوا کیا ہے کہ اُن کے اقوال کو بلا دلیل و حجت، وحیٔ منزّل کی طرح واجب التسلیم مان لیا جائے اور ان کے اعمال کو تنقید کی حد سے بالا قرار دے دیا جائے اور انہیں ان باطنی قوّتوں کا مالک تصوّر کر لیا جائے جو ذاتِ خداوندی کے لئے مختص ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جب ہم قرآنِ کریم کی ان آیات کو پڑھتے ہیں تو یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ یہ اُمم سابقہ کے قصّے ہیں، ہم سے ان کا کوئی تعلق نہیں، حالانکہ قرآنِ کریم اتاریخی قصص کو اس لئے بیان نہیں کرتا کہ اس "داستان گوئی" سے (نعوذ باللہ) ہمارے سُلانے کا سامان فراہم کرے۔ وہ مللِ سابقہ کے قصص و شواہد اور اُمم گذشتہ کے احوال و ظروف سے ملّتِ اسلامیہ کے اندر زندگی پیدا کر کے اسے بتانا چاہتا ہے کہ پہلی قومیں ہلاکت و تباہی کی ان گھاٹیوں پر جا کر پھسلی تھیں، اس لئے کہیں تم بھی ان گھاٹیوں پر پہنچ کر نہ پھسل جانا۔ لیکن آج جو ہماری حالت ہے، وہ ظاہر ہے۔ وہی مسلمان جس سے کہا گیا تھا کہ وہ اہلِ کتاب کو یہ دعوت دے کہ

تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ (۳/۶۳)۔

"آؤ ایک ایسے نقطہ پر (جمع ہو جائیں) جس کے ماننے کے تم بھی دعویدار ہو اور جس کی طرف ہم بھی دعوت دیتے ہیں، یعنی اللہ کے سوا کسی اور کی عبودیت اختیار نہ کی جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنایا جائے اور خدا سے ورے ہم ایک دوسرے کو اپنا آقا (ربّ) تسلیم نہ کریں"....!

اسی مسلمان کی حالت یہ ہے کہ

ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

قرآن کی تو تعلیم ہی یہ تھی کہ خدا کے سوا کسی اور کی عبودیت اختیار نہ کی جائے، حتیٰ کہ حضرات انبیائے کرامؑ جن کی ہستی خدا کے بعد افضل ترین ہے، وہ بھی خدا ہی کی عبودیت کی طرف دعوت دیتے تھے۔ اپنی عبودیت نہیں سکھاتے تھے۔

ربّانیّین

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۙ (۳/۷۸)۔

"کسی انسان کے لئے یہ سزاوار نہیں کہ اللہ اسے کتاب اور حکومت اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میری محکومیت اختیار کر لو۔ نہیں (بلکہ وہ تو یہی کہے گا کہ) تم صرف اللہ کو ربّ تسلیم کرو (ربانی بن جاؤ) بذریعہ اس کتاب کے جس کی تم تعلیم دیتے ہو جس پر غور و فکر کرتے ہو۔"

لیکن اس حقیقت کو پھر سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ کو ربّ تسلیم کرنے کا عملی مفہوم یہ ہے کہ ہم اپنا نظام خدا کے قوانین کے مطابق متشکل کریں۔ اس کے سوا خدا کو رب تسلیم کرنے کی اور کوئی شکل نہیں۔ یہی وہ نظام ہے جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج نہیں رہتا، لہٰذا کسی کی محکومی اختیار نہیں کرتا۔ جس جماعت کے ہاتھوں اس قسم کا نظامِ ربوبیت قائم ہوتا ہے وہ ربانیّین کی جماعت کہلاتی ہے۔ ان میں ہر فرد دوسروں کی ربوبیت کی فکر کرتا ہے اور اس طرح تمام افرادِ انسانیہ کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ "نشوونما" میں ان کی جسمانی پرورش بھی شامل ہے اور تمام مضمر انسانی صلاحیتوں کی تکمیل بھی۔ اسلامی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ اسی نظامِ ربوبیت کا قیام ہے۔ (تفصیل میری کتاب "نظامِ ربوبیت" میں ملے گی)۔ ربوبیت ایک نشوونما یافتہ ذات کی اہم خصوصیت ہے اور اس کا اظہار، جماعتِ مومنین سے از خود ہوتا ہے۔

(چونکہ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، قرآنِ کریم میں ربّ کا لفظ ساڑھے نو سو مرتبہ آیا ہے، اس لئے ان تمام آیات کا اندراج مشکل ہے۔ وہ آیات دیگر مقامات پر آجائیں گی۔

(۷)

رزّاقیّت

وہ سامانِ زیست جو کسی طرف سے عطیۃً ملے، رزق کہلاتا ہے۔ لیکن اس کے بنیادی معنوں میں ایک خصوصیت ہے اور وہ یہ کہ وہ شے ضرورت کے مطابق عین وقت پر ملے، لہٰذا، رزق سے مراد وہ سامانِ نشو و نما ہے جو خدا کی طرف سے ہر شے کی ضرورت کے مطابق، بلا مزد و معاوضہ ملتا ہے۔ واضح رہے کہ "رزق ملنے" کے معنی یہ نہیں کہ پکی پکائی روٹی انسان کے منہ میں ڈال دی جاتی ہے۔ رزق سے مراد یہ ہے کہ انسان کی طبیعی ضروریات کا تمام سامان، زمین میں موجود ہے جسے ہر ضرورتمند حاصل کر سکتا ہے۔ یہ وسیع و عریض دامنِ ارض اُس خدائے رزّاق کی نعمائے گوناگوں کا دسترخوان (مائدہ) ہے جو اس کی مخلوق کے لئے یکساں طور پر بچھا ہوا ہے۔ جس نے مخلوق کو پیدا کیا ہے، اس نے اس کے رزق کا انتظام بھی خود ہی کر رکھا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ (۳۰/۴۰)

"اللہ وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ وہی تمہیں رزق عطا فرماتا ہے۔ پھر تمہیں موت دے گا۔ اس کے بعد پھر زندہ کرے گا۔ کیا تمہارے ٹھہرائے ہوئے خداؤں میں سے کوئی ہے جو اس میں سے کچھ بھی کر سکے؟"

زمین و آسمان سے رزق

نظامِ کائنات کو اس نے اس انداز سے ترتیب دے رکھا ہے اور یہ اس نہج سے اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں سرگرداں ہے کہ رزق کے

تمام سامان واسباب انسان کے سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ..... (۲/۲۲)۔

"اللہ وہ ہے جس نے زمین کو تمہارے لئے فرش کی طرح بچھا دیا اور فضا میں کرے بکھیر دیئے اور (وہی ہے) جو آسمان سے پانی برساتا ہے۔ جس سے (طرح طرح کے) پھل تمہاری غذا کے لئے پیدا ہو جاتے ہیں۔

آسمان کی بلندیوں پر پانی کے ذخائر جمع کر کے ان کے ذریعے زمینِ مردہ سے زندگی بخش رزق پیدا کرنا، یہ سب اسی کی صفتِ رزاقی کے کرشمے ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ...... (۱۴/۳۲)۔

"اللہ وہ ہے جس نے زمین اور آسمان کو پیدا کیا اور آسمان (کی بلندیوں) سے پانی برسایا (جس سے) تمہارے لئے (مختلف) پھل پیدا کئے۔

بارش ذریعۂ پیدائشِ رزق بھی ہے اور بجائے خویش رزق بھی، کہ رزق کا لاینفک حصہ پانی ہے۔

......وَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا...... (۴۵/۵)۔

اور جو (پانی) اللہ نے آسمان سے (بطور) رزق نازل فرمایا اور جس سے زمینِ مردہ کو پھر سے زندگی مرحمت فرمائی۔

زندگی کا اولین سرچشمہ بھی پانی ہے اور اس کی بقار کا موجب بھی۔ جوئے حیات کی مسلسل روانی اسی کی برکت سے ہے۔

وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ

(۲۱/۳۰) نیز (۱۱ – ۵۰/۹)

اور پانی سے ہم نے ہر شے کو زندگی عطا فرمائی۔

رزق کا یہ نظام اُسی خالقِ ارض و سما کی تدبیرِ امور کے ذریعے قائم ہے اور اس حقیقت سے

نظامِ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے

کسی کو مجالِ انکار نہیں زبان سے خدا کا انکار کرنے والا مادّہ پرست بھی اس امر کا اقرار کرے گا کہ یہ نظام انسان کا قائم کردہ نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اس نظام کا نام "قوانینِ فطرت" (LAWS OF NATURE) رکھ دے۔ لیکن اس سے کون انکار کرے گا کہ "قوانین" بلا کسی بالارادہ قوت کے نافذ العمل نہیں ہو سکتے۔ اسی ذات کا نام **اللہ** ہے۔

قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ...... وَمَنْ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ...... (۱۰/۳۱)

"(اے رسول) ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو تمہیں زمین و آسمان (کی بخشائشوں کے ذریعے) رزق دیتا ہے؟.... اور وہ کون ہے جو کارگہ ہستی کا انتظام کر رہا ہے؟ یہ بھی کہیں گے کہ وہ اللہ ہے"۔

قرآن کریم اپنے مخصوص اندازِ استدلال سے، کائنات کے محیّر العقول نظام کو سامنے لا کر ذہنِ انسانی کو توحیدِ الٰہی کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ نظامِ عالم کی حیرت فروشی انسان کو اس نتیجہ تک پہنچا دیتی ہے کہ اس نظام کے پیچھے ایک صاحبِ اختیار و ارادہ مشیّت کارفرما ہے اور اس کی یک جہتی اور ہم آہنگی اس پر دلالت کرتی ہے کہ وہ صاحبِ مشیّت ذات "**واحد**" ہے، یگانہ ہے، یعنی تمام کائنات میں ایک قانون نافذ العمل ہے۔

اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ؕ ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (۲۷/۶۴) و (۳۵/۳)۔

"وہ کون ہے جس نے تخلیق کی ابتدا کی ہے اور پھر اسے گردشیں دے رہا ہے اور وہ کون ہے جو تمہیں زمین و آسمان سے رزق دیتا ہے۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا اِلٰہ بھی ہے؟ (اے رسول ان سے) کہو کہ (اگر تم اپنے دعوئے شرک) میں سچے ہو تو اس کی کوئی دلیل پیش کرو۔

رزق کا اختیار کسی اور کو حاصل نہیں

یہ تو تھا اس عقیدہ کا ایجابی پہلو کہ رزق صرف خدا ہی دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا سلبی پہلو بھی

نمایاں کردیا کہ اس کے سوا رزق کا کوئی داتا نہیں۔ ان دونوں ٹکڑوں کے ملنے سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔

وَ یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ شَیْــٴًـا وَّ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ (۱۶/۷۳)۔

"یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ایسی ہستیوں کی محکومی اختیار کرلیتے ہیں جو زمین آسمان سے رزق دینے کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتے اور نہ ہی انھیں کسی بات کی قوت حاصل ہے"۔

قرآن نے اس مختصر سی آیت میں ان تمام "خداؤں" کی نفی کردی جن کی محکومی اور غلامی اس لئے اختیار کی جاتی ہے کہ انسان (بزعمِ خویش) یہ سمجھتا ہے کہ رزق کا عطا کرنا اُن کے اختیار میں ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ خواہ دورِ "توہم پرستی" کے دیوی دیوتا ہوں یا عہدِ "تہذیب و تمدن" کے "انسانی خدا"، رزق کسی کے ہاتھ میں نہیں، صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے اور جب رزق وہیں سے عطا ہوتا ہے تو پھر اس کے سوا کسی اور کی محکومی اور غلامی کیسی؟

اِنَّ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا یَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَ اعْبُدُوْهُ وَ اشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ (۲۹/۱۷)

"جن ہستیوں کی تم اللہ کے سوا محکومیت اختیار کرتے ہو، وہ تمہارے رزق پر کوئی اختیار نہیں رکھتیں۔ سو رزق اللہ ہی کے ہاں سے طلب کرو اور محکومی بھی اسی کی اختیار کرو اسی کے شکر گزار ہو کہ زندگی کی ہر گردش اس کے قانون کے گرد ہوتی ہے"۔

اگر وہ رزق کے سرچشموں کو بند کردے تو انھیں کوئی قوت کھول نہیں سکتی۔

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ یَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ (۶۷/۲۱)

"اگر (اللہ) ذرائع رزق کو بند کردے تو وہ کون ہے جو تمہیں رزق دے سکے؟"

تمام ذرائع رزق کا بند ہونا تو ایک طرف، اگر اس انتظام میں ہی ذرا سا فرق آجائے کہ سمندر سے صاف اور شفاف پانی اوپر اُٹھ کر بادل بن جاتا ہے اور اس کی تمام کثافتیں (جو اس کے کھارے پن کی ذمہ دار ہیں) سمندر میں رہ جاتی ہیں۔ اگر اس انتظام میں فرق آجائے اور سمندر کا پانی جیسا ہے ویسا ہی بادل بن کر زمین پر برسنے لگ جائے تو سوچئے کہ اتنے سے فرق سے دنیا کی حالت کیا سے کیا ہو جائے۔

وہ اس حسنِ انتظام سے انسانوں کو رزق دیتا ہے اور اس کے بدلے میں ان سے کچھ نہیں چاہتا۔

لَا نَسْــٴَـلُكَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ؕ..... (۲۰/۱۳۲)۔

ہم تجھ سے رزق نہیں مانگتے بلکہ تجھے تو رزق ہم ہی دیتے ہیں۔

رازقِ حقیقی اور "خدایانِ باطل" میں یہی فرق ہے۔

آں خدا نانے دہد جانے دہد
ایں خدا نانے دہد جانے بَرَد

رزق طیب

اللہ نے جتنی چیزیں بطورِ رزق پیدا کی ہیں، وہ پاکیزہ ہیں، طیب ہیں، عمدہ ہیں، سوائے ان کے جن کے کھانے سے خدا نے خود ہی منع کر دیا ہے۔ لہٰذا جن چیزوں کو خدا نے حلال و طیب قرار دیا ہے کسی کو حق حاصل نہیں کہ انھیں حرام و خبیث ٹھہرا دے۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ...... (۷/۳۲)۔

"اے رسول! تم ان اربابِ شریعت اور ارکانِ مسلکِ خانقاہیت سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو اُن زیب و زینت کی چیزوں اور خوشگوار اشیائے خورد و نوش کو جنہیں خدا نے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے، حرام قرار دینے کا اختیار رکھتا ہے؟

دوسری جگہ ہے۔ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ (۱۶/۷۲) اللہ نے تمہارے لئے عمدہ چیزوں کا رزق پیدا کیا ہے (نیز ۴۰/۶۴)۔ لیکن جو چیزیں اس نے حلال و طیب، پاکیزہ اور مفید پیدا کی ہیں، انھیں انسان اپنی دست اندازی سے حرام اور ضرر رساں بنا لیتا ہے۔ طیب سے خبیث، مفید سے مضر بننے کی بعض مثالیں تو

طیب، خبیث کیسے بن جاتا ہے

بالکل واضح ہیں۔ پانی یکسر حیات بخش ہے لیکن جب اس میں زیادتی کی جائے، حد سے بڑھ جائے، تو یہی پانی ہلاکت کا موجب بن جاتا ہے لہٰذا ہر شے کے استعمال میں اس کے متعین اندازہ کو پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس "اندازہ" کی حدود سے تجاوز کرنے کو اسراف کہتے ہیں جو ہلاکت انگیز ہوتا ہے۔ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَ لَا تُسْرِفُوْا ؕ (۷/۳۱) (کھاؤ، پیو لیکن حد سے نہ بڑھو) دوسری جگہ فرمایا کہ اللہ نے تمہارے لئے مختلف اقسام کے پھل پیدا کئے ہیں، سو ان پھلوں کو کھاؤ اور جب فصل کاٹو تو اس میں سے اس کا حق بھی ادا کرو۔ وَ لَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۙ (۶/۱۴۱)۔ اور زیادتی مت کرو کیونکہ وہ زیادتی کرنے والوں کو پسند

نہیں کرتا۔ یہ وہ قانون شکنی ہے جس کے اثرات و نتائج بدیہی طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ لیکن بعض صورتیں ایسی بھی

حدود اللہ کی پاسداری

ہیں جہاں قانون شکنی کے نتائج و عواقب فوراً سامنے نہیں آتے اور انسان انہیں بیّن طور پر محسوس نہیں کرتا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں کسی دیدہ ور کی راہ نمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ گردے میں پتھری ایک دن میں پیدا نہیں ہو جاتی۔ وہ مہینوں اور بعض اوقات برسوں کے غیر محسوس تدریجی عمل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس دوران میں مریض کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ جن چیزوں کو وہ نہایت مفید سمجھ کر کھا رہا ہے، وہ اس کے لئے کس قدر مہلک بنتی جا رہی ہیں۔ یہاں ایک طبیب کی ضرورت ہے جو آثار و علل سے تشخیص کر کے بتا دے کہ کون کونسی چیزیں اس کیلئے مضر ہیں، وہ طبیب اس کے لئے بعض چیزیں تو مستقلاً بند کر دے گا کیونکہ وہ اس مریض کے مزاج سے موافقت نہیں رکھ سکتیں اور بعض چیزوں کو خاص ترکیب سے کھانے کی اجازت دے گا۔ مریض کو اپنی تندرستی کے لئے سب سے پہلے اس طبیب کی حذاقت پر یقین رکھنا ضروری ہوگا اس یقین کے بعد اس کی ہدایات پر پورا پورا عمل کرنا ہوگا۔ (صرف نسخہ کو احتیاط سے سنبھال رکھنے یا پڑھ لینے سے فائدہ نہیں ہوگا) اگر وہ ایسا نہیں کریگا تو اسے صحت نصیب نہیں ہو سکتی۔

یہ مثال جسمانی صحت سے متعلق ہے۔ لیکن انسان کے لئے جسمانی امراض اتنے مہلک نہیں ہوتے جتنے مہلک وہ امراض ہوتے ہیں جو اس کی ذات (PERSONALITY) کے لئے نقصان رساں ہوتے ہیں۔ جسمانی امراض سے تو اس کی موجودہ زندگی ہی اجیرن ہوتی ہے لیکن اس دوسری قسم کے امراض سے اس کی موجودہ زندگی اور اس کے بعد کی آنے والی زندگی دونوں مسلسل جہنم بن جاتی ہیں۔ لہٰذا قرآنِ کریم جو انسان کے لئے پوری زندگی کا ضابطہ ہے، ایک طبیبِ حاذق اور معالجِ مشفق کی طرح مکمل ہدایات دیتا ہے۔ اس اعتبار سے بعض چیزیں تو ایسی ہیں جن کے متعلق اس کا فیصلہ ہے کہ وہ مزاجِ انسانیت کے سازگار نہیں، اس لئے حکم دے دیا کہ ان کے قریب بھی نہ جاؤ۔ بعض ایسی ہیں جن کے متعلق اس کا ارشاد ہے کہ یہ چیزیں فی ذاتہٖ مفید اور طیّب ہیں لیکن

حلال و حرام کا تعیّن!

ان کے طریقِ استعمال سے ان کے اثرات میں فرق آجاتا ہے۔ اپنے باغ سے پھل توڑ کر کھاؤ تو حلال و طیّب، لیکن دوسرے کے باغ سے چُرا کر کھاؤ تو وہی پھل حرام و خبیث، یعنی دونوں پھل ایک ہی قسم کے ہیں، ایک ہی طرح کا ان کا مزاج ہے۔ مادّی اجزاء کا تجزیہ کرو تو دونوں کے عناصر ترکیبی میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن "طریقِ استعمال" کے فرق سے تاثیر میں زندگی اور موت کا سا فرق پڑ جائے گا۔ ایک مادہ پرست اس فرق کو نہیں سمجھتا۔ وہ کہتا ہے کہ ایک ڈاکو کے روپے سے بھی

اُسی قسم کی چیزیں.... خریدی جا سکتی ہیں جیسی ایک مزدور کے روپے سے. اس فرق کو سمجھنے کے لئے (جیسا کہ پہلی مثال میں بیان کیا گیا ہے)۔ طبیب کی حذاقت پر یقین ضروری ہے. اسی کو ایمان کہتے ہیں. یہی ایک مادہ پرست کے دل سے مفقود ہوتا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج انسانی زندگی کے کسی گوشے میں "صحت" نظر نہیں آتی. سارا یورپ اور اس کی وجہ سے تمام دنیا، ایک ایسی جہنم بن رہی ہے جس کے شعلے انسانیت کو راکھ کا ڈھیر بنائے جا رہے ہیں۔

واضح رہے کہ "طبیب کی حذاقت" پر یقین شروع میں تو "بن دیکھے ایمان" کی شکل میں ہوتا ہے. لیکن اس کے بعد، اس کے علاج کے نتائج، اس "ان دیکھے ایمان" کو علیٰ وجہ البصیرت یقین میں بدل دیتے ہیں۔

بہرحال، قرآن ایک طبیبِ مشفق کی طرح تاکید کرتا ہے کہ جو کچھ خدا نے بطور رزق دیا ہے اسے طیّب طریق سے کھاؤ، حرام انداز سے نہ کھاؤ۔ یعنی پہلے تو یہ کہ رزق کی حِلّت و حُرمت کے متعلق خود ہی فیصلہ کرنے نہ بیٹھ جاؤ بلکہ جو فیصلہ تمہارے "طبیبِ مُطلق" نے کیا ہے اسی فیصلہ کے مطابق عمل کرو۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا ؕ قُلْ ءٰٓاللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ۝ (۱۰/۵۹)

"ان سے پوچھو کہ کیا تم نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ جو روزی اللہ نے تمہارے لئے پیدا کی ہے تم نے (محض اپنی قیاس آرائیوں کی بنا پر) بعض کو حرام ٹھہرا دیا بعض کو حلال. پوچھو کہ کیا تمہیں اللہ نے اس امر کی اجازت دی ہے، یا تم اس پر یونہی بہتان باندھتے ہو؟"

جن چیزوں کو خدا نے حلال قرار دیا ہے انہیں "بہ طریقِ طیّب" کھانے میں ایک اور نکتہ بھی پوشیدہ ہے. اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ضروری نہیں کہ ایک شخص ساری دنیا کی حلال چیزوں کو بالضّرور کھائے. "طیّب" کے معنی ہیں خوشگوار، عمدہ نتائج مرتب کرنے والا. لہٰذا، حلال چیزوں میں سے جو چیز کسی کو اچھی نہ لگے مزاج کے مطابق نہ ہو یا وہ مضرِ صحت ہو، اسے نہیں کھانا چاہیئے. کسی چیز کو اس طرح نہ کھانا اور اسے حرام سمجھنے میں جو فرق ہے، وہ ظاہر ہے۔

(نیز دیکھئے ۲/۵۷؛ ۲/۱۷۲؛ ۵/۸۸؛ ۷/۱۶۰؛ ۱۶/۱۱۴؛ ۲۰/۸۱)۔

اُوپر کہا جا چکا ہے کہ حصولِ رزق کے طریق کی نسبت سے رزق کی نوعیّت اور اس کے اثرات کی کیفیت بدل جاتی ہے. جائز طریق سے حاصل کیا جائے تو رزق، رزقِ حسنہ، رزقِ طیّب، رزقِ کریم (عزت کی روٹی) ہے. اس قسم کا رزق ان لوگوں کا حصّہ ہے جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے متعین فرمودہ قوانین کے ماتحت

حصولِ رزق میں ساعی رہتے ہیں۔

رزقِ کریم۔ عزت کی روٹی

فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِیْمٌ (۲۲/۵۰)

"اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اور اعمالِ صالح کرتے ہیں اُن کے لئے خطرات سے حفاظت اور باعزت رزق ہے"۔ (نیز ۲۴/۲۶؛ ۸۸/۱۱؛ ۸/۴)۔

سوال یہ ہے کہ رِزْقٌ كَرِیْمٌ (عزت کی روٹی) کسے کہتے ہیں اور وہ کیسے ملتی ہے؟ بات صاف ہے۔ ایک معاشرہ ایسا ہوتا ہے جس میں رزق کے سرچشمے چند انسانوں کے قبضہ و اختیار میں ہوتے ہیں اور باقی افرادان کی روٹی کے لئے ان کے محتاج اور دست نگر۔ وہ ان دست نگر افراد سے اپنی مرضی کے مطابق کام لیتے ہیں۔ اس طرح ان کی احتیاج، انہیں محکومی پر مجبور کر دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح روٹی ملنے میں عزتِ نفس اور شرفِ انسانیت باقی نہیں رہ سکتا۔ یہ ذلت اور محکومی کی روٹی ہے۔ اس کے برعکس، دوسرا معاشرہ وہ ہے جس میں وسائلِ رزق کسی فرد کی ملکیت میں نہیں ہوتے، بلکہ وہ تمام ضرورتمندوں کی ضروریات کو پورا کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں اور اربابِ نظم و نسق ان کا انتظام اس طرح سے کرتے ہیں کہ کوئی فرد اپنی ضروریات سے محروم نہ رہنے پائے۔ اس میں نہ کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج ہوتا ہے، نہ محکوم۔ اس معاشرہ میں ہر فرد کو عزت کی روٹی ملتی ہے۔

قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ جماعتِ مومنین کو چاہیئے کہ وہ جس مقام پر بھی ہوں، وہاں اس قسم کے قرآنی معاشرہ کے قائم کرنے کی کوشش کریں۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہو جائیں تو فھوالمراد۔ لیکن اگر وہ دیکھیں کہ وہاں کے حالات کسی طرح بھی اس معاشرہ کے لئے سازگار نہیں ہو سکتے، تو انہیں چاہیئے کہ کسی ایسی سرزمین کی طرف منتقل ہو جائیں جو اس معاشرہ کے لئے سازگار ہو (بشرطیکہ کسی جگہ ایسی سرزمین موجود ہو)۔ ان سے کہا گیا کہ وہ اس خدشہ کے ماتحت، پاؤں توڑ کر، اس غیر مساعد فضا میں نہ بیٹھے رہیں کہ اگر اس زمین کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلے گئے تو بھوکوں مر جائیں گے۔ ان سے کہا کہ

یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ (۲۹/۵۶)

"اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو! یقیناً میری زمین وسیع و عریض ہے۔ سو صرف میری محکومی اختیار کرو"۔

اسے قرآنِ کریم کی اصطلاح میں ہجرت کہتے ہیں۔ ہجرت کے بعد اگلی اور آخری منزل جہاد و قتال کی ہے اور

حقیقت یہ ہے کہ اعمالِ صالحہ میں بلند ترین مقام اسی کا ہے جہاں ایک مردِ مومن اپنی گراں بہا متاعِ عزیز یعنی جان جیسی چیز نظامِ خداوندی کے قیام و استحکام کے لئے پیش کر دیتا ہے۔ اگر ایسے عملِ اصلح کا نتیجہ رزقِ کریم نہ ہوگا تو اور کس عمل کا ہوگا؟

وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جَاهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِیْمٌ ○ (۸/۷۴) ؛ (۸/۲۶ ؛ ۱۰/۹۳)۔

"اور جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کے راستہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے انھیں پناہ دی اور ان کی مدد کی، یہی لوگ سچے اور حقیقی معنوں میں مومن ہیں۔ ان کے لئے مغفرت ہے اور عزت کی روزی۔"

استخلاف فی الارض

یہ ہیں وہ اعمالِ صالح جن کا نتیجہ اس دنیا میں حکومت و سلطنت اور رزقِ کریم ہے۔ سرفرازی اور سربلندی کی زندگی، وہ زندگی جس میں انسان کا سر صرف ایک اللہ کے قوانین کے آگے جھکے، سب سے زیادہ عزت اور وقار کی زندگی ہے۔ یہ رزق اسی دنیا تک محدود نہیں ہوتا بلکہ اس کے بعد کی زندگی میں بھی اللہ کی طرف سے رزقِ طیب عطا ہوتا ہے۔

حیاتِ اُخروی میں رزق

سب سے پہلے ان مجاہدین کے متعلق دیکھئے جو اللہ کی راہ میں جان دیتے ہیں۔ اُن کے خونِ مقدس کے صدقہ میں جہاں ان کی ملت کو استخلاف فی الارض حاصل ہوتا ہے اور اس طرح یہاں رزقِ کریم (عزت کی روٹی) نصیب ہوتا ہے، ان شہداء کو اپنے رب کے ہاں سے رزق عطا ہوتا ہے۔

وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ ○ (۳/۱۶۸)۔

"جو (مجاہدین) اللہ کی راہ میں جان دیتے ہیں، انہیں مُردہ مت سمجھو۔ وہ تو زندہ ہیں اور انہیں اپنے اللہ کے ہاں سے رزق دیا جاتا ہے۔"

وہ مہاجرین جو اللہ کی راہ میں جان دیتے ہیں انھیں بھی رزقِ حسنا کی بشارت دی گئی ہے۔ وَ الَّذِیْنَ هَاجَرُوْا ...... خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ○ (۲۲/۵۸)۔ اور ایمان و اعمالِ صالح کے بدلے میں جب جنت

کی زندگی نصیب ہوگی تو وہاں بھی خدا کی طرف سے رزق عطا ہوگا۔

واضح رہے کہ جو معاشرہ قوانین خداوندی کے مطابق متشکل ہو، اس میں بسنے والے افراد کو اس دنیا میں بھی جنت کی زندگی نصیب ہوتی ہے اور اس کے بعد کی دنیا میں بھی جنت کی زندگی۔ اس دنیا کے رزقِ کریم کو ہم جانتے ہیں، لیکن بعد کی زندگی میں اس رزق کی نوعیت اور کیفیت کیا ہوگی؟ اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اس سے اتنا واضح ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما آخرت کی زندگی میں بھی ہوتی چلی جائے گی۔ اسی کے اسباب و ذرائع کو وہاں کا رزقِ کریم کہا گیا ہے۔

جَور و استبداد

جیسا کہ اُوپر بیان کیا جا چکا ہے، انسان کی سب سے زیادہ دُکھتی رگ رزق ہے۔ دنیا میں جَور و ستم اور ظلم و استبداد صرف اس بنا پر جاری رہتا ہے کہ بالادست انسان رزق کے سرچشموں پر قابض ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد زبردست انسانوں سے جو چاہتے ہیں کراتے ہیں۔ کوئی انسان بطیبِ خاطر کسی دوسرے انسان کا غلام بن کر رہنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ کوئی کسی کی محکومیت کا طوق ہنسی خوشی اپنی گردن میں ڈالنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ انسان کی غلامی شرفِ انسانیت کے خلاف ہے لیکن کمزور و ناتواں، مجبور و مقہور انسان ہر قسم کی غلامی کے لئے تیار ہو جاتا ہے جب اُن سے کہا جائے کہ ایسا نہ کرنے سے تم پر رزق کے دروازے بند ہو جائیں گے۔

بھوک کا عذاب

بھوک کا عذاب ایسا سخت عذاب ہے کہ اس سے بچنے کے لئے انسان ہر شرط ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ دنیا میں استبداد شروع ہی یہاں سے ہوتا ہے اور اسی قوت کے سہارے قائم رکھا جاتا ہے۔ لہٰذا دنیا میں جَور و استبداد ختم کرنے اور ضعیف اور کمزور انسانوں کو انسانیت کی سطح پر لانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان کے دل سے اس غلط تصور کو... نکال دیا جائے کہ انسان کے ہاتھ میں دوسرے انسان کا رزق ہے اور اس پر اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا جائے کہ رزق کے سرچشمے خدا کی تمام مخلوق کے لئے یکساں طور پر کھلے ہیں۔ ان سے ہر شخص اپنی ضرورت اور ظرف کے مطابق سب کچھ حاصل کر لینے کا مجاز ہے۔ لہٰذا کسی انسان کو دوسرے انسان کے سامنے جُھکنے کی ضرورت نہیں۔ یہ انسانیت کی ذلت ہے کہ ایک انسان روٹی کی خاطر دوسرے انسان کا غلام بن کر رہے۔

محکومی اور غلامی

چونکہ دنیا میں طاغوتی قوتوں نے بڑے شد و مد سے اس عقیدہ کو ذہنِ انسانی پر مسلّط کر رکھا ہے کہ رزق کے مالک ہم ہیں، اس لئے قرآنِ کریم نے اسی قدر شدت و تکرار سے اس باطل عقیدہ کی تردید

کی ہے اور اس کی جگہ انسان کے دل میں یہ صحیح ایمان جاگزیں کیا ہے کہ رزق کسی انسان کے ہاتھ میں نہیں ۔ یہ صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، "رزق خدا کے ہاتھ میں" ہونے کے معنی یہ ہیں کہ رزق کے سرچشمے اس معاشرہ کی تحویل میں رہیں جو قوانینِ خداوندی کے مطابق تقسیم کرے یہی ہے وہ حقیقت جسے قرآن نے یہ کہہ کر بیان کیا ہے کہ رزق کی تقسیم اور اس کی بست و کشاد خدا کی مشیت کے تابع ہے۔ انسانوں کی دنیا میں خدا کی مشیت، ان انسانوں کے ہاتھوں کارفرما ہوتی ہے جو اس کے قوانین کو نافذ کرنے کے ذمہ دار بنتے ہیں۔ جہاں زمامِ کار ان لوگوں (جماعتِ مومنین) کے ہاتھ میں نہ ہو، رزق کی تقسیم قوانینِ مشیت کے مطابق نہیں ہوتی، انسانوں کے خود ساختہ قوانین و ضوابط کے مطابق ہوتی ہے جس کا نتیجہ انسانیت سوز جہنم ہے۔ ان اشارات کی روشنی میں قرآن کے وہ تمام مقام سمجھ میں آ جائیں گے جن میں اس نے کہا ہے کہ رزق

رزق کا بسط و کشاد خدا کے ہاتھ میں ہے

کا بسط و کشاد (تنگی اور فراوانی) سب خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ کسی انسان کو دوسرے انسان کے رزق میں کمی بیشی کرنے کا اختیار نہیں دیا گیا۔ وَ اللّٰہُ یَقْبِضُ وَ یَبْصُطُ ص (۲/۲۴۵)۔ اور اَللّٰہُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَقْدِرُ (۱۳/۲۶) اللہ اپنی مشیت کے مطابق جس کی روزی چاہتا ہے فراخ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے تنگی تلی دیتا ہے (نیز ۱۷/۳۰، ۲۸/۸۲؛ ۲۹/۶۲) اور یہ وہ اصول ہے جس کے اندر ایمان والوں کے لئے بڑی عظیم الشان نشانیاں (آیات) پوشیدہ ہیں کہ

اَوَ لَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ○ (۳۰/۳۷)۔

"کیا یہ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ اللہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق، جو چاہتا ہے اس کی روزی فراخ کر دیتا ہے اور جو چاہتا ہے اسے ایک معین اندازے کے مطابق دیتا ہے۔ اس (قانونِ مشیت) کے اندر ایمان والوں کے لئے (بڑی) نشانیاں ہیں!

زمین و آسمان میں رزق کی کنجیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ وہی رزق کے تمام خزانوں کا مالک ہے۔

لَہٗ مَقَالِیْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ج یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَقْدِرُ ط اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ○ (۴۲/۱۲)۔

" (زمین و آسمان کے خزانوں کی) کنجیاں اسی کے پاس ہیں۔ جو چاہتا ہے اسے روزی زیادہ دیتا ہے اور جو چاہتا ہے اسے نپی تُلی دیتا ہے اور وہ ہر چیز کا پورا پورا علم رکھتا ہے!

(مَنْ یَّشَآءُ کا تعلق مسئلہ تقدیر سے ہے جسے ہم نے اپنی تصنیف" کتابُ التقدیر" میں بڑی وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ اس میں ایک باب رزق کے لئے بھی مخصوص ہے)۔

نشۂ دولت کی بدمستیاں

ہم نے اوپر کہا ہے کہ جب رزق کی تقسیم قوانینِ خداوندی کے مطابق نہیں ہوتی تو دنیا جہنم بن جاتی ہے۔ اس میں ہوتا یہ ہے کہ رزق کے سرچشمے ایک مختصر سے طبقہ کے ہاتھ میں آجاتے ہیں۔ یہ طبقہ تکبر و نخوت کی طاغوتی قوتوں کا قہرمانی مجسمہ بن جاتا ہے، جس کا "اصول" یہ ہوتا ہے کہ جائز اور معقول وہ ہے جو اس کی مرضی کے مطابق ہو اور ناحق اور مردود وہ جو اس کی خواہشات کے خلاف ہو۔ جب اس طبقہ کے سر پر فرعونیت کا یہ بھوت سوار ہوتا ہے تو وہ ہر زیر دست انسان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اس کے دعوائے اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (میں تمہارا سب سے بڑا پرورش کرنے والا ہوں) کے سامنے سربسجود ہو جائے۔ یہی وہ فراعنہ و نمارید ہیں جو اپنی دولت کے نشہ میں بدمست، ہر آسمانی دعوتِ انقلاب کی مخالفت کرتے ہیں، اس لئے کہ آسمانی دعوت کی ایک شق یہ بھی ہوتی ہے کہ رزق کے سرچشمے انسانی ہاتھوں سے چھین کر، قوانینِ خداوندی کی تحویل میں دیدیئے جائیں تاکہ ان سے ہر فردِ انسانیہ کی ضروریاتِ زندگی، بلا تردد و کاوش، بطریقِ احسن پوری ہوتی رہیں۔ یہی ہے وہ حقیقت جس کی طرف قرآن نے یہ کہہ کر توجہ دلائی ہے کہ

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَۃٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْھَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِہٖ کٰفِرُوْنَ ○ وَقَالُوْا نَحْنُ اَکْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ○ قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ع (۳۴/۳۴-۳۶)

"اور ہم نے جس بستی میں بھی کسی رسول کو بھیجا وہاں کے مُفت خوروں کے خوشحال طبقہ نے یہی کہا کہ ہم تو ان احکام (کے ماننے) سے انکار کرتے ہیں جو تمہیں دیئے گئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم مال اور اولاد میں تم سے زیادہ ہیں اور ہمیں کبھی وہ عذاب نہیں پکڑ سکتا جس سے تم ہمیں متنبہ کرتے ہو۔ (اے رسول) کہو کہ یہاں تمہارا نظام نہیں چل سکتا جس کی رُو سے رزق کی تقسیم تمہاری منشاء کے مطابق ہو، رزق کی تقسیم اور اس کی بست و کشاد خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہونی چاہیئے۔

جُوعُ الارض

نشۂ دولت کی یہی سرمستی اُن کے دل میں جُوع الارض پیدا کر دیتی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ زمین کی طنابیں کھنچ کر ان کے ہاتھ میں آجائیں تاکہ وہ غریبوں اور مظلوموں کے خون کو اپنی بزمِ طرب کی آرائش میں صرف کریں۔ اہلِ سبا کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے کہ ان کو اللہ نے فراخیٔ رزق و ملک عطا کر رکھی تھی بایں ہمہ ان کی ہوس بڑھتی چلی جاتی تھی اور وہ کہتے تھے۔ رَبَّنَا بٰعِدْ بَیْنَ اَسْفَارِنَا (۳۴/۱۹)۔ "ہمارے ربّ ان راستوں، ان منازل کی مسافتوں میں اور درازی ہوتی جائے"۔ جب حالت یہاں تک پہنچ جاتی ہے تو خدا کے غیر متبدّل قانون کے ماتحت سرکشی اور تمرّد کا تختہ اُلٹ جاتا ہے اور ایسا نظام جس کی بنیادیں جُوع الارض اور ہوسِ خون آشامی پر ہوتی ہیں، اپنی تباہی کا آپ موجب بن جاتا ہے۔ اہلِ سبا کی متذکرہ صدر کیفیت کے بعد فرمایا۔

فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِیْثَ وَ مَزَّقْنٰهُمْ کُلَّ مُمَزَّقٍ ط (۳۴/۱۹)

"سو ہم نے (اس قوم کو) ایک افسانہ بنا دیا اور وہ (ریت کے ذرّوں کی طرح) منتشر ہو گئے"۔

انجامِ سرکشی

اسی حقیقتِ کبریٰ کو سورۂ نحل میں ایک مثال کے انداز میں بیان کیا گیا ہے جس میں کہا ہے کہ ایک بستی کے لوگ نہایت سکون و اطمینان کی زندگی بسر کرتے تھے، رزق کی فراوانی تھی، ہر طرح کی آسائش تھی۔ اس کے بعد انہوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکرگزاری شروع کر دی جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ان پر بھوک اور خوف کا عذاب مسلّط ہو گیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ

فَکُلُوْا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَیِّبًا ص وَّ اشْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝ (۱۶/۱۱۴)۔

"سو اللہ نے تمہیں جو رزق عطا فرمایا ہے، اسے حلال و طیّب (طریق سے) کھاؤ اور اس کی نعمتوں کی قدردانی کرو، اگر تم صرف اسی کی محکومیت اختیار کئے ہوئے ہو تو"۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر معاشرہ کا نظام قوانینِ خداوندی کے مطابق قائم ہو تو اس میں رزق کی فراوانی رہتی ہے اور ہر فرد سکون و اطمینان کی زندگی بسر کرتا ہے لیکن اگر یہ نظام انسانوں کے خود ساختہ خطوط پر متشکّل ہو جائے تو اس سے معاشرتی ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ چنانچہ اقوامِ سابقہ (اہلِ کتاب) کے متعلق کہا کہ

وَ لَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِیْلَ وَ مَآ اُنْزِلَ

اِلَيۡهِمۡ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ لَاَكَلُوۡا مِنۡ فَوۡقِهِمۡ وَ مِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِهِمۡ ..... (۵/۶۶)۔

"اور اگر یہ لوگ تورات اور انجیل کو اور جو کچھ اللہ کی طرف سے ان کی طرف بھیجا گیا ہے قائم رکھتے تو (اُن کو اتنا رزق ملتا کہ) وہ اپنے اُوپر کی طرف سے بھی اور قدموں کے نیچے سے بھی کھاتے (پیتے)۔"

اس کے برعکس، ان اصولوں سے انحراف انسان کی ذلّت وخواری کا موجب بن جاتا ہے۔

وَ مَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِكۡرِیۡ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيۡشَةً ضَنۡكًا..... (۲۰/۱۲۴)۔

"اور جو کوئی میرے قانون سے رُوگرداں ہوگا، تو اس کی روزی تنگ ہو جائے گی۔"

یہی قوانینِ الٰہیہ (قرآنِ کریم) ہیں جن پر ایک غیر متزلزل ایمان اور ان کے مطابق انتھک اعمال سے "عزت کی روٹی" ملتی ہے۔

فَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّ رِزۡقٌ كَرِيۡمٌ (۲۲/۵۰)۔

"پس جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اعمالِ صالح کئے تو ان کے لئے سامانِ حفاظت اور عزت کی روٹی ہے۔"

ایمان و اعمالِ صالح کا نتیجہ رزقِ کریم

دوسری جگہ ہے کہ یہ "عزت کی روٹی" ان کے ایمان و اعمالِ صالح کا بدلہ (لازمی نتیجہ) ہے۔

لِّيَجۡزِیَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّ رِزۡقٌ كَرِيۡمٌ ○ (۳۴/۴)۔

"تاکہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انھوں نے اعمالِ صالح کئے ہیں، بدلہ دیا جائے۔ ان کے لئے سامانِ حفاظت اور عزت کی روٹی ہے۔"

فضلِ ایزدی کی جستجو

اگر ان قوانین کے ماتحت حصولِ رزق میں کوشش کی جائے تو اس کا نام "اللہ کے فضل کی جستجو" ہے۔ فضل کے عام معنی ایزاد (زیادہ ہونے) کے ہیں، لیکن قرآن نے اکثر مقامات پر اسے معاشی سہولتوں کے معنوں میں استعمال کیا ہے (فضل کا مستقل عنوان آگے چل کر آئے گا)۔ چونکہ یہ سہولتیں خدا کی طرف سے بلامزد و معاوضہ عطا ہوتی ہیں اس لئے اسے "فضل اللہ" کہہ کر پکارا گیا ہے۔ لیکن یہ سہولتیں خود بخود انسان تک نہیں آجاتیں۔ انسان کے لئے ان کی طلب اور جستجو

ضروری ہے۔ اسے "ابتغائے فضل اللہ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی فضل اللہ کی تلاش میں نکلنے والوں کے متعلق ہے۔

......وَ اٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ یَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ (۷۳/۲۰)

......"اور بعض (تم میں سے) اللہ کے فضل (معاش) کی تلاش میں ملک میں سفر کریں گے"۔

سورۂ جمعہ میں ہے کہ صلوٰۃ سے فارغ ہو کر فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ (۶۲/۱۰) "ملک میں چل پھر نکلو اور اللہ کے فضل (رزق) کی تلاش کرو"۔ مہاجرین کے متعلق بھی کہا کہ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَ رِضْوَانًا...... (۵۹/۸) "وہ اللہ کے فضل اور اس کی رضاجوئی کی تلاش کرتے ہیں" صحابہؓ کی جماعت کے متعلق بھی یہی فرمایا۔ (۴۸/۲۹)۔ ان مقامات سے ظاہر ہے کہ اگرچہ خدا کا عطا کردہ رزق نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے زمین کے اندر موجود ہے، لیکن اسے حاصل کرنے کے لئے طلب و جستجو اور سعی و کاوش نہایت ضروری ہے، اس کے بغیر رزق کسی کو نہیں ملتا۔ دوسرے یہ کہ اس طلب و جستجو کے معنی یہ نہیں کہ ہر فرد (یا گروہ) جس قدر رزق سمیٹ سکتا ہے، اپنے لئے سمیٹ لے اور دوسروں کے لئے کچھ بھی نہ چھوڑے۔ یہ غلط ہے۔ صحیح نظام یہ ہے کہ تمام افرادِ معاشرہ اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق حصولِ رزق میں کوشش کریں اور جو کچھ حاصل ہو اسے (ایک اجتماعی نظام کے ماتحت) تمام افراد کی پرورش کے لئے کھلا رکھیں۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں "انفاق فی سبیل اللہ" کہا جاتا ہے جس کی تاکید قرآن میں شروع سے اخیر تک ہر جگہ ملے گی۔ مثلاً قرآنِ کریم کا پہلا صفحہ اُلٹیے۔

انفاق فی سبیل اللہ

سب سے پہلے متقیوں کی تعریف سامنے آئے گی۔ منجملہ دیگر اوصاف ان کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ وَ مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ (۲/۳)۔ وہ خدا کے عطا کردہ رزق کو اس کی راہ میں صرف کرنے کے لئے کھلا چھوڑتے ہیں۔ اس کے ساتھ اس ٹکڑے کو ملائیے کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (۴۹/۱۳) کہ تم میں سب سے زیادہ اللہ کے نزدیک واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ اس سے واضح ہو جائیگا کہ اسلام کی نگاہ میں عزت و تکریم کے لئے اپنی محنت کے ماحصل کو "خدا کی راہ" میں کھلا رکھنا ضروری ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ کے لئے حسبِ ذیل آیات بھی قابلِ غور ہیں (۲/۲۵۴؛ ۳/۱۷۹؛ ۴/۳۷-۳۹؛ ۹/۷۴-۷۶؛ ۱۳/۲۲؛ ۱۴/۳۱؛ ۲۲/۳۵؛ ۲۸/۵۴؛ ۳۶/۴۷؛ ۶۳/۱۰)۔ ان آیات کو سامنے رکھنے کے بعد اس آیتِ مقدسہ کا صحیح مطلب آپ کی سمجھ میں آسکے گا۔

قرآن میں ایک مقام پر آیا ہے۔

ہر جاندار کے رزق کا ذمہ دار اللہ ہے

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶)۔

"اور زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں جس کے رزق کا انتظام اللہ کے ذمے نہ ہو!"

لیکن یہ کہتے وقت کہا جاتا ہے کہ جب ہر جاندار کے رزق کا ذمہ دار اللہ ہے تو پھر آپنی مخلوق بھوکی کیوں مرتی ہے۔ اتنا بھلا دیا جاتا ہے کہ خدا کی ذمہ داری اس وقت تک ہے جب تک آپ اپنے آپ کو اس کے قائم کردہ نظام کے ماتحت رکھیں۔ جب آپ اس کے نظام سے باہر چلے جائیں گے اور اس کی حفاظت سے اپنے آپ کو بے نیاز سمجھنے لگ جائیں گے تو اس وقت اس کی ذمہ داری بھی اٹھ جائے گی۔ اپنے آپ کو اس کے نظام کے ماتحت رکھئے اور پھر دیکھئے اس کی "ذمہ داریاں" کس طرح پوری ہوتی ہیں۔ اپنے اوپر انسانوں کا وضع کردہ طاغوتی نظام مسلط کر لینا اور اس کے بعد ان نتائج کی توقع رکھنا جو نظامِ خداوندی کا خاصّہ ہیں، اگر کھلی ہوئی جہالت نہیں تو اور کیا ہے؟ زلزلہ میں بوسیدہ مکان کے نیچے پناہ لینے والے کا انجام ہلاکت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ وہ خدا کی مستحکم چھت کے نیچے آجائے، پھر دیکھئے کہ خدا اس کی حفاظت کی ذمہ داری لیتا ہے یا نہیں۔

فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انْفِصَامَ لَهَا (۲/۲۵۶)۔

"جو غیر خدا (کے سرکش نظام) سے منہ موڑ کر اللہ پر ایمان لے آتا ہے تو اسے ایک ایسا محکم اور پائیدار سہارا مل جاتا ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔

یہ "پائیدار سہارا" وہ نظامِ خداوندی ہے جس کے بعد کسی اور سہارے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہی وہ نظام ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ؎

کس نماند در جہاں محتاجِ کس

نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

جب اس زمین پر خدا کا نظام قائم ہوا تھا تو اس وقت لوگوں کی سمجھ میں آیا تھا کہ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ ایک مرتبہ کوفہ کا عامل مدینہ میں آیا۔ دیکھا کہ حضرت عمرؓ جو کی روٹی کھا رہے ہیں۔ عرض کیا کہ اتنی عظیم الشان سلطنت کا امیر المومنین کیا گیہوں کی روٹی بھی نہیں کھا سکتا؟ جواب ملا کہ عمرؓ اس وقت گیہوں کی روٹی کھا سکتا ہے کہ جب اسے یقین ہو جائے کہ اس کی حدودِ خلافت

کے اندر ہر متنفّس کو گیہوں کی روٹی میسر ہے۔ جب تک اس امر کا یقین نہیں ہو جاتا عمر گیہوں کی روٹی کیسے کھا سکتا ہے؟
اب آپ خیال کیجئے کہ اس نظامِ حکومت میں کوئی شخص بھوکا رہ سکتا ہے؟ قرآنی تعلیم کا آغاز ہی اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سے ہوتا ہے، یعنی ہر قسم کی حمد اُس اللہ کے لئے ہے جو ربُّ العلمین ہے اس کی محمودیت اس لئے ہے کہ وہ ربّ العلمین ہے، وہ تمام کائنات کا پرورش کرنے والا ہے۔ اس لئے جو قوم اس دنیا میں اُس حکومت کے قیام کی ذمہ دار ہوگی اُس کی محمودیت بھی اُس کی صفتِ ربوبیت کی وجہ سے ہوگی۔ وہ قابلِ تعریف اس وقت ہوگی جب وہ ان تمام نفوس کی پرورش کا انتظام کردے جو نظامِ خداوندی کے شامیانے کے نیچے آگئے ہوں اور انتظام بھی ایسا کہ جس طرح ان کے خدا نے اپنے متعلق کہا ہے کہ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ (۵۱/۵۷) "میں اپنی مخلوق سے رزق کا خواہاں نہیں"۔ اسی طرح جن لوگوں کے ہاتھ میں اس معاشرہ کا نظم و نسق ہو، وہ اپنی "رعایا" کی کمائی سے اپنے عیش و عشرت کا سامان فراہم نہ کریں۔ بلکہ ان کی ربوبیت کی فکر کریں۔ چونکہ میں اس نظام کی پوری تفصیل اپنی کتاب (نظامِ ربوبیت) میں شرح و بسط سے دے چکا ہوں، اس لئے اس مقام پر انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

بھوک اور افلاس اللہ کا عذاب ہے

اس مقام پر اس کا دُہرا دینا ضروری ہے کہ بھوک اور افلاس اللہ کا عذاب ہے۔ سورۂ نحل میں مثال کے طور پر بیان کیا ہے کہ ایک بستی نے جب اللہ کی نعمتوں کی ناقدری کی تو اس جرم کی پاداش میں۔

فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ (۱۶/۱۱۲)

"اللہ نے اُنھیں بھوک اور خوف کے عذاب کا مزہ چکھایا"۔

یعنی خوف اور بھوک اللہ کا عذاب ہے اور ان چیزوں سے مامون رہنا اس کا انعام۔ دیکھئے (۱۰۶/۴)۔ یہ عذاب اس قوم پر آتا ہے جو اس کے قوانین سے سرکشی برتتی ہے۔ بالادست طبقہ (مُترفین) سے اس کی ابتدا ہوتی ہے اور زیر دست طبقہ (غربا و عوام) اس طاغوتی نظام کو تسلیم کرنے کے جرم کا مرتکب ہوتا ہے اس لئے جہاں اُوپر کے طبقہ میں عدمِ سکون و فقدانِ اطمینان کی آگ شعلہ بار ہوتی ہے، نیچے کے طبقہ میں بھوک اور افلاس کی مار عذابِ الٰہی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن بدبختی سے ایک عرصہ سے ہمارے ذہن پر یہ خیال مسلّط ہو چکا ہے کہ غربت اور ناداری، بےکسی اور بےبسی، محتاجی اور افلاس کی زندگی خدا کے مقرّبین کی زندگی ہے، اس کے مقرّب بندوں کی علامت ہے۔ یہ خیالات عجمی فلسفۂ حیات کی پیداوار اور "مسیح کی منادی" کرنے والوں کے مسلسل پروپیگنڈہ کرنے کا نتیجہ ہیں جو مسلمانوں کو اس فریب میں مبتلا رکھنا چاہتے ہیں کہ "آسمان کی بادشاہت" اسی کو مل سکتی ہے جو زمین میں سب سے زیادہ مظلوم اور کمزور

ہو۔ ہم ایک مدت سے اسی رہبانیت کے فریب میں مبتلا ہیں اور نہیں سمجھتے کہ افلاس و غربت خدا کا عذاب ہے اُمت نہیں۔ ایمان و اعمالِ صالح کا لازمی نتیجہ استخلاف فِی الارض اور عزت کی روٹی ہے۔ مومنینِ حقّانی کی علامت یہ ہے کہ

مومن کے لئے عزت کی روٹی ہے | لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ مَغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ۔ (۸/۴)

"ان کے لئے ان کے رب کے نزدیک مدارجِ عالیہ ہیں اور عزت کی روٹی ہے۔"

تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ رزّاقیت خدا کی صفت ہے۔ خارجی دنیا میں اس صفت کا ظہور از خود ہوتا رہتا ہے لیکن انسانوں کی دنیا میں اس کا قاعدہ بدل جاتا ہے۔ اس میں رزق کے سرچشمے تو خدا کی طرف سے بلا مُزد و معاوضہ ملتے ہیں لیکن ایک تو حصولِ رزق کے لئے تجسّس و کاوش کرنی پڑتی ہے اور دوسرے رزق کی تقسیم قوانینِ خداوندی کے مطابق کرنی ہوتی ہے۔ ایسا کچھ وہی جماعت کر سکتی ہے جس کے افراد اپنی ذات میں اس صفت کی نمود کریں۔ اب ظاہر ہے کہ جب نظامِ معیشت اس قسم کی جماعت کے ہاتھ میں ہوگا تو نوعِ انسانی رزق کی طرف سے کس قدر مطمئن ہوگی۔ اصل یہ ہے کہ دنیا ابھی اس سطح تک پہنچ ہی نہیں پائی جہاں وہ اس حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لے کہ انقلاب اندر شعور کے بعد جو خارجی انقلاب واقع ہوتا ہے اس سے یہ خاکدان کس قدر جنّت بداماں ہو جاتا ہے۔ ابھی دنیا اپنی رزق کی مشکلات کا حل کمیونزم جیسے میکانکی طریقوں سے کرنا چاہتی ہے، جو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ جب وہ ان طریقوں اور تدبیروں کو آزما دیکھے گی تو اس کے بعد وہ قرآنی علاج کی طرف آئے گی اور اُس کے دکھوں کا مداوا بھی اُسی وقت ہوگا۔ اپنی دنیا سے "خدا" کو نکال کر امن کی آرزو کرنا —

محال است و خیال است و جنوں۔

۸

رحمت

معنی رحم کے بنیادی معنی نرمی اور رقّت کے ہیں۔ (رِحْمٌ: بطنِ عورت جس میں جنین پرورش پاتا اور خارجی اثرات سے محفوظ رہتا ہے) رحمت کے معنی ہوتے ہیں وہ عطیہ جو کسی کی ظاہری اور باطنی کمی کو پورا کردے اور اس طرح اس کی یوں پرورش ہو جائے جس طرح رحمِ مادر میں جنین کی پرورش ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے رحمتِ خداوندی بھی اس کی صفتِ ربوبیت اور رزاقیت ہی کی ایک کڑی ہے' اس فرق کے ساتھ کہ اس میں نرمی کا پہلو غالب ہوتا ہے۔ نیز اس کے معنی ڈھانپ لینے اور سامانِ حفاظت بہم پہنچانے کے بھی ہوتے ہیں۔ جب باہمی تعلقات میں رحمت یا رحم کا لفظ آئے گا تو اس سے مفہوم محبت' رافت اور مودّت بھی ہوگا۔ مثلاً ماں باپ کے ساتھ جہاں نرمی اور حُسنِ سلوک سے پیش آنے کی تاکید کی گئی ہے' وہاں اُسے رحمت ہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ (۱۷/۲۴)

"نرمی کے ساتھ پرورش کرنے کے لئے انہیں اپنے دامنِ شفقت میں لئے رہو"۔

جہاں میاں بیوی کے تعلقات کا ذکر ہے وہاں اس رحمت میں نرم دلی کے ساتھ محبت کے جذبات بھی شامل ہیں۔

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۳۰/۲۱)۔

"اس کی نشانیوں میں سے (یہ بھی) ہے کہ اس نے تمہارے واسطے تمہاری جنس کے جوڑے بنائے

تاکہ تمھیں ان سے سکون ملے اور تم میاں بیوی میں محبّت اور رحمت پیدا کی۔ غور کرنے والوں کے لئے اس میں (بھی) نشانیاں ہیں"۔

خدا کی طرف سے فراخئ رزق اور وسعتِ معاش کے لئے بھی رحمت کا لفظ آیا ہے۔ (۱۷/۲۸)۔

قرآن میں جس طرح خدا کی صفتِ ربوبیّت کا تذکرہ شدّت اور تکرار سے آیا ہے، اسی طرح اس کی صفتِ رحمت کا ذکر بھی بار بار آیا ہے۔ اس کی ہر سورت کی ابتداء اس خدا کے نام سے ہوتی ہے جو رحمٰن و رحیم ہے۔ کہیں

خدائے رحیم

وہ خدا رحیم و ودود ہے۔ کہیں رؤف الرّحیم ہے۔ کہیں توّاب الرّحیم ہے، کہیں غفور الرّحیم کہیں عزیز الرّحیم ہے، کہیں برّ الرّحیم۔ قرآن کریم میں کم از کم ڈیڑھ سو مرتبہ خدا کے ایسے نام آئے ہیں جن میں رحمٰن و رحیم موجود ہے۔ دوسرے مقامات جن میں رحمت کا ذکر ہے، اس سے الگ ہیں۔

عیسائیت میں بھی خدا کو رحیم کہا گیا ہے لیکن وہاں وہ رحم ہی رحم ہے (GOD IS MERCY)، اس کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن قرآن میں رحم صفاتِ خداوندی کا صرف ایک گوشہ (FACET) ہے۔ اس کے علاوہ اس کی دوسری صفات بھی ہیں۔ بنا بریں، قرآن میں خدا کا تصوّر ایسا مکمل ہے کہ اس خداوند کے بعد پھر کسی اور "خدا" کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس کے برعکس عیسائیت میں خدا کے محدود تصوّر کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کو نظم و نسق اور عدل و انصاف کے لئے اور "خداؤں" کی تلاش ہوئی اور چونکہ وہ خدا ذہنِ انسانی کے تراشیدہ تھے، اس لئے پردہ اُٹھنے پر معلوم ہوا کہ

جز یسفلش اللہ ماء خصیم مبین نبود

اگر یورپ کو کہیں "قرآن کا خدا" مل جاتا تو آج اس کی حالت کچھ اور ہوتی۔

رحمٰن و رحیم

خدا کی صفتِ رحمت کے لئے رحیم اور رحمٰن کے الفاظ بکثرت استعمال ہوئے ہیں۔ یوں تو ان دونوں لفظوں کا مادّہ ایک ہی ہے لیکن زبان کے قاعدے کی رُو سے ان میں ایک نہایت لطیف فرق ہے۔ رحیم کے معنی ہیں وہ جس کی رحمت ایک خاص نہج و اسلوب کے مطابق متواتر اور لازماً کارفرما رہے اور رحمٰن کے معنی ہیں جس کی رحمت ہنگامی طور پر شدّت کے ساتھ رونما ہو۔ اس فرق کو سمجھنے کے لئے کائنات کے قانونِ ارتقاء کو سامنے لانا ضروری ہے۔ قانونِ ارتقاء (LAW OF EVOLUTION) ہمیں بتاتا ہے کہ اشیائے کائنات ایک خاص اسلوب و انداز کے مطابق نشوونما پاتی ہوئی اپنی تکمیل تک پہنچتی ہیں۔ لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک چیز میں ہنگامی طور پر ایسا انقلاب آتا ہے

کہ وہ سلسلۂ ارتقار کی کئی ایک کڑیاں پھاند کر، اچانک کچھ سے کچھ بن جاتی ہے۔ اسے اصطلاح میں فجائی ارتقاء (EMERGENT EVOLUTION) کہتے ہیں۔ کائنات کی عام نشوونما، خدا کی صفتِ رحیمیت سے ہوتی ہے اور یہ ہنگامی یا فجائی ارتقار اس کی صفتِ رحمانیت کی رُو سے۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن نے رحمٰن اور رحیم کی صفات کا الگ الگ ذکر کیا ہے۔ ویسے ان دونوں کے معنی نرمی اور شفقت سے سامانِ نشوونما اور ذرائع حفاظت بہم پہنچانے والے کے ہیں۔

یہ بھی واضح رہے کہ رحمٰن کا اطلاق صرف ذاتِ خداوندی کے لئے مختص ہے اور رحیم میں دوسرے "رحمت کرنے والے" بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ مثلاً نبی اکرمؐ کے متعلق فرمایا کہ آپ رَؤفٌ رحیم ہیں۔ (۹/۱۲۸)

نظامِ کائنات میں رحمتِ ایزدی کی کرشمہ سازیاں

خدا کی رحمت کا تقاضا تھا کہ انسان کو جب اس دنیا میں بھیجا تو اس کی طبعی ضروریات کے سامان از خود مہیا کئے جاتے۔ انسان کی زندگی کا اوّلین انحصار ہوا پر ہے۔ (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) اسے خدا نے اس انداز سے کرۂ ارضی کے گرد پھیلا رکھا ہے کہ انسان جہاں بھی جائے ہوا اس کے ساتھ ہے اور اس کی آمد و رفت کا سلسلہ اس اسلوب سے مقرر کر رکھا ہے کہ انسان، دنیا جہان کے کام کرتا پھرے، اسے معلوم بھی نہیں ہوتا کہ عملِ تنفس کس طرح خود بخود (بغیر اس کے ارادے اور کوشش کے) ہر وقت جاری رہتا ہے۔ ہوا کے ساتھ ساتھ روشنی کا انتظام بھی اسی طریق سے موجود ہے۔ روشنی کے بعد پانی کو دیکھئے۔ اسے اس انداز سے ہر جگہ رواں اور محفوظ رکھ چھوڑا ہے کہ دنیا میں واٹر سپلائی کا کوئی اور سسٹم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد رزق کا سوال ہے، سو انسان کی ضرورت کے لئے زمین کی پیداوار کا سلسلہ ایسی ترتیب اور تنظیم سے چل رہا ہے کہ کسی مشینری میں یہ قوت نہ تھی کہ اُسے یوں چلا سکتی۔ ان چیزوں کی خدائی تقسیم میں اونچے اور نیچے، ادنیٰ اور اعلیٰ کا کوئی فرق نہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ سورج کی پہلی کرن، برہمن کے محل پر پڑے اور آخری اور بوسیدہ شعاعیں کسی شودر کی جھونپڑی پر۔ بارش کے قوی اور مؤثر قطرات کسی جاگیردار کے کھیت میں گہر باری کریں اور "خشک اور بے اثر" حصہ کسی کاشتکار کی زمین پر۔ یہ سب اُس کی رحمت سے ملتا ہے اور بلا مزد و معاوضہ ملتا ہے۔ ان عطیوں کو اس نے اپنی رحمت قرار دیا ہے۔ فرمایا۔

فَانْظُرْ اِلٰۤى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ (۳۰/۵۰)۔

"رحمتِ الٰہی کے آثار دیکھو وہ کس طرح (افسردگی و پژمردگی کی) موت کے بعد زمین کو (شگفتگی و سرسبزی کی) حیات (تازہ) عطا کرتا ہے. بیشک وہ مردوں کو زندہ کرنے والا ہے."

دوسری جگہ ہے۔

وَ مِنْ اٰیٰتِہٖۤ اَنْ یُّرْسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّ لِیُذِیْقَکُمْ مِّنْ رَّحْمَتِہٖ وَ لِتَجْرِیَ الْفُلْکُ بِاَمْرِہٖ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِہٖ وَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ○ (۳۰/۴۶) (۷/۵۷)۔

"اور اللہ کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ ہواؤں کو بھیجتا ہے جو (بارش کی) خوشخبری دیتی ہیں تاکہ وہ تمہیں اپنی رحمت سے بہرہ یاب کرے. کشتیاں اس کے قانون کے مطابق چلیں اور تم تلاشِ معاش کر سکو اور شکر گزار بنو."

یہ سب کچھ وہی کر سکتا ہے. اس کے سوا کوئی اور نہیں.

اَمَّنْ یَّھْدِیْکُمْ فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ مَنْ یُّرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِہٖ ؕ ءَ اِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ ؕ تَعٰلَی اللّٰہُ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ؕ (۲۷/۶۳)۔

"وہ ذات جو تمہیں خشکی اور تری کی تاریکیوں میں راستہ دکھاتی ہے اور جو ہواؤں کو بارش کا پیش خیمہ بنا کر بھیجتی ہے جو رحمت (بارش) کا مژدہ (جاں فزا) لاتی ہیں، کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی اِلٰہ ہے. اللہ ان لوگوں کے شرک سے بہت بلند ہے."

اس کے سحابِ کرم کے چھینٹے اُس وقت گہر باری کرتے ہیں جب انسان زمین کی حیاتِ تازہ کی طرف سے بالکل مایوس ہو جاتا ہے.

وَ ھُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَ یَنْشُرُ رَحْمَتَہٗ ؕ وَ ھُوَ الْوَلِیُّ الْحَمِیْدُ ○ (۴۲/۲۸)۔

"وہ (خدا) جو لوگوں کے نااُمید ہو جانے کے بعد مینہ برساتا ہے اور اپنی رحمت (کا دامن) پھیلا دیتا ہے اور وہ سب کا کارساز قابلِ حمد و ستائش ہے."

انسانی نشو و نما کے لئے دن اور رات کی تقسیم بھی نہایت ضروری تھی. دن تلاشِ معاش کے لئے اور رات سکون کی.

خاطر اسے بھی خدا کی رحمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

وَ مِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ
وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ (۲۸/۷۳)

"اور اس کی رحمت ہے کہ اس نے تمہارے لئے رات اور دن کو بنایا کہ تم (رات کو) آرام کر سکو اور (دن میں) فضلِ خداوندی کی جستجو میں چلو پھرو اور اس لئے تم شکر گزار بنو"!

آسمانی ہدایت کا سلسلہ رحمت خداوندی ہے

یہ انسان کی طبعی ضروریات کا انتظام تھا۔ اتنے حصہ میں تو انسان حیوان دونوں برابر ہیں. لیکن انسان صرف جسم سے عبارت نہیں اور اس کی ضروریات محض طبعی ضروریات ہی نہیں. اس میں جسم کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جسے انسانی ذات کہتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جو اس کے شرفِ انسانیت کا موجب ہے۔ لہٰذا انسان کے لئے اس کی طبعی نشوونما کے ساتھ ساتھ، اس کی ذات کی نشوونما کی ضرورت بھی لاینفک ہے۔

انسانی ذات کی نشوونما اُس آسمانی راہ نمائی کے ذریعے ہوتی ہے جسے وحی کہا جاتا ہے (تفصیل اس کی "ابلیس و آدم" میں وحی کے عنوان میں ملے گی) قرآن کریم نے بارش کی مثال کے ساتھ ہی اس آسمانی راہ نمائی کا بھی ذکر کیا ہے (دیکھئے ۴۱ ـــ ۳۰/۵۳) اور اسی نہج سے، رسول اللہ ﷺ کو نوعِ انسانی کے لئے خدا کی طرف سے رحمت قرار دیا ہے۔

وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ○ (۲۱/۱۰۷)۔

"اور ہم نے تمہیں نہیں بھیجا مگر اس لئے کہ تمام اقوامِ عالم کے لئے رحمت (کا ظہور) ہو"!

رسالت کس کے لئے رحمت ہے

لیکن جس طرح بارش کی فیض رسانی اُسی زمین کے لئے نفع بخش ہوتی ہے جو اپنے سینے کو قطراتِ رحمت کے جذب کرنے کے لئے کھول دے، اس کا اثر قبول کرنے کے لئے تیار ہو، زمینِ شور پر ابرِ نیساں ہزار گہرباری کرے، وہاں کبھی سُنبل و ریحاں پیدا نہیں ہوں گے۔ اسی طرح نبوت بھی انہی کے لئے آیۂ رحمت ہو سکتی ہے جو اس رحمت سے اثر اندوز ہونے کے لئے آمادہ ہوں۔ اس "آمادگی" کا نام ایمان ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ رسول کا رحمۃ للعالمین ہونا برحق۔ لیکن

وَ رَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ؕ (۹/۶۱)۔

"یہ رحمت اُنہی کے لئے ہے جو تم میں سے ایمان لائیں۔"

اس لئے کہ جیسا کہ آیات مذکورۂ صدر (۳۰/۴۸ – ۵۳) میں کہا گیا ہے، نہ مُردوں اور بہروں کو پیغام سُنا جاسکتا ہے، نہ اندھوں کو راستہ دکھایا جاسکتا ہے۔ مُردوں، بہروں اور اندھوں سے وہی لوگ مراد ہیں جن کے متعلق دوسری جگہ کہا ہے کہ

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ؗ وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ؗ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝ (۷/۱۷۹)۔

"وہ دل (تو) رکھتے ہیں مگر اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں رکھتے ہیں مگر ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان رکھتے ہیں مگر ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ یہ (انسان نہیں) حیوان ہیں، بلکہ ان سے بھی گئے گذرے (زیادہ بے راہ) کہ یہ لوگ غفلت شعار ہیں!

نبوّت خود نبی کے لئے بھی رحمت ہے

یہ تو تھا نبوّت کا تعلق دوسرے انسانوں کے ساتھ لیکن خود ایک نبی کو نبوّت کا ملنا بھی خدا کی رحمت سے ہوتا ہے (۱۱/۲۸ ؛ ۱۱/۶۳)۔ لیکن یہ رحمتِ خداوندی کسی کو اپنے کسب و ہنر سے نہیں ملتی۔ کوئی شخص اپنی کوشش سے نبی نہیں بن سکتا۔ خود نبی اکرمؐ کو نبوّت ملنے سے پیشتر اس بات کا علم تک نہ تھا کہ آپ اس منصبِ جلیلہ کے لئے منتخب ہونے والے ہیں۔ (۲۸/۸۶) دوسری جگہ ہے کہ اگر خدا چاہتا تو قرآن نازل کرنے کے بعد بھی اسے سلب کر لیتا مگر اس نے اپنی رحمت سے ایسا نہیں کیا۔ (۱۷/۸۶ – ۸۷)۔

مہبطِ رحمت کا انتخاب مشیّت پر موقوف ہے

اس رحمتِ خداوندی (یعنی نبوّت) کے لئے کسے منتخب کیا جائے گا، اس کا فیصلہ مشیّتِ ایزدی کے ماتحت ہوتا۔

وَ اللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ (۲/۱۰۵ ؛ ۳/۷۴ ؛ ۱۹/۵۰)۔

"اللہ اپنی رحمت کے لئے جسے چاہتا ہے مختص کر لیتا ہے۔ وہ صاحبِ فضلِ عظیم ہے"۔

کتبِ آسمانی نوعِ انسانی کے لئے رحمت

نبوت و رسالت سے مقصود لوگوں تک خدا کی ہدایت کا پہنچانا ہوتا ہے اور یہ ہدایت ان کتابوں کے ذریعے سے پہنچائی جاتی تھی جو ان حضرات انبیائے کرامؑ پر نازل کی جاتی تھیں۔ لہٰذا یہ آسمانی کتابیں نوعِ انسانی کے لئے رحمت ہیں۔ پہلی کتابیں اپنے اپنے وقت میں رحمت تھیں۔ پھر جب ان میں تحریف ہو گئی تو یہ رحمت اپنی مکمل شکل میں قرآنِ کریم میں محفوظ کر دی گئی۔ اب یہی کتاب تمام انسانوں کے لئے اور تمام زمانوں کے لئے رحمتِ خداوندی ہے۔ کتبِ سابقہ میں سے توریت کے متعلق فرمایا۔

وَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤى اِمَامًا وَّ رَحْمَةً ؕ (۴۶/۱۲؛ ۱۱/۱۷؛ ۷/۱۵۴؛ ۲۸/۴۳؛ ۶/۱۵۵)

"اور اس (قرآن) سے پیشتر موسےٰ کی کتاب امام اور رحمت تھی"۔

قرآن رحمت ہے

اور اب قرآنِ کریم رحمت ہے۔

وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۙ (۶/۱۵۵)۔

"اور یہ کتاب (قرآن) جس کو ہم نے نازل کیا ہے برکت والی ہے۔ پس اسی کا اتباع کرو اور تقویٰ اختیار کرو تاکہ تم پر رحمت کی جائے"۔

اس میں ہدایت ہے اس لئے یہ رحمت ہے۔ (۱۲/۱۱۱)۔ ایسی رحمت جو اُن اختلافات کو دور کرتی ہے جو اُممِ سابقہ نے اپنے مذاہب کے بارے میں پیدا کر رکھے تھے (۲۷/۷۶ – ۷۷)۔ صرف اُممِ سابقہ کے اختلافات ہی کو نہیں، بلکہ تمام اختلافات کو مٹانے والی کتاب اور یہی اس کی ہدایت اور رحمت ہونے کی دلیل ہے۔

وَ مَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِیْهِ ۙ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۝ (۱۶/۶۴)۔

"اور ہم نے تم پر یہ کتاب نازل ہی اس لئے کی ہے کہ تم ان باتوں کو واضح کر دو جن میں یہ لوگ اختلاف کرتے ہیں اور یہ ایمان والوں کے لئے ہدایت و رحمت ہے"۔

صرف مختلف فیہ امور ہی کو نہیں، بلکہ ہر معاملہ کو واضح کر دینے والی رحمت۔

وَ نَزَّلۡنَا عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ تِبۡيَانًا لِّكُلِّ شَيۡءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحۡمَةً وَّ بُشۡرٰى لِلۡمُسۡلِمِيۡنَ ۟ (۱۶/۸۹)۔

"اور ہم نے تم پر یہ کتاب نازل کی ہے جو ہر شے کو واضح کرنے والی ہے اور ہدایت اور رحمت اور بشارت مومنین کے لئے۔"

اس کی تفصیل و تبیین علمِ باری تعالےٰ کے مطابق ہوئی ہے' اس لئے اس میں کہیں غلطی کا امکان نہیں. یہ بھی اس کی رحمت کی دلیل ہے۔

وَ لَقَدۡ جِئۡنٰهُمۡ بِكِتٰبٍ فَصَّلۡنٰهُ عَلٰى عِلۡمٍ هُدًى وَّ رَحۡمَةً لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ۝ (۷/۵۲؛ ۱۰/۸۲؛ ۱۹/۵۱؛ ۳۱/۲-۳؛ ۴۱/۴)

"اور یقیناً ہم نے ان کے پاس ایسی کتاب پہنچا دی جس کو ہم نے اپنے علم (کامل) سے مفصل بنا دیا اور جو ایمان والوں کے لئے ہدایت و رحمت ہے۔"

جب یہ کتاب ایسی رحمت ہے تو اس رحمت کے عطیے پر نوعِ انسانی جس قدر بھی خوشیاں منائے کم ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَتۡكُمۡ مَّوۡعِظَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوۡرِ ۙ وَ هُدًى وَّ رَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۝ قُلۡ بِفَضۡلِ اللّٰهِ وَ بِرَحۡمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلۡيَفۡرَحُوۡا ؕ هُوَ خَيۡرٌ مِّمَّا يَجۡمَعُوۡنَ ۝ (۱۰/۵۷-۵۸)

"اے نوعِ انسانی! تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے موعظت اور دل کے امراض کی شفا آ گئی جو ہدایت اور رحمت ہے مومنین کے لئے. کہئے کہ اللہ کے فضل اور رحمت سے. پس اس سے انہیں خوش ہونا چاہیئے. وہ تو ان تمام چیزوں سے بہتر ہے جو یہ جمع کرتے رہتے ہیں۔"

لیکن، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اس رحمت سے مستفید ہونے کے لئے اپنے آپ کو اس کا اثر قبول کرنے کے لئے آمادہ کرنا ضروری ہے. چنانچہ قرآنِ کریم کے متعلق ہے کہ اس میں عبرت اور موعظت تو تمام نوعِ انسانی کے لئے ہے' لیکن یہ رحمت انہی کے لئے بنے گا جو اس کی صداقتوں پر یقین رکھیں گے۔

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ رَحۡمَةٌ لِّقَوۡمٍ يُّوۡقِنُوۡنَ ۝

(۴۵/۲۰؛ ۷/۲۰۳-۲۰۴)

"یہ بصائر ہے تمام انسانوں کے لئے اور ہدایت اور رحمت ہے ان کے لئے جو اس پر یقین رکھتے ہیں۔"

جو اس سرچشمہ ہدایت سے وابستہ ہو جائے گا، اللہ اسے اپنی رحمتوں سے نوازے گا۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا ○ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ اعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَیُدْخِلُهُمْ فِیْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ فَضْلٍ لا وَّ یَهْدِیْهِمْ اِلَیْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا ○ (۴/۱۷۴—۱۷۵)۔

"اے نوعِ انسانی! بے شک تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک دلیلِ واضح آپہنچی اور ہم نے تمہاری طرف ایک شمعِ نورانی نازل کر دی۔ پس جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور انہوں نے (قرآن) کا سہارا مضبوط پکڑ لیا تو اللہ انہیں اپنی رحمتوں (کے شامیانے) میں داخل کر لے گا اور اپنے فضل (سے نوازیگا) اور ان کو اپنی طرف ایک سیدھے راستے کی ہدایت کریگا۔

صراطِ مستقیم رحمت ہے

مذکورہ صدر آیت کے آخری حصہ پر غور کیجئے جس میں کہا گیا ہے کہ سفرِ زندگی میں ایک سیدھی اور توازن بدوش راہ کا مل جانا خدا کی رحمت ہے۔ ابلیسی قوتیں (جن کی تفصیل "ابلیس و آدم" میں ملے گی) ہمیشہ اس کوشش میں رہتی ہیں کہ انسان اس راستے کو چھوڑ کر اور راہیں اختیار کر لے۔ اُن کی ان مشئوم کوششوں سے محفوظ رہنا بھی خدا کی رحمت ہے۔ چنانچہ خود نبی اکرمؐ کے متعلق فرمایا۔

وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكَ وَ رَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ یُّضِلُّوْكَ ط (۴/۱۱۳)۔

"اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ایک گروہ ان (کفار میں سے) تو اس بات کا تہیہ کر چکا تھا کہ تمہیں راہِ راست سے بھٹکا دے"........

خارجی اثرات کے علاوہ خود اپنے قلب کے وساوس کی فتنہ سامانیوں سے محفوظ رہنا بھی خدا کی رحمت ہے۔ قصۂ حضرت یوسفؑ میں عزیز کی بیوی نے کہا کہ

وَ مَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ج اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ

رَبِّیْؕ اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ (۱۲/۵۳)۔

"میں اپنے آپ کی پاکیزگی کا دعویٰ نہیں کرتی کہ انسانی جذبات کو اگر بے باک چھوڑ دیا جائے تو وہ اسے برائی کی طرف مائل کرتے رہتے ہیں۔ اس سے وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جو خدا کی عطا کردہ راہ نمائی کے تابع چلے (اس کے متعلق کہا جائے گا کہ وہ رحمتِ خداوندی کے سائے میں ہے)۔ اس کا سایہ حفاظت اور رحمت عطا کرتا ہے۔ (نیز ۴/۸۳)۔

اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر سامنے لے آنا چاہیئے کہ جب یہ کہا جائے گا کہ ان وساوس وغیرہ سے خدا کی رحمت کے بغیر نہیں بچا جا سکتا، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس مقصد کے لئے انسان خود کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ صرف خدا کے "رحم و کرم" سے ہوتا ہے۔ یہ تصور قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ صرف خدا کی رحمت سے ہو سکتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ جب انسان وحیٔ خداوندی کی اطاعت کرے۔ اس لئے کہ (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) رحمتِ خداوندی، کے معنی وحیٔ خداوندی ہیں جو اب قرآن میں محفوظ ہے۔ لہٰذا ابلیسی سازشوں اور قلبی وساوس سے بچنے کا طریق صرف یہ ہے کہ انسان قرآن کا اتباع کرے اور اپنے جذبات سے اس کی راہ نمائی میں کام لے۔

شریعت میں آسانیاں رحمت ہیں

شریعت میں ایسی آسانیاں مل جانا جن سے قوانین ممکن العمل ہو جائیں، رحمتِ خداوندی ہے۔ مثلاً قانونِ قصاص کی رُو سے قتل کا بدلہ قتل ہے۔ لیکن ساتھ ہی فرمایا:

فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍؕ ذٰلِكَ تَخْفِیْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌؕ (۲/۱۷۸)؛ (۴/۹۲)

"لیکن اگر (قاتل کو) اس کے بھائی (مدعی) کی طرف سے معافی مل جائے تو (اس کے لئے) معقول طریقہ پر خون بہا کا مطالبہ ہے اور (قاتل کے لئے) خوبی کے ساتھ اس کا ادا کر دینا۔ یہ (قانونِ دیت وعفو) تمہارے پروردگار کی طرف سے سختیوں کا کم کر دینا اور رحمت ہے[1]۔"

---

[1] واضح رہے کہ دیت صرف قتلِ خطا (سہواً قتل) کے لئے ہے۔ قتلِ عمد میں دیت نہیں۔ (۹۲۔ ۴/۹۳)۔

لیکن یہ تخفیف و رحمت صرف خدا کے قانون کی رُو سے مل سکتی ہے کسی کے ذاتی جذبۂ ترحم کی رُو سے نہیں۔ اسلامی نظام کا فریضہ قوانینِ خداوندی کا نفاذ ہے اور اس کی تنفیذ میں ذاتی جذباتِ ترحم کو قطعاً دخل انداز نہیں ہونا چاہیئے (مثلاً فرمایا)

اَلزَّانِيَةُ وَ الزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّ لَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ (۲۴/۲)۔

"اور زناکار عورت اور زناکار مرد، ان میں سے ہر ایک کے سو کوڑے لگاؤ اور تم لوگوں کو ان کی بابت قانونِ خداوندی کے نافذ کرنے میں ذرا نرمی نہیں برتنی چاہیئے، اگر تم اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہو......"

مکافاتِ عمل کا قانون رحمت ہے

اس لئے کہ قانونِ مکافاتِ عمل ہی پر تو اس سلسلۂ کائنات کی بنیاد ہے اور یہ بھی خدا کی رحمت ہے۔

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ وَ لَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ○ (۶/۱۴۷)۔

"پھر اے رسول! اگر یہ لوگ تیری تکذیب کرتے ہیں تو کہہ دو کہ تمہارا رب بڑی وسیع رحمت والا ہے اور اس کی سزا مجرمین کی جماعت سے کبھی ٹل نہیں سکتی!"

اس لئے کہ اگر اعمالِ بد کی سزا نہ ہو تو لوگ اپنی سرکشی میں حدود فراموش ہو جائیں اور دنیا میں شریفوں کے لئے جینا محال ہو جائے۔

وَ لَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَ كَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ○ (۲۳/۷۵)۔

"اور اگر ہم ان سے نرمی برتیں اور ان پر جو سختی ہے وہ دُور کر دیں، تو یہ لوگ اپنی سرکشی میں اندھادھند آگے بڑھتے جائیں۔"

قانونِ مکافات افراد تک ہی محدود نہیں رہتا، قوموں کا عروج و زوال بھی اسی کے ماتحت ہوتا ہے۔

وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ط وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ○

وَ رَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ؕ (۱۳۳—۱۳۲/۶)۔

"اور ہر ایک کے مدارج اُن کے اعمال کے مطابق ہیں اور تیرا رب ان کے اعمال سے بے خبر نہیں۔ اور تیرا رب مستغنی اور صاحبِ رحمت ہے۔ اگر وہ چاہے تو اپنے قانونِ مشیت کے مطابق تمہیں نیست و نابود کردے اور تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے جیسا کہ اس نے تمہیں کسی قوم ماسبق کی ذریت سے پیدا کر دیا۔

مُہلت کا زمانہ بھی رحمت ہے

کسی عمل کے ارتکاب اور اس کے نتیجہ کی برآمدگی کے درمیان ایک وقفہ رکھا گیا ہے تاکہ بھُولے سے غلطی کر جانے والے اس دوران میں اپنی اصلاح کر سکیں۔ اسے مُہلت کا زمانہ کہتے ہیں اور یہ رحمتِ خداوندی ہے۔

وَ رَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ؕ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا ۞ (۱۸/۵۸)۔

"اور تیرا رب حفاظت عطا کرنے والا اور صاحبِ رحمت ہے۔ اگر وہ لوگوں کو ان کے اعمال کی سزا (جلد) دینا چاہتا تو ان کے لئے عذاب میں عجلت کرتا، لیکن ان کے لئے ایک وقتِ معیّن ہے جس کے آجانے پر، پھر کہیں پناہ نہیں مل سکے گی۔"

اگر کوئی فرد یا قوم، محسوس کرلے کہ اس کا کوئی قدم غلط سمت کی طرف اٹھ گیا ہے، تو اُسے چاہیئے کہ وہ فوراً اُلٹے پاؤں لوٹے اور جہاں سے قدم غلط سمت کی طرف اُٹھ گیا تھا وہاں واپس آجائے۔ اس کے بعد اپنا قدم صحیح سمت کی طرف اٹھالے۔ غلط راستے سے واپس آجانے کو تَابَ اور اس کے بعد صحیح راستے کی طرف قدم بڑھانے کو اَصْلَحَ کہتے ہیں۔ اس سے انسان ان مضراثرات سے محفوظ ہو جاتا ہے جو غلط سمت کی طرف جانے سے مرتّب ہوئے تھے۔ اُسے مَغْفِرَتْ کہتے ہیں۔ "قانونِ مکافات" میں ان امور کی گنجائش رکھنا خدا کی رحمت ہے۔

توبہ کی قبولیت بھی رحمت ہے

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى

اَنۡفُسِهِمۡ لَا تَقۡنَطُوۡا مِنۡ رَّحۡمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ جَمِيۡعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ ۝ (۳۹/۵۳)۔

"کہہ دو کہ اے میرے بندو جنہوں نے اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں، خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہونا۔ اللہ تمہاری تمام لغزشوں کے مضر اثرات سے تمہاری حفاظت کرسکتا ہے؟"

بشرطیکہ یہ لغزش سہواً ہوئی ہو، ضد اور سرکشی سے نہ ہو اور پھر بعد میں اصلاح بھی کرلی جائے۔

وَ اِذَا جَآءَكَ الَّذِيۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلۡ سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ كَتَبَ رَبُّكُمۡ عَلٰى نَفۡسِهِ الرَّحۡمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنۡ عَمِلَ مِنۡكُمۡ سُوۡٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ وَ اَصۡلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۝ (۶/۵۴)

"اور جب تمہارے پاس (اے رسول) وہ لوگ آئیں جو ہماری آیات پر ایمان لاچکے ہوں، تو (ان سے) کہو کہ تم سلامتی میں ہو۔ تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کر رکھا ہے۔ اگر تم میں سے کوئی شخص نادانی سے ...... لغزش کر بیٹھے پھر اس کے بعد توبہ کرلے اور اصلاح کرلے تو وہ غفور الرحیم ہے۔"

لیکن اگر انسان اس کے بعد پھر سرکشی اختیار کرلے تو اس کا خمیازہ بھگت کر رہے گا، یعنی ایک بار کی توبہ، مغفرت کا مستقل پروانہ نہیں ہوسکتی۔

عَسٰى رَبُّكُمۡ اَنۡ يَّرۡحَمَكُمۡ ۚ وَاِنۡ عُدۡتُّمۡ عُدۡنَا ۘ وَجَعَلۡنَا جَهَنَّمَ لِلۡكٰفِرِيۡنَ حَصِيۡرًا ۝ (۱۷/۸)۔

"شاید تمہارا خدا تم پر رحم کرے۔ لیکن اگر تم (توبہ سے) پھر گئے تو ہماری طرف سے بھی پاداشِ عمل لوٹ آئے گی اور اس نے اس طرح منہ موڑنے والوں کے لئے جہنم کا ٹھکانہ تیار کر رکھا ہے۔"

قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق، غلط اعمال کے فطری نتائج کا نام عذاب ہے، جو رحمت کی ضد ہے، یعنی رحمت میں انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے، عذاب میں اس کی نشوونما رک جاتی ہے اور وہ شرفِ انسانیت سے محروم رہ جاتا ہے اسی لئے قرآن نے عذاب کو رحمت کے مدمقابل بیان کیا ہے۔

يُعَذِّبُ مَنۡ يَّشَآءُ وَيَرۡحَمُ مَنۡ يَّشَآءُ ۚ وَاِلَيۡهِ تُقۡلَبُوۡنَ ۝ (۲۹/۲۱)

"عذاب اور رحمت کا فیصلہ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے اور اسی کی طرف لوٹنا ہے۔"

دوسری جگہ ہلاکت کے مقابلہ میں رحمت فرمایا۔ (۲۸/۴۷)، اس لئے کہ ہلاکت اور تباہی سے بڑھ کر اور کونسا عذاب ہوسکتا ہے؟ قرآنِ کریم نے خطرات سے محفوظ رکھے جانے کو بھی رحمت کہا ہے۔ (۳۶/۴۴)۔ اسی طرح جو مصائب جنگ کے ساتھ اُمنڈ کر آتے ہیں، ان سے محفوظ رکھے جانا بھی رحمت ہے۔ (۴۸/۲۵)۔

عذاب سے نجات مل جانا رحمت ہے

قوموں کی بعض غلطیاں تو ایسی ہوتی ہیں جن سے وہ ہمیشہ کے لئے قعرِ مذلت میں گر جاتی ہیں اور اس سے پھر وہ نکل نہیں سکتیں، لیکن بعض لغزشیں ایسی ہوتی ہیں جن کے نتائج (سزا) سے رستگاری بھی ہوسکتی ہے۔ اسے "عذاب کے بعد نجات" ملنا کہتے ہیں۔ اسے بھی خدا کی رحمت سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی کسی قوم کا ہمیشہ کے لئے زندگی کی تیش پہلو سے محروم نہ ہو جانا بلکہ ان میں باز آفرینی کے امکانات کا موجود رہنا، رحمت ہے۔ چنانچہ جب بنی اسرائیل کو فرعون کے استبداد سے رستگاری حاصل ہوئی ہے تو اُسے خدا کی رحمت کہا گیا۔ (۸۶-۱۰/۸۵)۔ قوم نوحؑ کو جب تباہی کے عذاب نے چاروں طرف سے گھیر لیا تو حضرت نوحؑ نے فرمایا؛

لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ (۱۱/۴۳)۔

"آج کے دن خدا کے عذاب سے کوئی پناہ نہیں دے سکتا مگر اسے جس پر اللہ رحم کرے"۔

اسی طرح جب دیگر اقوامِ سلف کو عذاب نے گھیر لیا تو ان میں سے جن عبادِ صالحین کو بچا لیا گیا اسے بھی رحمتِ خداوندی کہا گیا۔ (۱۱/۶۶؛ ۱۱/۹۴؛ ۷۵-۲۱/۷۴؛ ۷/۷۲؛ ۱۱/۵۸)۔

اُخروی عذاب سے محفوظ رکھے جانا بھی رحمت ہے

یہ تو تھا اس دنیا کے عذاب کے متعلق۔ عذابِ اُخروی کے متعلق بھی یہی فرمایا کہ اس سے محفوظ رکھے جانا بھی خدا کی رحمت ہے۔

مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ؕ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ۝ (۶/۱۶)؛ (۴۰/۹)؛ ۴۲-۴۴/۴۱؛ ۷/۴۹؛ ۳/۱۰۶)۔

"جس سے اس دن کا عذاب الگ رکھا گیا، تو یقیناً اس پر (اللہ نے) رحم کیا اور یہ ایک کھلی ہوئی کامیابی ہوگی۔

جنّت رحمت ہے

اہلِ اعراف جہنم والوں سے کہیں گے کہ دیکھو جنت میں وہی لوگ ہیں

جن کی بابت تم قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے تھے کہ ان پر اللہ رحمت نہ کریگا۔ (دیکھ لو انہی سے کہا گیا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ۔ تم پر نہ کچھ اندیشہ ہے نہ تم مغموم ہو گے۔

اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ؕ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَ لَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ○ (۷/۴۹)۔

ایمان و عملِ صالح کی بنا پر اسی جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ (۹/۲۱—۲۲)۔ یہی فوزِ مبین ہے، یعنی بڑی کامیابی۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ○ (۴۵/۳۰)۔

"پس وہ لوگ جو ایمان کے ساتھ عملِ صالح کریں گے ان کو اللہ اپنی رحمت میں داخل کریگا اور یہی بڑی کامیابی ہے (کھلی ہوئی کامیابی)۔"

اب دُنیاوی زندگی میں ابرِ رحمت کی دُر فشانیاں دیکھئے۔ اولادِ صالح کا عطا ہونا اس کی رحمت سے ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اپنی کبر سنی میں اولاد سے مایوس ہو چکے تھے۔ اس وقت اللہ نے اپنی رحمت سے ان کا دامنِ مراد گوہرِ مقصود سے بھر دیا۔ چنانچہ جب خدا کے فرستادہ پیغام رسانوں نے انہیں اور ان کی بیوی کو اولاد کی بشارت دی تو وہ متعجب ہو گئیں۔ اس پر انہوں نے کہا کہ

اولادِ صالح

اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ○ (۱۱/۷۳)۔

"کیا تم خدا کے کاموں میں تعجب کرتی ہو۔ اے اہلِ خانہ تم پر خدا کی رحمت اور اس کی برکات ہوں۔ بیشک وہ ہر قسم کی حمد و ستائش کا سزاوار اور بڑی شان والا ہے۔"

اسی طرح حضرت یحییٰؑ کی پیدائش کے متعلق فرمایا۔

ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۚۖ ..... (۱۹/۲)

تیرے رب نے اپنے بندہ زکریا پر جو رحمت کی اس کا ذکر

اس کے بعد حضرت یحییٰؑ کی پیدائش کا ذکر ہے۔

معاملات کا سلجھتے جانا | انسان کے معاملات میں عمدہ شکل کا پیدا ہوتا جانا بھی خدا کی رحمت ہے۔ اصحابِ کہف کے متعلق فرمایا:

فَأْوٗا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَ يُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ٥ (۱۸/۱۶)۔

"تم غار میں پناہ لے لو۔ تمہارا رب تمہاری طرف اپنے (دامنِ) رحمت کو پھیلا دے گا اور تمہارے معاملات میں عمدگی کی شکل پیدا کردیگا۔"

عمدہ رفیق مل جانا | دنیا میں کسی بہترین رفیق اور مددگار کا مل جانا بھی رحمتِ ایزدی ہے۔ حضرت ہارونؑ کے متعلق ارشاد ہے۔

وَ وَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ٥ (۱۹/۵۳)۔

"اور ہم نے (موسیٰؑ کو) اپنی رحمت سے اس کا بھائی ہارون نبی عطا کیا۔"

صالحین کی جماعت میں شامل ہوجانا تو اتنی بڑی رحمت ہے جس کے لئے بڑے بڑے انبیاء کرامؑ دعائیں مانگا کرتے تھے۔ حضرت سلیمانؑ نے وادیٔ نمل سے گزرتے وقت عرض کیا تھا۔

وَ اَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ٥ (۲۷/۱۹)۔

"اور مجھ کو اپنی رحمت سے صالح بندوں کے زمرے میں شامل کرلینا۔"

حکومت و سطوت | اس لئے کہ اس سے اس دنیا میں وہ بڑی رحمت ملتی ہے جو مومنین کی جماعت کا امتیازی نشان ہے، یعنی اس سے تمکن فی الارض، سلطنت اور حکومت حاصل ہوتی ہے۔ حضرت یوسفؑ کو جب اس رحمتِ خاص سے نوازا گیا تو فرمایا:

وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَ لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ٥ (۱۲/۵۶)

"اسی طرح ہم نے یوسف کو تمکن فی الارض عطا کیا۔ اسے ملک کے ہر حصہ میں اختیار حاصل تھا۔ اور جسے ہم چاہتے ہیں (اپنے قانون کے مطابق) اپنی رحمت عطا کردیتے ہیں اور ہم محسنین کا اجر ضائع نہیں کرتے۔"

آگے بڑھنے سے پیشتر یہ بھی دیکھتے جائیے کہ یہ رحمت ملتی کس طرح سے ہے فرمایا:

وَ عَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ..... وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ o (۵۵ــــ۵۶/۲۴)۔

"اور جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں اور عملِ صالح کریں تو اللہ ان سے وعدہ کرتا ہے کہ ان کو دنیا میں حکومت عطا کریگا، جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو اس نے حکومت عطا کی تھی اور جس دین کو اللہ نے ان کے لئے پسند کیا ہے اسے مضبوط رکھے گا اور ان کا خوف امن سے بدل دے گا (بشرطیکہ) وہ میری ہی محکومی اختیار کریں اور میرے ساتھ کسی اور کو آقا نہ بنا رکھیں اور جو اس کے بعد کفر کریگا، سو وہ لوگ فاسق ہوں گے اور نظامِ صلوٰۃ قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔"

اس اجمال کی تفصیل تو اپنے مقام پر آئے گی، یہاں سے اتنا معلوم ہوگیا کہ اس رحمتِ خداوندی کا مستحق بننے کے لئے جن لاینفک شرائط کے پورا کرنے کی ضرورت ہے، وہ ہیں۔

(۱) ایمان (۲) اعمالِ صالح (۳) صرف خدا کی محکومی (۴) اس کے سوا کسی اور کو آقا اور حاکم نہ بنانا (۵) اقامتِ صلوٰۃ (۶) ایتاءِ زکوٰۃ اور (۷) اطاعتِ رسول۔

یعنی اقامتِ صلوٰۃ سے جماعت، امامت، تنظیم، مرکزیت کا استحکام اور ادائے زکوٰۃ سے نوعِ انسانی کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانے کا انتظام اور یہ سب نظامِ خداوندی کی اطاعت سے۔

اختلافات کا مٹ جانا

چونکہ یہ استخلاف فی الارض اور اعمالِ صالح کا فطری نتیجہ ہوتا ہے اس لئے باقی اس وقت تک رہتا ہے جب تک یہ قوم، ایمان اور اعمالِ صالح پر قائم رہے اور اس کے لئے شرطِ اولین یہ ہے کہ یہ فرقہ بندی اور پارٹی بازی کی لعنت میں گرفتار نہ ہو جائے۔ اُمت کا امتِ واحدہ رہنا خدا کی رحمت ہے۔

وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ o لا اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ط (۱۱۸ــــ۱۱۹/۱۱)۔

"اور اگر تیرا رب چاہتا تو تمام نوعِ انسانی کو ایک امتِ واحدہ بنا دیتا (یعنی انسانوں کو جبراً ایک

راہ پر چلاتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا) اور لوگ اختلاف کرتے رہیں گے، مگر جس پر اللہ کی رحمت ہو"......

یعنی جس قوم پر اللہ کی رحمت ہوتی ہے، وہ اختلافات سے بچ کر ملتِ واحدہ بن جاتی ہے اور قرآن کریم تو ملا ہی اس لئے ہے کہ اختلافات مٹ جائیں۔

وَ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ (۱۶/۶۴)۔

"اور ہم نے اس کتاب کو تم پر نازل ہی اس لئے کیا ہے کہ جن باتوں میں یہ لوگ اختلاف کرتے ہیں، ان کو ظاہر کر دے اور یہ ان کے لئے ہدایت اور رحمت ہے جو ایمان رکھتے ہیں۔"

اس کتابِ مبین کے بعد اختلافات اور تفرقہ انگیزی، خدا کی رحمت سے بُعد، توحید سے عملی انکار اور (قرآن کریم کے الفاظ میں) شیوۂ مشرکانہ ہے۔

وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝ (۳۰/۳۱-۳۲)

"اور (دیکھنا! کہیں توحید کے بعد) مشرکین میں سے نہ ہو جانا، یعنی ان لوگوں میں سے جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ انگیزی کر دی اور (یوں) خود بھی ایک فرقہ بن (کر بیٹھ) گئے۔ (اس طرح حالت یہ ہو جاتی ہے کہ) ہر گروہ اپنے مسلک کو (مسلکِ حقہ سمجھ کر اسی) میں مگن ہو رہتا ہے۔

توحید سے عملاً مفہوم، ہم آہنگی اور یک نگہی ہے۔ ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب، ایک صراطِ مستقیم، اس پر گامزن ایک اُمت، پھر تفرقہ کس بات میں؟ وحدت فی الخیال والعمل، یہی خدا کی رحمت ہے۔ جماعتِ مومنین کا تو شعار ہی یہ ہوتا ہے کہ

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ...... (۴۸/۲۹)۔

محمد، اللہ کا رسول اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ہیں (ان کی کیفیت یہ ہے کہ آپس میں ایک دوسرے سے نرمی اور محبت سے پیش آتے ہیں، لیکن کفار کے مقابلہ میں نہایت سخت ہیں۔

قوت اور مدافعت کے سامان رحمت ہیں

یہ تو تھی سلطنت اور حکومت کے استحکام کے لئے اندرونی تنظیم، قلب و نظر کا انقلاب ــــ خارجی انتظام کے متعلق فرمایا کہ دشمنوں کی ضرر رسانی سے مدافعت کا سامان مہیا کرنا بھی رحمت ہے۔ سدِ ذوالقرنین، جو حملہ آوروں کے اُمنڈتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے گویا ایک بند بنایا گیا تھا، اللہ کی رحمت تھی۔

فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَ مَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ۝ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ...... (۹۸-۱۸/۹۷)۔

"سو وہ (حملہ آور) نہ تو اس کو پھاند سکتے تھے نہ ہی اس میں سُرنگ لگا سکتے تھے۔ ذوالقرنین نے کہا یہ میرے رب کی رحمت ہے"......

یہاں ایک اور نُکتہ بھی قابلِ غور ہے، یعنی دین کی تکمیل تصویر کے ان دونوں رُخوں سے ہی ہوتی ہے۔ قلوب میں رافت اور رحمت بھی ہو اور ساتھ ہی ساتھ اتنی قوت بھی موجود ہو کہ مخالفین کا مقابلہ کر سکیں۔ برعکس اس کے عیسائی رہبان کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے (اور وہ خود بھی اس کے مدعی ہیں) کہ ان کے ہاں صرف رافت ہے، قوت نہیں ہے۔

وَ جَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّ رَحْمَةً ؕ وَ رَهْبَانِيَّةَ ِۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ (۵۷/۲۷)۔

"......اور جن لوگوں نے (عیسٰی ابنِ مریم) کا اتباع کیا ہم نے (ان کے عقیدہ اور مسلک کے نتیجہ میں) ان کے دلوں میں شفقت اور رحمت پیدا کر دی اور انھوں نے رہبانیت کو خود ایجاد کر لیا۔ ہم نے اس کو ان پر واجب نہیں کیا تھا۔"

یعنی ان میں صرف ایک جوھر تھا اس لئے دین مکمل نہیں تھا۔ اسی لئے شروع شروع میں تو انھوں نے فقدانِ قوت کے باعث ترکِ علائق اور گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی، لیکن جب ان کے ہاتھ میں سلطنت آئی تو دوسرے حصہ کی تکمیل کے لئے انھیں خالص دُنیادار بننا پڑا ہے اور رحمت اور قوت میں امتزاج پیدا نہ کر سکنے کے باعث یکسر لادین ہو گئے۔ اگر یورپ کو ان دونوں پہلوؤں سے مکمل دین مل جاتا تو وہ یوں سرکشی اختیار نہ کرتا۔

رحمتِ الٰہی سے نااُمیدی کفر ہے

یہ تھا وہ طریق جس سے رحمتِ خداوندی باقی رہتی ہے لیکن اگر قوم کی بداعمالیوں کے باعث یہ رحمت ان سے چھن جائے، سلطنت اور حکومت، غلامی اور محکومی سے بدل جائے، تو بھی خدا کی رحمت سے نااُمید نہیں ہونا چاہیئے ایسی نااُمیدی کفر ہے۔ اس لئے کہ یہ دراصل اس بات کا عملی اقرار ہے کہ قانونِ خداوندی میں یہ صلاحیت نہیں کہ اس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے چھنی ہوئی عظمتیں پھر سے واپس مل جائیں اور یہی کفر ہے۔

وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ لِقَآئِهٖٓ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ (۲۹/۲۳)

"اور جو لوگ خدا کے قوانین اور ان کی نتیجہ خیزی سے انکار کرتے ہیں (کفر کرتے ہیں) وہ لوگ میری رحمت سے نااُمید ہیں اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔"

یہ گمراہی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا۔

وَ مَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ○ (۱۵/۵۶)۔

"اور اپنے رب کی رحمتوں سے سوائے گمراہ انسانوں کے اور کون نااُمید ہو سکتا ہے۔"

اسی لئے اللہ نے "اپنے" بندوں کے متعلق فرمایا۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ○ (۳۹/۵۳)۔

"کہیئے کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنے اُوپر زیادتیاں کی ہیں، خدا کی رحمت سے نااُمید نہ ہونا۔ اللہ تمام لغزشوں کے مضر اثرات سے تمہاری حفاظت کا سامان بہم پہنچا دیگا۔"

وہ خدا جو اُس وقت ابرِ نیساں کو حکمِ گہرباری دیتا ہے، جب دنیا بارش سے بالکل مایوس ہو چکی ہوتی ہے۔

وَ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَ يَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ؕ وَ هُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ ○ (۴۲/۲۸)۔

"اللہ وہ ہے جو نااُمیدی کے بعد بارش برساتا ہے اور اپنی رحمت پھیلاتا ہے اور وہ سب کا کارساز ہے اور قابلِ حمد و ستائش ہے۔"

دامانِ رحمت کی حدود فراموش وسعتیں خدا کی رحمتوں کے خزانے کبھی خالی نہیں ہو سکتے۔ یہ تو انسان کی کوتاہ دامنی ہے کہ وہ انھیں اپنے پیمانوں سے ماپتا ہے۔

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا (۱۷/۱۰۰)۔

"کہیئے کہ میرے رب کی رحمتوں کے خزانوں کے تم مالک ہوتے تو خرچ ہو جانے کے ڈر سے تم انھیں یقیناً روکے رکھتے۔ انسان بڑا ہی تنگ دل ہے۔ (وہ رحمتِ الٰہی کی وسعت کا اندازہ نہیں کر سکتا)۔"

اس کی رحمتیں تو ہر شے کو محیط ہیں۔

رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا (۴۰/۷)۔

"اے ہمارے پروردگار! تیری رحمت اور علم ہر شے کو گھیرے ہوئے ہے"۔

اس لئے جب اس کا قانونِ رحمت اپنا دستِ کرم کشادہ کرنا چاہے تو اسے کون روک سکتا ہے؟

قُلْ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ۭ...... (۳۳/۱۷) نیز (۳۵/۲) و (۳۹/۳۸)۔

"کہیئے کہ وہ کون ہے جب خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے تم پر تباہی آئے تو وہ تمہیں اس سے بچا سکے یا وہ تم پر اپنی رحمت کرنا چاہے تو اسے روک دے"!

رحمت کے استحقاق کی شرائط لیکن اس کی رحمت ہمیشہ مشروط ہوتی ہے۔ جب ان شرائط کو پورا کیا جائے تب یہ رحمت نصیب ہوتی ہے۔ مثلاً جب حضرت موسیٰؑ نے دعا مانگی کہ ان کی امت کو (آخر تک) رحمتوں سے نوازا جائے تو اس کے جواب میں کہا گیا کہ نزولِ قرآن کے بعد، یہ رحمت مشروط ہو جائے گی، قرآن کے اتباع سے۔

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝...... اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (۷/۱۵۶-۱۵۷)

"اور میری رحمت ہر شے کو محیط ہے۔ پس میں ان لوگوں کے لئے رحمت لکھ دوں گا جو تقویٰ شعار ہوں گے اور اپنا نے زکوٰۃ کریں گے اور ہمارے قوانین پر ایمان لائیں گے، یعنی وہ لوگ جو اس نبیٔ اُمّی کا اتباع کریں گے جس کے (ظہور کی خبر کو) یہ لوگ اپنے ہاں توریت و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ (وہ انھیں معروف کا حکم دیگا منکر سے روکے گا) اور ان کے لئے طیب کو حلال کریگا خبائث کو حرام کریگا اور ان کے بوجھ اور طوق و سلاسل کو ان سے دُور کرے گا۔ پس جو لوگ اس (نبی) پر ایمان لائیں گے اور اسے تقویت دینگے اور اس کی مدد کریں گے اور اس نور کا اتباع کریں گے جو اس کے ساتھ نازل کیا جائے گا وُہی لوگ کامیاب ہوں گے۔"

اور اطاعتِ خدا اور رسول کا عملی نشان یہ ہے کہ مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے دست و بازو ہوں۔ (۹/۷۱)۔ اور اس کے بعد اپنی زندگی یکسر مجاہدانہ بنالیں کہ خدا کی رحمتیں انہی لوگوں کے ساتھ ہیں جو اس جہانِ تگ و دَو میں حکومتِ الٰہیّہ کے قیام کی خاطر جہادِ مسلسل اور سعیٔ پیہم کی زندگی بسر کرتے ہیں اور وقت پڑنے پر ہر محبوب سے محبوب شے کو چھوڑ دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ہجرت دراصل اسی جذبہ کا نام ہے۔ وطن چھوڑ دینا اسی کی ایک شق ہے۔ یہی لوگ رحمتِ خداوندی کے امیدوار بن سکتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ جَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (۲/۲۱۸)

"یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور خدا کے راستہ میں جہاد کیا وُہی رحمتِ خداوندی کی اُمید کر سکتے ہیں اور اللہ غفور الرحیم ہے۔"

نہ وہ لوگ جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہوں۔ "بیٹھنے والوں کا دوڑنے والوں" سے کیا مقابلہ؟ (۴/۹۵-۹۶) اور یہ کچھ وقتی اور ہنگامی جذبات کے ماتحت نہ کیا جائے، بلکہ مستقل مزاجی سے کیا جائے، جم کر کیا جائے۔ اس لئے کہ خطرات کا مقابلہ ایک چٹان ہی کر سکتی ہے جو اپنے پاؤں پر محکم و استوار کھڑی ہو، نہ کہ ریت کے ذرّے جو ہر موجِ تیز کے ساتھ بہہ جانے پر آمادہ ہوں۔ اس مستقل مزاجی، ہمت نہ ہارنے اور جی نہ چھوڑنے کا نام قرآن کریم کی اصطلاح میں 'صبر' ہے اور خدا کی رحمتیں صابرین کے ساتھ ہوتی ہیں۔

وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِدْرِيْسَ وَ ذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ۚۖ وَ اَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (۲۱/۸۶-۸۵)

"اور اسماعیل اور ادریس اور ذاالکفل تمام صابرین میں سے تھے۔ ان کو ہم نے اپنی رحمت میں داخل کر لیا کہ وہ صالحین میں سے تھے!"

یہی وہ خصوصیت ہے جسے قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ فرمایا۔

وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ ...... وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝

(۲/۱۵۷ — ۱۵۵)

"یقیناً ہم خوف اور بھوک اور اموال اور نفوس اور ثمرات کی کمی سے تمہاری نمودِ ذات کے مواقع بہم پہنچا دیں گے۔ سو ان مستقل مزاج مومنین کو خوشگوار نتائج کی بشارت دیدو جن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب وہ کسی مشکل معاملہ سے دوچار ہوتے ہیں تو بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ ہم نے تو اپنے آپ کو خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ اس لئے ہمارا ہر قدم اسی منزل کی طرف اٹھے گا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خدا کی طرف سے تبریک و تہنیت کے مستحق اور اس کی رحمتوں کے سزاوار ہوتے ہیں۔ یہی لوگ زندگی کے صحیح راستے پر گامزن ہیں"۔

کھوئی ہوئی عظمتوں کی بازیابی رحمت ہے

جب ایمان و عمل کی یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو پھر خدا کی رحمتیں خود ایسے بندوں کی تلاش میں نکلتی ہیں۔ کھوئی ہوئی دولتیں، لٹی ہوئی عظمتیں، دبے ہوئے خزانے پھر سے مل جاتے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کے قصہ میں جب اُن یتیم بچوں کو ان کا دفینہ دیا گیا تو اُسے اللہ نے اپنی رحمت قرار دیا۔

فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَ يَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖۗ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ ...... (۱۸/۸۲)۔

"اور جب تیرے رب نے ارادہ کیا کہ وہ (بچے) بلوغت کو پہنچ جائیں اور (پھر) اپنا دبا ہوا خزانہ (دیوار کے نیچے سے) نکالیں، (یہ) رحمت تھی تیرے رب کی طرف سے"۔

اور صبرِ ایوبؑ کا صلہ یوں دیا گیا کہ ان کا کھویا ہوا گھر بار اور اس کے ساتھ اتنا ہی کچھ اور واپس دیا گیا۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّ اٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ

مَّعَہُمْ رَحْمَۃً مِّنْ عِنْدِنَا وَ ذِکْرٰی لِلْعٰبِدِیْنَ ○ (۲۱/۸۴)۔

"اور ہم نے اس کی دُعا قبول کر لی اور اس سے تکلیف کو دُور کر دیا اور اس کو اس کے گھر بار والے اور ان کے مثل ان کے ساتھ اور (واپس) دیدیئے (یہ) رحمت (تھی) ہماری طرف سے اور عابدین کے لئے ایک یادگار!"

ایمان و تقویٰ سے رحمتوں کے دُگنے حصّے ملتے ہیں اور ایک ایسی نُورانی شمع ہاتھ آجاتی ہے جس کی روشنی میں ساری دنیا کی امامت کی جا سکتی ہے.

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ یُؤْتِكُمْ كِفْلَیْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَ یَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۙۚ (۵۷/۲۸)۔

"اے ایمان والو! تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ. اللہ تم کو اپنی رحمت سے دُگنا حصہ دے گا اور تم کو ایسا نور عطا کرے گا کہ تم اس کو لئے ہوئے (دنیا میں) چلتے پھرتے رہو گے (تمام راستے روشن ہو جائیں گے) اور وہ تم کو مغفرت عطا کریگا. اللہ غفور الرحیم ہے."

یہ ہے رحمت سے مایوس نہ ہونے کا طریق.

انسان کا عجیب ردِّ عمل

لیکن انسان عجیب مخلوق ہے۔ اسے اللہ اپنی رحمتوں سے نوازتا ہے تو یہ رُوگردانی اختیار کر لیتا ہے. سمجھتا ہے کہ یہ سب کچھ اسی کی ہنرمندیوں کی بدولت ملا ہے. کہاں کا خدا اور کون سی اس کی رحمت! اور جب وہ رحمتیں اس سے چھن جاتی ہیں، تو یوں مایوس ہو جاتا ہے، گویا اس کا اب کوئی آسرا باقی نہیں رہا۔

وَ لَئِنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَیَقُوْلَنَّ هٰذَا لِیْ ۙ..... (۴۱/۵۰)۔

"اور اگر ہم انسان کو اس کی تکلیف کے بعد جو اُسے پہنچی تھی، اپنی رحمت سے لذت اندوز کرا دیتے ہیں، تو وہ کہتا ہے کہ یوں تو میرے لئے ہونا ہی تھا"....

وَ اِنَّاۤ اِذَاۤ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ○ (۴۲/۴۸)۔

"جب انسان کو اپنی رحمت سے بہرہ یاب کرتے ہیں، تو وہ خوش ہوجاتا ہے، لیکن جب اس کے اپنے اعمال کے باعث تکلیف پہنچتی ہے تو وہ کفر کرنے لگ جاتا ہے" (نیز ۳۰/۳۶؛ ۳۰/۳۳؛ ۱۰/۲۱)۔

حالانکہ چاہیئے یہ تھا کہ جب سامانِ زیست کی فراوانیاں اور انسانی صلاحیتوں کی روانیاں (یعنی خدا کی رحمتیں) حاصل ہوتیں تو انہیں قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کیا جاتا۔ (کہ شکر سے یہی مراد ہے) اور جب اپنی غلط

رحمت کے لئے دعائیں

روش کی وجہ سے انسان ان سے محروم ہو جائے تو پہلے سے بھی زیادہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کی جائے تاکہ غلط روش کے مضر اثرات بھی مٹ جائیں اور اس کے بعد ان اعمال کے تعمیری نتائج سے یہ رحمتیں دوبارہ حاصل ہو جائیں۔ یاد رکھئے! انسانی زندگی کے لئے یہ رحمتیں اس قدر اہم ہیں کہ خدا کے اولوالعزم انبیائے کرامؑ تک ان کی آرزوئیں کرتے رہے ہیں۔ (۷/۱۵۱؛ ۲۷/۱۹) اور وہ بڑے بڑے پیشوایانِ اُمم و ملل بھی، جن کو اُن کے متبعین اُن کی عظمت و تقدس کی بنا پر معبود بنا لیتے ہیں، وہ بھی خدا سے رحمت کے ملتجی رہتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَ يَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ..... (۱۷/۵۷)۔

"وہ لوگ جنہیں یہ (معبود بنا کر) پکارتے ہیں، (اُن کی خود حالت یہ ہے کہ) وہ اعمالِ حسنہ کے ذریعے قربِ خداوندی کی طلب و آرزو رکھتے ہیں۔ نیز اللہ کی رحمت کے اُمیدوار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں۔"

یہی دعا نبی اکرمؐ کی وساطت سے ملتِ اسلامیہ کو سکھائی گئی۔

وَ قُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَ ارْحَمْ وَ اَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ○ (۲۳/۱۱۸)

"اور کہو! اے اللہ مجھے سامانِ حفاظت دے اور رحمت عطا کر کہ تو بہترین رحمت عطا کرنے والا ہے۔"

پھر کئی مقامات پر اس کا اعادہ فرمایا کہ خدا کے بندے کس طرح رحمت کی آرزوئیں کیا کرتے ہیں۔ سورۂ بقرہ کی آخری آیت میں جو جامع دعا سکھائی گئی ہے، اس میں وَارْحَمْنَا (اور ہم پر رحمت فرما) اور سورۂ آلِ عمران

کے شروع میں وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ (۳/۷)(اور ہم کو اپنے ہاں سے رحمت عطا فرما) (نیز ۳۹/۹ ز ۲۳/۱۰۹)۔ یہ ہیں اس خدا کے بندوں کی صفات جو خود اَرحم الراحمین ہے اور جس کا رسول رحمۃ للعالمین۔ لہٰذا وہ جماعتِ مؤمنین بھی صاحبِ رحمت ہوگی، ساری دنیا کے لئے باعثِ رحمت، تمام نوعِ انسانی کو سامانِ زیست عطا کرنے والی اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کا ذریعہ بننے والی۔ اس لئے کہ ان میں خدا کی صفتِ رحمانیت و رحیمیت اپنی پوری تابانیوں سے جھلک رہی ہوگی۔

آگے بڑھنے سے پیشتر ایک اہم نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ عیسائیوں کا بنیادی عقیدہ ہے کہ خدا رحم ہے (GOD IS MERCY) اور قرآن کریم بھی خدا کو رحیم و رحمٰن بتاتا ہے۔ لیکن ان دونوں میں بڑا اہم، بنیادی فرق ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ، اپنے اوّلین ماں باپ (آدم اور حوا) کے گناہ کی آلائش ساتھ لیکر پیدا ہوتا ہے اور یہ آلائش، انسان کی کوشش اور عمل سے دُور نہیں ہو سکتی، یہ صرف خدا کے رحم سے دُور ہو سکتی ہے اور اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لایا جائے۔

قرآنِ کریم نے عیسائیت کے اس بنیادی عقیدہ کی تردید کی۔ اس کے برعکس، اس نے کہا کہ انسانی بچہ بغیر کسی قسم کی سابقہ آلائش کے، صاف سلیٹ (CLEAN SLATE) لے کر پیدا ہوتا ہے اور اسے اس امر کی آزادی ہوتی ہے کہ وہ جونسا راستہ جی چاہے اختیار کرلے۔ وہ جس قسم کا راستہ اختیار کرے گا، خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے اس کے نتائج اس کے سامنے آجائیں گے۔

لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ انسان سے سہواً کوئی لغزش سرزد ہو جائے اور وہ اس کے احساس کے بعد اس سے نادم ہو اور فوراً اپنی اصلاح کرلے، تو خدا کے قانونِ مکافات میں اس کی بھی گنجائش رکھ دی گئی ہے کہ اس طرح وہ اپنی لغزش کے نقصان رساں نتیجہ سے محفوظ رہ جائے۔ قانونِ مکافات میں اس گنجائش کا رکھ دیا جانا، خدا کا رحم کہلاتا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ خدا کا قانون ہے کہ جو شخص آگ میں ہاتھ ڈالے گا اس کا ہاتھ جل جائیگا اور اس سے اسے سخت تکلیف ہوگی۔ لیکن جس خدا نے آگ میں جلانے کی خاصیت پیدا کی ہے اس نے، اس کے ساتھ ہی، ایسی دوائیاں بھی پیدا کر دی ہیں جن کے استعمال سے، آگ کی جلن اور سوزش سے آرام مل سکتا ہے۔ ان دوائیوں کا پیدا کر دینا رحم ہے۔

۹

اِنعام

نِعمت، نُعَماء

انعام، نَعُمَ سے ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز یا منظر کا ایسی کیفیت لئے ہونا جس سے آنکھوں کو ٹھنڈک حاصل ہو۔ تَنْعِیمَۃٌ ایک پودا ہوتا ہے جس کے پتے نہایت نرم و نازک اور سرسبز و شاداب ہوتے ہیں۔ نُعَامیٰ جنوبی ہوا کو کہتے ہیں جو بڑی خوشگوار ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اَلنُّعَامَۃُ بلند ستارے کو بھی کہتے ہیں۔ ان معانی سے واضح ہے کہ انسان کی معاشرتی زندگی کے ہر پہلو کا خوشگوار، کشادہ، ملائم، آسودہ، شاداب اور بلند ہونا نعمت ہے۔ خدا کی صفت یہ ہے کہ وہ انسان کو اس قسم کی نعمتیں دینے والا ہے۔

منعم علیہ حضرات کا راستہ

قرآنِ کریم نے جو سب سے بڑی چیز مانگنے کے لئے سکھائی ہے صراطِ مستقیم ہے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (۱/۵)۔

"(اے اللہ) ہم کو تو ازل بدوش راستہ دکھا۔"

صراطِ مستقیم، منزلِ مقصود تک لے جانے کا سیدھا راستہ ہے۔ لیکن چونکہ صراطِ مستقیم ایک غیر محسوس شے تھی، اسے محسوس طریقہ پر یوں نمایاں کیا کہ وہ ان برگزیدہ ہستیوں کا راستہ ہے جن پر اللہ نے انعام فرمایا:

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ (۱/۶)

یعنی ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے (اے اللہ) اپنا انعام فرمایا۔

ان برگزیدہ حضرات کی وضاحت یوں فرمادی کہ یہ حضرات انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں علیہم الصلوٰۃ و السلام۔

وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ ۚ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ؕ (۴/۶۹)۔

اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کریگا تو یہ لوگ ان حضرات کے ساتھ ہونگے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاء، صدیقین و شہداء، صالحین۔ یہ حضرات کیا ہی اچھے رفیق ہیں!

لیکن یہ پھر بھی اجمالی ذکر ہی رہا۔ اس لئے انعام الٰہی کی تفصیل و تشریح متعدد مقامات پر مختلف عنوانات اور گوناگوں تصریحات سے کردی گئی تاکہ نعمت اور عتاب کا فرق نمایاں ہوجائے اور کوئی شخص یا قوم اپنے اعمال کے نتائج پرکھنے میں کسی خوش فہمی یا مغالطہ میں مبتلا نہ رہے۔

راہِ ہدایت سب سے پہلے جس نعمتِ عظمٰے کا ذکر کیا گیا ہے وہ صراطِ مستقیم ہے، یعنی راہِ ہدایت، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے (۴—۵/۱) یعنی رشد و ہدایت، اللہ کا فضل اور اس کی نعمت ہے۔ (۷—۸/۴۹)۔ برعکس اس کے، غلط روی، گمراہی، ضلالت، اُس کا غضب اور عتاب ہے۔ یہ ان لوگوں کا راستہ نہیں جن پر خدا کے انعامات کی بارش ہوتی ہے۔

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ ۧ (۱/۷)۔

(صراطِ مستقیم) ان لوگوں کا راستہ نہیں جن پر (اے اللہ) تو نے اپنا غضب نازل کیا اور جو راہِ راست سے ہٹ گئے!

دین و دنیا کی نعمتیں اسلام وہ دین ہے جو "مذہب" اور "دنیا" دونوں کو محیط ہے۔ نہ یہ مغرب کی مادہ پرستی ہی سکھاتا ہے اور نہ مشرق کا سنیاس اور رہبانیت۔ بلکہ یہ ایک ایسی زندگی کی طرف ہدایت کرتا ہے جس کا ہیولیٰ ان دونوں کے امتزاج سے مرکب ہے اس لئے اللہ کی نعمتیں بھی دین و دنیا، روح و مادہ، امروز و فردا، دونوں کو محیط ہوں گی۔ پہلے "دینی نعماء" کی تفصیل ملاحظہ فرمایئے۔

نعمائے دینی کسی قوم میں انبیاء کی بعثت نعمتِ خداوندی ہوا کرتی تھی۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِہٖ یٰقَوْمِ اذْکُرُوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِذْ جَعَلَ فِیْکُمْ اَنْۢبِیَآءَ ...... (۵/۲۰)۔

"جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اس نعمتِ خداوندی کو یاد کرو جو اس نے تم پر کی ہے اس نے تم میں نبی پیدا کئے!"

خود مسلمانوں سے کہا گیا کہ کعبہ کا تعین اس لئے کیا گیا ہے کہ تم پر اتمام نعمت کر دیا جائے تاکہ تم راہِ ہدایت پر چلو۔ (۱۵۰-۱۵۱/۲)۔ اسی طرح مسائلِ حیات میں راہ نمائی کرنے والی شریعت کا مل جانا بھی نعمتِ الٰہی ہے۔ چنانچہ طلاق کے مسائل کی تشریح کرتے ہوئے کہا۔

وَ اذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ وَ مَآ اَنْزَلَ عَلَیْکُمْ مِّنَ الْکِتٰبِ وَالْحِکْمَۃِ یَعِظُکُمْ بِہٖ ؕ (۲/۲۳۱)۔

"اور اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جو اس نے تم پر نازل فرمائی، یعنی جو اس نے تم پر کتاب وحکمت کے طور پر نازل کیا۔ وہ اس کے ذریعے تمہیں نصیحت کرتا ہے۔"

نبوّت خود ایک نعمت ہے نبوّت بجائے خویش نعمتِ خداوندی ہے چنانچہ مختلف انبیاء کرام علیہم السلام کے ذکر کے بعد فرمایا:

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ مِنْ ذُرِّیَّۃِ اٰدَمَ ق (۱۹/۵۸)۔

"ذرّیتِ آدم میں سے یہ حضرات انبیاء ہیں۔ ان کو اللہ نے نعمت عطا فرمائی ہے۔"

نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلّم کو فتحِ مبین، مغفرت اور صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کا اشارہ فرما کر کہا کہ ان پر اتمام نعمت کیا گیا ہے۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ۙ لِّیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِکَ وَ مَا تَاَخَّرَ وَ یُتِمَّ نِعْمَتَہٗ عَلَیْکَ ...... (۱-۲/۴۸)۔

"بے شک ہم نے تمہیں ایک کھلّم کھلا فتح دی ہے تاکہ ان تمام الزامات سے جو اس (فتح مکہ) سے پہلے تمہارے خلاف عائد کئے گئے ہیں یا اس کے بعد عائد کئے جائیں تمہیں محفوظ رکھا جائے۔"

اور وہ تم پر اپنی نعمتوں کی تکمیل کردے۔"

دوسری جگہ حضورؐ کے ابتدائی حالات کا ذکر فرما کر یاد دلایا کہ حضورؐ کو یتیمی کی حالت میں پناہ دی۔ جب آپ تلاش حق میں سرگرداں تھے تو آپ کو نورِ ہدایت عطا فرمایا اور آپ کو اپنی ضروریات میں کسی دوسرے کا محتاج نہ رکھا۔ یہ اللہ کے انعامات ہیں جن کی تحدیث کی تلقین کی گئی ہے۔

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝ .... وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝ (۶-۷-۸-و ۹۳/۱۱)

"کیا اللہ نے تمہیں یتیم دیکھ کر ٹھکانہ نہیں دیا اور تم کو تلاشِ حق میں سرگرداں پایا تو راستہ دکھایا۔...

......اور تم کو نادار دیکھا تو مالدار بنایا۔ سو تم اپنے رب کی نعمتوں کا تذکرہ کیا کرو۔"

پھر دینِ اسلام کی بخشش اور اس کی تکمیل کو اتمامِ نعمت قرار دیا۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (۵/۳)۔

"آج کے دن تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا۔ اپنا انعام تم پر تمام کر دیا۔"

اور انعاماتِ الٰہی کی یاد میں مسلمانوں کے لئے رسول کی اطاعت اور اس اطاعت کی بنا پر تحفظِ دین کی خاطر جو عہد و پیمان اللہ تعالیٰ سے باندھا گیا اس کے ایفا کی تاکید کی گئی۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ...... (۵/۷)۔

"اور تم لوگ اللہ کے انعام کو جو تم پر ہوا ہے یاد رکھو اور اس کے عہد و پیمان کو نہ بھولو جو وہ مضبوطی کے ساتھ تم سے ٹھہرا چکا ہے۔"

اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے یعنی دنیاوی نعمار کا ذکر۔

اقوامِ عالم پر فضیلت

تمام اقوامِ عالم پر برتری اور فضیلت کا حاصل ہونا نعمتِ الٰہی ہے چنانچہ بنی اسرائیل کو بار بار اس کی یاد دلائی گئی ہے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۲/۴۷)۔

"اے بنی اسرائیل! اس نعمت کو یاد کرو جو ہم نے تم پر ارزانی کی یعنی تمہیں اقوامِ عالم پر فضیلت

عطا فرمائی۔"

فرعون کے استبداد سے نجات ملنا، بادلوں کا سایہ فگن ہونا، رزق کی افزائش، منّ و سلویٰ کی بخشائش یہ سب انعامِ الٰہی تھے۔ (۲/۵۷) سامانِ معیشت، مکانات، حیوانات کہ جن سے انسان اپنی ضروریاتِ زندگی پوری کرتا ہے پہاڑوں کی چوٹیوں پر اور زمین دوز غاروں کے اندر مستحکم قلعے تعمیر کرنا، روزانہ ضروریات کا لباس، میدانِ جنگ میں حفاظت کے لئے زرہ، یہ سب انعامات ہیں۔

وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا...... كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ۝ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَ اَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (۱۶/۸۰-۸۳)

"اور اللہ نے تمہارے لئے رہنے کی جگہ گھروں میں بنائی اور مویشیوں کی کھالوں سے گھر (خیمے) بنائے جنہیں تم کوچ کے وقت اور قیام کی حالت میں ہلکا پھلکا پاتے ہو اور بھیڑوں اور اونٹوں اور بکریوں کی اون سے گھر کا سامان اور دیگر چیزیں بناتے ہو، جو ایک مدت کے لئے فائدہ رساں ہیں۔ اللہ نے اپنی مخلوق میں سے تمہارے لئے سایہ (کا سامان) پیدا کر دیا اور پہاڑوں میں پناہ کی جگہ بنائی اور لباس پیدا کر دیا جو تمہیں گرمی سے بچائے اور زرہ بکتر جو لڑائی میں تمہاری حفاظت کرے۔ اس طرح اللہ اپنی نعمتیں تم پر پوری کرتا ہے تاکہ تم قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرو۔ پس اگر یہ لوگ (باوصف ان نعمتوں کے) پھر جائیں تو تمہارے اوپر تو صرف پیغام کا پہنچا دینا ہی فرض ہے۔ یہ لوگ اللہ کی نعمتوں کو پہچانتے ہوئے پھر ان سے انکاری ہوتے ہیں، اکثر ان میں سے ناشکر گزار ہیں۔"

اسی طرح زمین، نہریں اور چشمے، بارش، بارش سے پیداوار، سطح ارض پر بار برداری کے جانور، سمندر کے سینے پر کشتیاں (۳۱/۳۱) یہ سب کچھ انسان کے تابع فرمان کر دیا تاکہ وہ اپنے خدا کی نعمتوں کو پیشِ نظر رکھے۔ (۱۳۱—۱۰/۴۲)۔ سامانِ معیشت کی فراوانی کے ساتھ ساتھ معاشرتی زندگی میں پاکیزگی اور صفائی سے اتمامِ نعمت ہوتا ہے۔

يُرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَ لِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ (۵/۶)۔

"اور اللہ کو یہ منظور ہے کہ تمہیں پاک و صاف رکھے اور یہ کہ تم پر اپنا انعام مکمل کر دے۔"

اس میں طبیعیاتی صفائی کے علاوہ، تطہیرِ قلب و نگاہ بھی مضمر ہے۔

حکومت نعمتِ خداوندی ہے

یہ تو تھی انفرادی زندگی۔ اب اجتماعی زندگی پر نگاہ ڈالئے۔ بنیادی اصول یہ قرار پایا کہ جس قوم کے ساتھ انعاماتِ خداوندی ہوں اسے دیگر اقوامِ عالم پر فضیلت حاصل ہوگی (۲/۴۷)۔ چنانچہ بنی اسرائیل کی جہاں اور نعمتیں شمار کرائی گئی ہیں، ان سے خاص طور پر کہا گیا کہ ان میں انبیاء کی بعثت ہوئی، انہیں بادشاہت عطا ہوئی اور وہ کچھ دیا جو کسی اور کو نہیں دیا گیا تھا۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّ اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ○ (۵/۲۰)۔

"اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے قوم! اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جبکہ اس نے تم میں بہت سے انبیاء مبعوث فرمائے اور تم کو صاحبِ مملکت بنایا اور تمہیں وہ چیزیں دیں جو دنیا جہان والوں میں سے کسی اور کو نہ دی تھیں۔"

قوت نعمت ہے

لہٰذا تمکّن فی الارض، قوت و اقتدار یہ سب نعمائے خداوندی ہیں۔

وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ زَادَكُمْ فِی الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ (۷/۶۹)۔

"اور تم یاد کرو کہ اللہ نے تمہیں قومِ نوح کے بعد جانشین بنایا اور بڑی قوت اور توانائی عطا کی سو اللہ کی ان نعمتوں کو یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو۔"

اسی طرح، خوبصورت محلات اور مضبوط قلعے بھی انعاماتِ الٰہی ہیں (۷/۷۴)۔

اکثریت نعمت ہے

جماعت کی تعداد کا بڑھ جانا بھی نعمتِ الٰہی ہے۔

وَ اذْكُرُوْۤا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ ۪ وَ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ○ (۷/۸۶)۔

"سو اس حالت کو یاد کرو جب تم قلیل تھے۔ سو اللہ نے تمہیں کثرت عطا کی اور دیکھو کہ فساد کرنے والوں کا کیا انجام ہوا۔"

فتح و نصرت نعمت ہے میدانِ جنگ میں کامیابی، فتح و ظفر بھی خدا کے انعام ہیں (۳/۱۲۳)۔ حملہ آور دشمنوں کی گرفت سے محفوظ رکھے جانا بھی نعمت ہے۔

دشمن پر غلبہ نعمت ہے يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ط وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ (۵/۱۱)۔

"اے ایمان والو! اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جو اس نے تم پر کی، جبکہ ایک قوم اس فکر میں تھی کہ تم پر دست درازی کرے۔ سو اللہ نے تم پر اُن کا قابو نہ چلنے دیا۔ پس قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور مومنین قوانینِ خداوندی پر ہی بھروسہ رکھتے ہیں۔"

غلامی سے نجات ملنا نعمت ہے اسلام کی ابتدائی زندگی میں مسلمانوں پر اکثر مواقع ایسے گذرے جن میں یہ مخالفین کی طرف سے سخت مشکلات میں گھیر لئے گئے تھے۔ ان مقامات سے محفوظ و مصئون نکال کر، فاتح و منصور لوٹانے کو انعاماتِ خداوندی کہا گیا ہے (۹/۲۳)۔ اسی طرح بنی اسرائیل کے حالات میں دیکھئے۔ فرعون کے ظلم و استبداد سے نجات ملنا، ان کا غلامی کی لعنت سے مخلصی حاصل کرنا ان کے لئے نعمتِ الٰہی قرار دیا گیا ہے۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ (۱۴/۶)۔

"اور جب موسٰے نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ کی نعمتیں یاد کرو جب اس نے تمہیں قومِ فرعون کی غلامی سے نجات دی، جو تمہیں سخت عذاب پہنچاتے تھے۔"

قوم کے عروقِ مُردہ میں خونِ زندگی دوڑنا کسی قوم کا موت کے بعد دوبارہ زندگی حاصل کرنا، اس کا پھر سے زندہ قوموں میں شمار ہو جانا اللہ کا فضل ہے۔ (۲/۲۴۳)۔ لیکن ابھی ہم نے اس سب سے بڑی نعمت کا ذکر نہیں کیا۔ جس کی بدولت یہ نعمتیں

وحدتِ ملّت نعمتِ عظمیٰ ہے

حاصل ہوتی ہیں۔ ارشاد ہے۔

وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا...

.......كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (۳/۱۰۲)

"(مسلمانو) اللہ کے اس سلسلہ (قرآن) کو اجتماعی طور پر، ایک ہو کر تھامے رہو اور ٹکڑے ٹکڑے مت ہو جاؤ۔ اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جو اس نے تم پر کی، جبکہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے تھے۔ سو اس نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت ڈال دی اور اپنی نعمت سے تمہیں بھائی بھائی بنا دیا اور تم تو (ہلاکت کے) جہنم کے کنارے پر پہونچ ہی چکے تھے کہ اس نے تمہیں اس میں (گرتے گرتے) بچا لیا اور اللہ اس طرح اپنے قوانین کو تم پر واضح کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پر رہو۔"

یعنی باہمی اتحاد، ملّتِ اسلامیہ کا اُمّتِ واحدہ ہونا، فرقوں فرقوں میں نہ بٹ جانا، وہ نعمتِ خداوندی ہے جو عہدِ جاہلیت اور زمانۂ اسلام میں خطِّ امتیاز بن گئی۔

کائناتی قوتوں کا انسان کے تابعِ تسخیر ہو جانا نعمت ہے۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَ اَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً ؕ (۳۱/۲۰)۔

"کیا تم نہیں دیکھتے کہ جو کچھ زمین اور آسمانوں میں ہے، اللہ نے سب کچھ تمہارے زیرِ تسخیر کر دیا؛ اور اپنی تمام ظاہر اور باطن نعمتوں کا اتمام کر دیا۔"

کمالِ نعمت کے حصول کے بعد خدا کے سامنے جھکے رہنا

یہ سب کچھ انسان کے لئے مسخر کر دیا تاکہ انسان قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکا رہے۔

كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ۝ (۱۶/۸۱)

"(اللہ) اسی طرح اپنی نعمتوں کا تمہارے لئے اتمام کرتا ہے تاکہ تم اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے رہو۔"

یہی راہِ ہدایت ہے (۲/۱۵۰) جو رسول اکرمؐ کی وساطت سے دکھائی گئی (۲/۵۱) اور اسی کا نام اسلام ہے جو دین

کامل ہے اور جہاں پہنچ کر تمام نعمتوں کا اتمام ہو جاتا ہے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (۵/۳)۔

آج میں نے تمہارے لئے دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمتوں کا تم پر اتمام کر دیا اور تمہارے لئے دینِ اسلام کا انتخاب کر دیا۔

نعمتیں زیادہ کس طرح ہوتی ہیں

ان تمام نعمتوں کے ملنے اور ملنے کے بعد ان میں اضافہ اور ترقّی کے لئے یہ اصول متعیّن کر دیا کہ جو شکرِ نعمت کرتا ہے اس کی نعمتیں زیادہ ہوتی جاتی ہیں اور جو کفرانِ نعمت کرتا ہے اس سے نعمتیں چھن جاتی ہیں۔ شکرِ نعمت کی تفصیل کے لئے "شکر" کا عنوان دیکھئے۔ یہاں اجمالاً اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ نعمائے خداوندی کو صحیح قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرنا شکرِ نعمت ہے اور ان سے غلط فائدہ اٹھانا، ناجائز طریقوں میں استعمال کرنا کفران ہے۔ مثلاً مسلمانوں کو جب حکومت و سلطنت کی نعمت عطا کی گئی تو اس غرض سے کہ

اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (۲۲/۴۱)۔

وہ نظامِ صلوٰۃ کو قائم کریں گے، ایتائے زکوٰۃ کا انتظام کریں گے اور امر بالمعروف کریں گے اور لوگوں کو منکر سے روکیں گے۔

جب تک وہ اس مقصد کو پورا کرتے رہے سلطنت بڑھتی چلی گئی اور جب انہوں نے شکرِ نعمت کو کفران سے تبدیل کر دیا، یعنی خدا کے اس عطیۂ عظمیٰ سے ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کر دیا اور سلطنت "خدا کی بادشاہت" کی بجائے ملوکیت میں بدل گئی تو رفتہ رفتہ وہ نعمت چھن گئی اور پھر یہ ذلّت و خواری کے دردناک عذاب میں گرفتار ہو گئے۔

اسی مقصد کے پیشِ نظر بنی اسرائیل سے بھی کہا گیا تھا کہ یاد رکھو! یہ سب نعمتیں تم پر ارزانی کر دی گئی ہیں۔ اگر تم اُن کا شکریہ ادا کرتے جاؤ گے تو یہ زیادہ ہوتی چلی جائیں گی لیکن اگر کفرانِ نعمت کرو گے تو سخت عذاب میں گرفتار کر دیئے جاؤ گے۔

وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَ لَئِنْ

كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ٥ (۱۴/۷)

اور جب تمہارے رب نے واضح کر دیا کہ اگر تم شکر کرو گے تو تمہیں بڑھاتا جاؤں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بڑا سخت ہے۔

غیر خدا کے سامنے جھک جانا کفرانِ نعمت ہے

نعماء کے شکریہ کی اساسی اور بنیادی شکل یہ ہے کہ ایک خدا پر ایمان رکھا جائے اور خدا پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ "غیر خدا" (جسے قرآن باطل کہہ کر پکارتا ہے) سے یکسر انکار کر دیا جائے۔ اللہ کے سوا کسی دوسری سرکش طاقت کے سامنے نہ جھکا جائے۔ اس کے سوا کسی اور کا قانون تسلیم نہ کیا جائے۔ اگر ایسا کر لیا تو وہ کفرانِ نعمت ہوگا۔

وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا...... رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ شَيْئًا وَّ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۚ (۷۲ — ۱۶/۷۳)

اور اللہ نے تمہیں میں سے تمہارے لئے جوڑے بنائے اور تمہاری بیویوں میں سے تمہارے لئے بیٹے اور پوتے پیدا کئے اور اچھی اچھی چیزیں کھانے کو دیں۔ تو کیا یہ لوگ باطل پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کی نعمتوں سے کفران کرتے ہیں، یعنی اس کو چھوڑ کر ایسی ہستیوں کی عبودیت (محکومی) اختیار کرتے ہیں جو زمین و آسمان میں کہیں رزق نہیں پہنچا سکتیں اور نہ ان میں کسی اور قسم کی استطاعت ہے!

اس لئے کہ انسان کو تمام نعمتیں خدا کے قانون کے اتباع سے ملتی ہیں۔ انہیں کسی دوسری طاقت کی طرف منسوب کرنا توحید کے مقابلہ میں شرک اور شکر کے مقابلہ میں کفران ہے۔ ۵۳؍۱ — ۱۶/۵۵۔ اس حقیقت کو ایک مثال کے ذریعے یوں سمجھایا گیا کہ

وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ...... اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ٥ (۱۱۲ — ۱۶/۱۱۴)

اللہ ایک بستی کی مثال دیتا ہے کہ اس کے باشندے بڑے امن اور چین سے رہتے تھے۔ ان کے کھانے پینے کو ہر طرف سے بافراغت آتا تھا۔ لیکن انہوں نے اپنے خدا کی نعمتوں کی ناشکرگزاری

کی. سو اللہ نے ان کو بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا کر دیا. سب ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھا اور ان کے پاس انہی میں سے ایک رسول بھی آیا. اس کو بھی انہوں نے جھٹلا دیا تب انہیں عذاب نے آپکڑا. اور وہ ظالم تھے. اس لیے تم لوگ اللہ کے عطا کردہ میں سے حلال و طیب کھاؤ اور اگر تم فی الحقیقت اس کی محکومی اختیار کئے ہوئے ہو تو اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرو۔

راہ نمایانِ قوم کا کفرانِ نعمت

قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق یہ کفر و شکر انفرادی حدود تک محدود نہیں رہتا. اجتماعی حیثیت سے اس کا اثر بہت گہرا ہوتا ہے. چنانچہ ظاہر ہے کہ یہ کفران پہلے بڑے بڑے لوگوں سے شروع ہوگا جنہیں قوم کے لیڈر کہا جاتا ہے. ان کے کفر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ پوری قوم کو جہنم کے گڑھوں میں لے گرتے ہیں. فرمایا؛

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۙ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ؕ وَ بِئْسَ الْقَرَارُ (۱۴/۲۸-۲۹)

"کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے اللہ کی نعمت کو ناشکری سے بدل دیا اور (اس طرح) اپنی قوم (کی قوم) کو ہلاکت کے گھر میں لے گئے، جہنم میں، جس میں داخل ہو جاتے ہیں اور وہ بہت بُری جگہ رہنے کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو قوم ڈھور ڈنگر کی طرح آنکھیں بند کر کے بلا دیکھے بھالے، انسانوں کے پیچھے چلنے کی خوگر ہو جاتی ہے، اس کا یہی حشر ہوتا ہے. اس کے برعکس، جو لوگ اپنے قلب و دماغ، اپنے ایقان و بصیرت سے کام لیتے ہیں اور شکرِ نعمت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے، قانونِ خداوندی انہیں عذابِ محیط کے نرغے سے بچا کر نکال لے جاتا ہے. چنانچہ قومِ لوطؑ کو جب چاروں طرف سے ہلاکت و بربادی کے عبرت انگیز عذاب نے گھیر لیا تو ان میں جو شکر گزار بندے تھے ان کو خدا نے بوجہ اُن کی شکر گزاری کے بچا لیا۔

اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ؕ نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ۙ نِّعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ ۝ (۵۴/۳۴-۳۵)

ہم نے ان پر پتھروں کی بارش کی، بجز متعلقینِ لوط (مومنین) کے جن کو ہم نے اخیر شب میں بچا لیا، اپنی طرف سے بطور نعمت. جو شکر کرتا رہے اسے ہم ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں!

اسی لئے کہا گیا کہ ہمیشہ خدا سے شکرِ نعمت کی توفیق مانگا کرو۔ (۴۶/۱۵)۔ لیکن جیسا کہ سابقہ عنوان میں بھی لکھا جا چکا ہے، انسان عجیب مخلوق واقع ہوا ہے۔ جب اللہ اسے اپنی نعمتوں سے سرفراز کرتا ہے تو یہ اس کے قوانین سے رُوگردانی اختیار کر لیتا ہے

انسان کی خصلت

اعراض برتتا ہے، پہلوتہی کرتا ہے۔ لیکن جب وہ نعمتیں اس کے کُفران کی بدولت اس سے چھننے لگتی ہیں، تو پھر مایوس اور افسردہ خاطر ہو جاتا ہے۔

وَ اِذَآ اَنۡعَمۡنَا عَلَى الۡاِنۡسَانِ اَعۡرَضَ وَ نَاٰ بِجَانِبِهٖ‌ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـئُوۡسًا ○ (۱۷/۸۳)

"اور جب ہم انسان پر انعام کرتے ہیں تو یہ مُنہ پھیر لیتا ہے (اعراض برتتا اور پہلوتہی کرتا ہے) اور جب نقصان پہنچتا ہے تو نا اُمید ہو جاتا ہے۔"

اس مایوسی اور نا اُمیدی کے ہولناک عالم میں پھر قوانینِ خداوندی کی طرف رجوع کرتا ہے تو اس کی اس صحیح روش کی بدولت اس کی چھنی ہوئی نعمتیں اور لُٹی ہوئی دولتیں، پھر سے اُسے مل جاتی ہیں۔ لیکن اس کے بعد یہ پھر اُسے بھلا دیتا ہے اور ان نعمتوں کو دوسروں کی طرف منسوب کر کے شرک کرنے لگ جاتا ہے۔

خَوَّلَهٗ نِعۡمَةً مِّنۡهُ نَسِىَ مَا كَانَ يَدۡعُوۡۤا اِلَيۡهِ مِنۡ قَبۡلُ وَجَعَلَ لِلّٰهِ اَنۡدَادًا..... (۳۹/۸)۔

"اور جب انسان کو مصیبت پہنچتی ہے تو اپنے رب کی طرف رجوع ہو کر اُسے پکارنے لگتا ہے اور جب اللہ اُسے اپنے ہاں سے نعمت عطا فرما دیتا ہے تو جس کے لئے پہلے خدا کو پکارتا تھا اسے بھول جاتا ہے اور اللہ کے شریک بنانے لگ جاتا ہے۔"

انانیّت

اور کبھی اس سے بھی آگے بڑھتا ہے تو انانیّت کا خنّاس اس کے دماغ میں گُھس جاتا ہے اور یہ کہنے لگ جاتا ہے کہ یہ سب کچھ مجھے میری ہی تدابیر اور میرے ہی علم و ہُنر کے طفیل ملا ہے۔ کہاں کا خدا اور کون سے اس کے قوانین!

فَاِذَا مَسَّ الۡاِنۡسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ اِذَا خَوَّلۡنٰهُ نِعۡمَةً مِّنَّا ۙ قَالَ اِنَّمَاۤ اُوۡتِيۡتُهٗ عَلٰى عِلۡمٍ‌ؕ بَلۡ هِىَ فِتۡنَةٌ وَّلٰـكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ○ (۳۹/۴۹)۔

"جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم کو پکارتا ہے۔ پھر جب ہم اسے اپنی طرف سے کوئی نعمت دیدیتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ یہ تو مجھے میری ہی تدابیر سے ملا ہے، حالانکہ ایسا سمجھنا ہلاکت کا موجب ہے لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔"

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ انسان کو جو کچھ ملتا ہے، اس کی سعی و عمل کے نتیجے میں ملتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس جدوجہد میں کتنا حصہ اس کی محنت کا ہوتا ہے اور کتنا حصہ ان صلاحیتوں کا جو اُسے مبداءِ فیض کی طرف سے از خود ملی ہوتی ہیں۔ اگر ایک شخص اعلیٰ درجہ کا دماغ رکھتا ہے تو یہ دماغ اس کا زر خرید نہیں، یہ اُسے بلامزد و معاوضہ عطا ہوا ہے۔ یہ شخص اُس شخص کے مقابلہ میں جسے اچھا دماغ نہیں ملا، زیادہ کما لیتا ہے اور اُسے خالصتہً اپنی ہنرمندی کا نتیجہ قرار دے کر اس میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں سمجھتا۔ قرآن کا کہنا یہ ہے کہ اس شخص کی نسبتاً زیادہ کمائی اس کی اُن دماغی صلاحیتوں کا نتیجہ ہے جو اُسے مفت عطا ہوئی تھیں لہٰذا کمائی کے اس حصے کو اپنی کاریگری قرار دے کر اس کا واحد مالک نہیں بن جانا چاہیئے بلکہ اسے قانونِ خداوندی کے مطابق نوعِ انسانی کی ربوبیتِ عامہ کے لئے وقف کر دینا چاہیئے (تفصیل ان امور کی میری کتاب "نظامِ ربوبیت" میں ملے گی)۔ انسان کی یہ بھی کیفیت ہے کہ وہ مصیبت اور پریشانی کے لئے کبھی اپنے آپ کو ذمہ دار قرار نہیں دیتا۔ اوّل تو وہ کوشش کرتا ہے کہ اس کے لئے کسی اور کو ذمہ دار ٹھہرا دے اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر کہہ دیتا ہے کہ خدا نے مجھے ناحق ذلیل کر دیا۔ میرا تو کوئی قصور ہی نہ تھا۔

فَأَمَّا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ ۙ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ ۞ وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ ۞ (۸۹/۱۶-۱۵)۔

"جب قانونِ خداوندی کے مطابق انسان کے سامنے زندگی کا ایسا پہلو آتا ہے جس میں اسے اعزاز و اکرام حاصل ہوتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ خدا نے مجھے (اپنی کاریگری کی بنا پر) یہ سب کچھ دیا ہے اور جب زندگی دوسری طرف پلٹا لیتی ہے اور اس کی معیشت تنگ ہو جاتی ہے، تو چیخنے لگتا ہے کہ خدا نے مجھے (ناحق) ذلیل کر دیا۔"

حقیقت یہ نہیں۔ نہ کسی کو نعمتیں یونہی ملتی ہیں، نہ ملی ہوئی یونہی چھنتی ہیں۔ اس کے لئے خدا کا اٹل قانون مقرر ہے اور وہ قانون یہ ہے کہ کسی قوم کی (اچھی یا بری) حالت میں تغیر واقع نہیں ہوتا جب تک وہ قوم خود

اپنے اندر تبدیلی پیدا نہ کرلے۔ خارجی تبدیلیاں درحقیقت اس قوم کی نفسیاتی (داخلی) تبدیلیوں کے مطابق رونما ہوتی ہیں۔

اٹل قانون

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ (۸/۵۳)

"اس لئے کہ اللہ اس نعمت کو جو وہ کسی قوم کو عطا کردے اس سے کبھی نہیں چھینتا جب تک کہ وہ خود اپنی ذہنیت (نفسیاتی کیفیت) ہی کو نہ بدل ڈالے۔ اللہ تو سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔"

جو قوم اس طرح خود خدا کی نعمتوں کو بدل ڈالے، اس پر سخت عذاب مسلط ہو جاتا ہے۔

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍ بَيِّنَةٍ ۭ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ○ (۲/۲۱۱)۔

"ذرا بنی اسرائیل سے پوچھو کہ ہم نے انہیں کتنی واضح دلیلیں دی تھیں، لیکن جو شخص خدا کی نعمت کو ملنے کے بعد بدل دیتا ہے، تو اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔"

چنانچہ اس غرض کے لئے کہ شکرِ نعمت کی اہمیت نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے، تحدیثِ نعمت کی تاکید کردی۔ بنی اسرائیل سے بار بار کہا گیا کہ خدا کی نعمتوں کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھو۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ (۲/۴۰، ۲/۱۲۲)

"اے بنی اسرائیل! اس نعمت کو یاد کرو جو ہم نے تم پر کی۔"

پھر تمام نوعِ انسانی کو مخاطب کر کے کہا گیا کہ خدا کی نعمتوں کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دو۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۭ (۳۵/۳)۔

"اے نوعِ انسانی! اللہ کی جو نعمتیں تم پر ہیں، ان کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھو۔"

حتیٰ کہ نبی اکرمؐ سے بھی فرمایا کہ اپنے رب کی نعمتوں کی تحدیث کرو۔

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ○ؑ (۹۳/۱۱)۔ "اور اپنے رب کی نعمتوں کو یاد کیا کرو۔"

اسی تاکید کے لئے کہا کہ قیامت میں ہر نعمت کی بابت سوال ہوگا۔

ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ (۱۰۲/۸)

"اور اس روز تم سے تمام نعمتوں کی بابت سوال ہوگا۔"

کہ تم نے اسے کس طرح صرف اور استعمال کیا ہے۔

نگہِ بازگشت

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ راہِ ہدایت کا مل جانا خدا کی نعمت ہے اور اس لئے نبوت و رسالت، کتاب و حکمت خدا کے انعام ہیں جو کسی قوم پر ارزاں ہوتے ہیں۔ اسی راہِ ہدایت پر چلنے سے دنیا کی سرفرازیاں اور سربلندیاں، کامیابیاں اور کامرانیاں حاصل ہوتی ہیں۔ دولت و ثروت، سطوت و حکومت، گھربار، بیوی بچے، خوبصورت محلات، مستحکم قلعے، جماعت کی اکثریت، دشمن پر غلبہ و استیلاء۔ یہ سب انعامِ الٰہی ہیں۔ اس کے خلاف، ان نعمتوں کا چھن جانا، کسی قوم پر ذلت و رسوائی کا چھاجانا خدا کا غضب ہے۔ ان نعماء کا شکریہ یہ ہے کہ ان کو انہی مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے جو قوانینِ خداوندی نے متعین فرمائے ہیں۔ اس شکریہ سے ان نعمتوں میں اضافہ ہوتا جائے گا، یہ بڑھتی چلی جائیں گی، قوم کی جڑیں مستحکم ہوتی جائیں گی۔ برعکس اس کے، اگر ان سے ناجائز فائدہ اٹھایا جائے، تو یہ کفرانِ نعمت ہے۔ اس سے یہ نعمتیں چھن جاتی ہیں، مبدل بہ عتاب ہوجاتی ہیں۔ اور چونکہ قوموں کی زندگی دنوں سے نہیں، بلکہ صدیوں کے حساب سے شمار کی جاتی ہے، اس لئے یہ نعمتیں کچھ ایسے غیر محسوس انداز سے رفتہ رفتہ چھنتی ہیں کہ عام نگاہیں اس قوم کی حالت میں کچھ نمایاں فرق محسوس نہیں کرتیں اور اسی لئے اکثر اوقات انسان اس فریب میں آجاتا ہے کہ اس قوم کی اس بدعنوانیوں پر، کوئی گرفت ہی نہیں ہو رہی۔ حتیٰ کہ خود وہ قوم بھی مکافاتِ عمل کے غیر متبدل قانون کی ہنسی اڑاتی ہے۔ اس سے تمسخر کرتی ہے۔ ثروت اور شوکت کے نشہ میں نہیں سمجھتی کہ وہ ایک ایسے آتش فشاں پہاڑ کے دامن میں کھڑی ہے جس کے اندر آتش خاموش بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ حتیٰ کہ وہ پہاڑ پھٹ پڑتا ہے اور آتشیں مادہ کا طوفانِ بلاانگیز موج در موج ان کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور پھر ان کے لئے کوئی نجات کی صورت، کوئی راہِ مفر باقی نہیں رہتی اور اس کی جگہ صرف اس کے افسانے باقی رہ جاتے ہیں۔

قرآنِ کریم نے سلبِ نعماء (نعمتیں چھن جانے) کا جو قانون بیان کیا ہے، حکمت و بصیرت اور عبرت و موعظت کی ہزار دنیائیں اس کے اندر مضمر ہیں، یعنی

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ (۸/۵۳)۔

"(اس کا قانونِ مشیّت ہے) کہ اللہ جب کسی قوم کو اپنی نعمتوں سے سرفراز فرما دیتا ہے، تو پھر وہ نعمتیں اُن سے نہیں چھینتا تاآنکہ وہ خود اپنے اندر ایسا تغیّر نہ پیدا کرلیں (کہ ان نعمتوں کے مستحق نہ رہیں)۔"

قوموں کے عروج و زوال کے سلسلہ میں یہ ایک عظیم قانون ہے۔ اس قانون کی تشریح تو دوسرے مقام پر ملیگی، یہاں اجمالی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اس میں پہلے تو اس حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق فَعَّالٌ لِّمَا يَشَاءُ ضرور ہے، لیکن اس کی حالت (نعوذ باللہ) ہمارے دنیاوی بادشاہوں کی سی نہیں کہ گاہے بہ سلامے بر بخند و گاہے بہ دشنامے خلعت بخشند۔ اس کی مشیّت کے قوانین متعین ہیں اور یہ سلسلۂ کائنات انہی قوانین کے ماتحت چل رہا ہے۔ حیاتِ انسانی کا نظم و نسق بھی اسی ضابطہ کے ماتحت سرانجام پاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ خدا کا انعام یا غضب کوئی ایسی چیز نہیں جو کہیں باہر سے بنا بنایا انسان پر عائد ہو جائے، بلکہ یہ انسان کی اندرونی تبدیلی کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ ایک اہم نکتہ ہے جو ایک محسوس مثال سے زیادہ آسانی سے سمجھ میں آسکے گا۔ مثلاً پانی کی خاصیت یہ ہے کہ وہ مائع ہے، نشیب کی طرف بہتا ہے، جس برتن میں ڈالو اس کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ لیکن جب یہی پانی برودت جذب کر کے اپنے اندر ایسی تبدیلی پیدا کرلیتا ہے کہ وہ برف کی سِل بن جائے تو پھر وہ نہ مائع رہتا ہے، نہ نشیب کی طرف بہتا ہے، نہ ہر برتن کی شکل اختیار کرسکتا ہے، یعنی پانی وہی ہے لیکن اندرونی تبدیلی سے اب وہ قانونِ فطرت کی کسی اور شق کے تابع ہوگیا۔ اب یہ مائع (LIQUID) نہیں بلکہ ٹھوس (SOLID) بن گیا اور اسی جنس کی خاصیتیں اس میں پیدا ہوگئیں۔ اب اگر یہ پانی چاہے کہ اس کی چھنی ہوئی خاصیتیں پھر سے اسے واپس مل جائیں تو اسے اپنے اندر تبدیلی پیدا کرنی ہوگی، یعنی حرارت سے پھر مائع بننا ہوگا۔ اس تبدیلی کے بعد اس کی سابقہ خاصیتیں خود بخود عود کر آئیں گی۔ یا، دوسری طرف جائیے تو یہی پانی جب زیادہ حرارت اپنے اندر جذب کرلے گا تو مائع سے گیس بن جائے گا۔ اب یہ ایک اور نوع میں تبدیل ہو جائے گا اور اس نوع کا قانون اس پر منطبق ہو جائے گا۔ یہ نشیب کی طرف بہنے کے بجائے اُوپر کو اٹھے گا۔ ہوا سے ہلکا ہو جائے گا۔ اب اگر یہ چاہے کہ اپنی چھنی ہوئی خاصیتیں واپس لے لے تو اسے اپنے اندر تبدیلی پیدا کرنی ہوگی۔ اس سے وہی

خاصیتیں واپس آجائیں گی۔

اب ذرا غور کیجئے اس صورتِ حال پر کہ ہر مسلمان متعدد بار اللہ سے دعا مانگتا ہے کہ

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ (۱/۶-۵)

"اے اللہ! ہمیں سعادت و کامیابی کی سیدھی راہ پر چلانا۔ ان لوگوں کی راہ جنہیں تو نے اپنے انعام و اکرام سے نوازا۔"

لیکن نہیں سمجھتا کہ اس کے باوجود جب اس کی حالت ان لوگوں کی سی نہیں جن پر اللہ نے اپنا انعام و اکرام کیا تھا تو اس کا راز کیا ہے؟ راز وہی ہے جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ ادھر سے دعا کرتا ہے اور اُدھر سے اللہ تعالیٰ یہ کہہ دیتا ہے کہ تم پر انعام اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب تم اپنے اندر اس کی صلاحیت پیدا کرلو۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ لہٰذا دیکھنا چاہیئے کہ جب مُنعم علیہ حضرات اس کی رحمتوں سے سرفراز ہوئے تھے، تو انہوں نے اپنے اندر کیا تبدیلی پیدا کی تھی اور پھر رفتہ رفتہ جب وہ نعمتیں چھن گئی ہیں تو یہ کس تبدیلی کا نتیجہ تھا اور آج اگر انہی چھنی ہوئی نعمتوں کی بازیابی کی تمنا ہے تو اس کے لئے اپنے اندر کس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اپنی حالت تو برف کی سِل کی سی ٹھوس رکھنا اور آرزو رکھنا مائع کی خاصیت کی، یہ خود فریبی نہیں تو اور کیا ہے۔ یاد رکھئے! اللہ کا قانون جس طرح پانی کے تغیرِ حالات کے متعلق اٹل ہے، اسی طرح اقوامِ عالم کی موت و حیات کے متعلق بھی غیر متبدل ہے فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۳۵/۴۳)۔ قانونِ خداوندی ایک زندہ حقیقت ہے اور

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ

نری مقدس آرزوؤں اور حسین تمناؤں سے کچھ نہیں بنتا۔

ایک شبہ کہا جاتا ہے کہ جب ایک مسلمان خدا سے ان حضرات کے راستہ پر چلنے کی دعا مانگتا ہے جو مُنعم علیہ ہیں۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ (۱/۶)۔

"ان لوگوں کا راستہ جن پر (اے اللہ) تو نے اپنا انعام کیا!"

اور منعم علیہ حضرات کی تفصیل یہ ہے کہ وہ صالحین، صدیقین، شہدار اور انبیار ہیں۔

وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا (۴/۶۹)۔

"جو اللہ اور رسول کی اطاعت کریگا تو یہ لوگ ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیار اور صدیقین، شہدار اور صالحین۔ یہ حضرات عمدہ رفیق ہیں"۔

تو اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان ایک نبی کے راستے پر چلتے چلتے خود بھی نبی بن سکتا ہے اور اس استدلال سے بعض لوگ اجرائے نبوت کا ثبوت لاتے ہیں۔ یہ استدلال قرآنِ کریم کی تعلیم سے یکسر ناواقفیت پر مبنی ہے۔ اس کی تفصیل معراجِ انسانیت (بابِ ختمِ نبوت) میں ملے گی۔

ایک اور شبہ اکثر کہا جاتا ہے کہ اقوامِ مغرب کو وہ تمام خوشگواریاں اور توانائیاں حاصل ہیں جنہیں قرآنِ کریم نے انعاماتِ خداوندی کہہ کر پکارا ہے۔ اس اعتبار سے وہ اقوام منعم علیہ قرار پائیں گی، حالانکہ وہ خدا تک کی منکر ہیں اور اس کی متعین کردہ انسانی اقدار کو بھی تسلیم نہیں کرتیں۔ اس کا کیا جواب ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ خدا کے قوانین کی دو شقیں ہیں۔ ایک قوانین وہ ہیں جن کا تعلق مادی کائنات سے ہے، انہیں قوانینِ فطرت کہا جاتا ہے۔ جو قوم ان قوانین کے مطابق فطرت کی قوتوں کو مسخر کرلے گی اسے خوشحالیاں اور توانائیاں مل جائیں گی۔ اس میں مومن اور کافر کی کوئی تمیز نہیں۔

لیکن قوانینِ خداوندی کی دوسری شق وہ ہے، جس کا تعلق انسانی زندگی سے ہے۔ جو قوم فطرت کی قوتوں کو تو مسخر کرلے لیکن انھیں ان قوانین کے مطابق صرف میں نہ لائے، اسے نہ خود داخلی امن و سکون نصیب نہ ہوگا اور نہ ہی باقی نوعِ انسان ان کی طرف سے اطمینان اور سکون میں رہے گی، جیسا کہ آجکل ہو رہا ہے۔ لیکن جو قوم، فطرت کی قوتوں کے ماحصل کو انسانی اقدار کے مطابق صرف کرے گی، اس کی اپنی ذات کی بھی نشوونما ہوتی جائے گی اور باقی دنیا بھی ان کے زیرِ حفاظت امن وچین کی زندگی بسر کرے گی۔ ایسی قوم کو جماعتِ مومنین کہا جاتا ہے۔ بنابریں، اقوامِ عالم تین شقوں میں بٹ جائیں گی۔

(۱) وہ قوم جو قوائے فطرت کو مسخر کرکے، انھیں مستقل اقدارِ انسانیت کے مطابق صرف میں لائے، اسے جماعتِ مومنین کہا جائیگا۔

(۲) وہ قوم جو فطرت کی قوّتوں کو مسخر کرکے، انھیں اپنے مفاد اور خواہشات کے مطابق صرف کرے، یہ کفّار کی جماعت ہوگی اور

(۳) اور وہ قوم جو فطرت کو مسخر ہی نہ کرے، اسے آدمیت کی سطح بھی نصیب نہیں ہوگی۔ وہ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرے گی۔

۱۰

فضل

فضل کے معنی عربی زبان میں فضل کا لفظ "کمی" کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے، یعنی کسی چیز کا کم نہ ہونا، بلکہ زیادہ ہونا۔ جتنی ضرورت ہے اس سے بھی زائد۔ عام طور پر یہ لفظ معاشی سہولتوں کے لئے آتا ہے لیکن اس کا استعمال فضیلت، برتری، مدارج کی بلندی وغیرہ کے لئے بھی ہوتا ہے۔ نیز انعام واکرام کے لئے بھی اور احسان وکرم وگستری کے لئے بھی، یعنی جتنا کسی کا واجب ہے اس سے بھی زیادہ دے دینا یا بلا مزدو معاوضہ؛ احساناً دے دینا۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں ہے۔

وَ لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ط (۲/۲۳۷)

"اور آپس میں فضل (احسان) کرنے کو بھول مت جاؤ۔"

اس قسم کے انعام واکرام کا بخشندہ، ایسے سحابِ جود وسخا سے دُرفشانی کرنے والا (خدا) ذو فضلِ عظیم ہے (۳/۱۷۴) اور جس پر افضالِ الٰہی کی بارشیں ہوں وہ صاحبِ فضل یعنی "اُولو الفضل" ہے۔ سورۂ نور میں واقعۂ افک کے بعد فرمایا۔

وَ لَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَ السَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ صلے (۲۴/۲۲)۔

"اور جو لوگ تم میں فضل (بزرگی اور وسعت) والے ہیں وہ ایسی قسم نہ کھالیں کہ وہ اہلِ قرابت، مساکین اور مہاجرین کو اللہ کی راہ میں نہیں دیں گے۔"

نبوّت فضلِ ایزدی

انعامات کی طرح فضلِ الٰہی کی تقسیم بھی دین و دنیا کے ہر دو شعبوں میں کی جاسکتی ہے. پہلے شعبۂ دین کو لیجئے.

نبوّت فضلِ ایزدی ہے اور اس کا ملنا مشیّتِ خداوندی پر منحصر ہے، کسی کے کسب و ہنر پر نہیں. اس کا اجمالی ذکر انعام کے عنوان میں آچکا ہے. اہلِ کتاب' بالخصوص یہود کہا کرتے تھے کہ جو ہمارے دین کا اتباع نہ کرے اور وہ بنی اسرائیل میں سے نہ ہو' وہ نبی کیسے ہوسکتا ہے؟ اس کے جواب میں کہا:

قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۚۙ‏ (3/73).

"ان سے کہدو کہ (تم کس زعمِ باطل میں مبتلا ہو گئے ہو) فضل تو اللہ کے ہاتھ میں ہے. وہ اپنے قانونِ مشیّت کے مطابق جسے چاہتا ہے اپنے فضل وکرم سے مالا مال کردیتا ہے. وہ بڑی وسعت رکھنے والا ہے اور (اہل و نااہل) کو جانتا ہے."

اسی سلسلہ میں دوسری جگہ کہا؛

وَ اللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ○ (2/105).

"اللہ اپنے قانونِ مشیّت کے مطابق جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے لئے مختص کرلیتا ہے اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے." (نیز 17/86 — 87؛ 2/90).

قرآن کریم فضلِ ایزدی ہے

نبوّت سے مُراد وحیِ خداوندی تھا جو اب قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے. اس لئے قرآنِ مجید بھی خدا کا فضل اور اس کی رحمت ہے.

نوعِ انسان کو اس کا ملنا بھی فضلِ ایزدی اور اس کی بدولت جو کچھ عالمِ انسانیّت کو حاصل ہو' وہ بھی اس کا فضل و رحمت :-

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ○ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ اعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ فَضْلٍ ۙ وَّ يَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ○ (4/174 — 175).

"اے نوعِ انسانی! تمہارے پاس تمہارے خدا کی طرف سے بُرہان (یعنی دلیل و حجت) آ چکی. اور ہم نے تمہاری طرف ایک کھلی ہوئی روشنی نازل کر دی. پس جو اللہ پر ایمان لائے اور اس (روشنیٔ قرآن) کو مضبوطی سے تھام لے، سو انھیں اللہ عنقریب اپنی رحمت اور فضل میں داخل کر لے گا اور انھیں اپنی طرف لے جانے والی راہ دکھائے گا، ایسی راہ جو بالکل سیدھی (اور عدل کی) راہ ہے"۔

لہٰذا قرآن ایک ایسی نعمتِ کبریٰ اور احسانِ عظیم ہے جس کے ملنے پر نوعِ انسانی جتنی مسرت کا بھی اظہار کرے کم ہے۔ (۵۸ — ۱۰/۵۷)۔ قرآنِ کریم کے ساتھ صاحبِ قرآن علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ گرامی بھی انسانیت کے لئے کچھ کم نعمت نہ تھی. یہ بھی اللہ کا فضل و احسان تھا۔

يَآيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ۙ وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا ○ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا ○ (۴۵ — ۳۳/۴۷)۔

"اے نبی! ہم نے تمہیں شاہد، مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے خدا کے قانون کے مطابق اس کی طرف دعوت دینے والا اور ایک روشن شمع اور ایمان والوں کو بشارت دیجئے کہ ان کے لئے اللہ کی طرف سے یہ بہت بڑا فضل ہے"۔ (نیز ۹ — ۶۲/۲)۔

وراثتِ کتاب فضلِ کبیر ہے یہی کتاب جس کی تعلیم نبی اکرمؐ نے دی تھی، امتِ مسلمہ کو وراثتاً ملی. یہ وراثت بجائے خویش ایک فضلِ کبیر ہے۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ۞ (۳۵/۳۲)۔

"پھر ہم نے اس کتاب کو ان لوگوں کو بطور وراثت دیا جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے (اس کام کے لئے) منتخب کر لیا. پھر ان میں سے کچھ تو ایسے ہو گئے جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا، کچھ درمیانہ روش پر چلنے والے اور کچھ ایسے جو قانونِ خداوندی کے مطابق بھلائی کے کاموں میں سابقت کرتے ہیں. یہ فضلِ کبیر ہے۔

(ہوسکتا ہے کہ اس آیت میں "مسابقت فی الخیرات" کو فضلِ کبیر کہا گیا ہو۔ جب بھی بات وہی ہے قرآنِ کریم کی وراثت سے مقصود یہ ہے کہ ایمان والے اعمالِ صالحہ میں بڑھتے جائیں)۔

اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شریعت کوئی ایسا بوجھ نہیں جو اٹھائے نہ اٹھ سکے، بلکہ

قابلِ عمل شریعت فضلِ خداوندی ہے

ایسا آسان ضابطہ ہے جس پر بسہولت چلا جا سکے۔ کوئی ایسی زنجیر نہیں جس سے انسانی حریّتِ فکر و عمل مقید ہو جائے، کوئی ایسا حکم نہیں جو ناممکن العمل ہو۔ ایسی شریعت کا ملنا بھی خدا کا فضل ہے۔ (۵۹-۶۰/۱۶)

اسی کی تائید سورۂ نُور میں آئی ہے جہاں کہا گیا ہے کہ جو لوگ پاک دامن عورتوں پر کوئی تہمت عائد کریں، تو انہیں،

شریعت کی آسانی کی مثال

اپنے دعوے کے ثبوت میں چار گواہ لانے ہوں گے اور اگر وہ ایسا نہ کر سکیں، تو انہیں سزا دی جائے گی۔ اس لئے کہ کسی کے دامنِ عفت کو داغدار کرنے کی کوشش کرنا کچھ کم جرم نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے خلاف تہمت عائد کرے اور گواہ نہ مل سکیں تو اسے چاہیئے کہ اپنے دعوے کے ثبوت میں قسم اٹھائے۔ اس استثناء نے قانون کو آسان بنا دیا۔ اس آسانی کو فضلِ الٰہی کہا گیا ہے۔

وَ لَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ وَ اَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ۝ (۲۴/۱۰)۔

"اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور رحمت نہ ہوتی (تو یہ آسانیاں نہ ملتیں)، اور اللہ توّاب و حکیم ہے۔"

رُشد و ہدایت فضلِ خُداوندی ہے

اب اس قرآن سے رشد و ہدایت حاصل کرنا اور اسی صراطِ مستقیم پر چلنا فضلِ خداوندی ہے (۷-۸/۴۹)

انبیاءِ سابقہ بھی رُشد و ہدایت ملنے کو فضلِ الٰہی قرار دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت یوسفؑ اپنے قید خانہ کے وعظ میں فرماتے ہیں۔

وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ۝

"میں تو اپنے آباء و اجداد، یعقوب و اسحٰق و ابراہیم کی ملت کا اتباع کرتا ہوں۔ ہمارے لئے

یہ قطعاً زیبا نہیں کہ ہم خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک قرار دیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے، ہم پر اور تمام نوعِ انسانی پر۔ لیکن اکثر لوگ اس کی قدر نہیں کرتے۔"

گمراہی سے بچنا فضلِ خداوندی ہے

لیکن طاغوتی قوتیں ہمیشہ اس کوشش میں رہتی ہیں کہ لوگوں کو رُشد و ہدایت کی راہ سے بھٹکا دیا جائے۔ خود نبی اکرمؐ کے متعلق فرمایا؛

وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكَ وَ رَحْمَتُهٗ ......وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكَ عَظِیْمًا ۝ (۴/۱۱۳)۔

"اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان لوگوں میں سے ایک جماعت نے تو تمھیں غلطی میں ڈال دینے کا تہیہ کر ہی لیا تھا، مگر یہ خود اپنے آپ کو غلط راستے پر ڈال رہے ہیں اور تمہیں ذرہ برابر بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے (کیونکہ) اللہ نے تم پر کتاب و حکمت نازل کر دی ہے اور وہ باتیں سکھا دی ہیں جو تم نہیں جانتے تھے اور تم پر اللہ کا بہت بڑا فضل ہے"۔

اسی لئے ایمان والوں کو تاکید کر دی گئی ہے، وہ خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر شیطان کے وساوس کا اتباع نہ کریں۔ یہ بھی اللہ کا بہت بڑا فضل ہے اسی سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ (۲۴/۲۱)۔ اس تزکیۂ

سعادتِ اُخروی فضل ہے

نفس (انسانی ذات کی نشوونما) سے دنیاوی زندگی میں جو نتائج مرتب ہوتے ہیں، ان کی تفصیل آگے چل کر ملے گی۔ اُخروی زندگی میں فائز المرام ہونا بھی فضلِ ایزدی ہے۔ چنانچہ متعدد مقامات میں جنت اور اس کی نعمائے کو فضل سے تعبیر کیا گیا ہے (مثلاً ۵۷/۲۱؛ ۴۴/۵۱-۳۵/۳۴؛ ۳۵)۔ یہ فضلِ کبیر اعمالِ صالحہ کے ساتھ مشروط ہے۔

وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِیْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ لَهُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِیْرُ ۝ (۴۲/۲۲)۔

"اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالح کئے، وہ جنت کے باغات میں ہوں گے اور جس چیز کو وہ چاہیں گے، ان کے رب کے ہاں سے ان کو ملے گی اور یہ فضلِ کبیر ہے"۔

یہی وہ فضل و کرم ہے جس سے مقتولین فی سبیل اللہ سرفراز کئے جاتے ہیں (۱۷۰-۱۷۱ـ ۳/۱۶۸) اور یہی وہ حضرات ہیں جن کی رفاقت نصیب ہو جانا اللہ کا فضل ہے۔

وَ مَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ الرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیۡقِیۡنَ وَ الشُّہَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیۡنَ ۚ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیۡقًا ؕ ذٰلِکَ الۡفَضۡلُ مِنَ اللّٰہِ ؕ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ عَلِیۡمًا (۷۰-۶۹/۴)۔

"اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریگا تو یہ لوگ ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین اور یہ حضرات اچھے رفیق ہیں۔ یہ فضل ہے اللہ کی جانب سے اور اللہ کافی جاننے والا ہے"۔

دنیاوی معاملات میں فضلِ ایزدی

اب دنیاوی معاملات میں فضلِ خداوندی کی جلوہ ریزیاں دیکھئے۔ یہ کارگہ کائنات جس میں ایک طرف تگ و تازِ حیات کے لئے اتنا وسیع و عریض میدان کھلا چھوڑ رکھا ہے اور دوسری طرف تسکین و راحت کے اتنے فراواں سامان فراہم کر رکھے ہیں، نوعِ انسانی کے لئے فضل ہے۔

اَللّٰہُ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الَّیۡلَ لِتَسۡکُنُوۡا فِیۡہِ وَ النَّہَارَ مُبۡصِرًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی النَّاسِ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَشۡکُرُوۡنَ ﴿۶۱/۴۰﴾۔

"اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے رات بنائی کہ اس میں آرام کرسکو اور دن بنایا کہ اس میں دیکھ بھال کر (بھاگ دوڑ) کرسکو۔ اللہ تعالیٰ نوعِ انسانی پر فضل کرتا ہے۔ لیکن اکثر لوگ سپاس گزار نہیں ہوتے"۔

امتیازی زندگی فضلِ ایزدی ہے

یہ تو تھا نظامِ فطرت کے فیضانِ عام کا تذکرہ۔ اب ایمان و اعمالِ صالح کی برکات سامنے لائیے۔ قرآن کریم نے ایک چیز کو بطور اساس و بنیاد بیان کیا ہے اور وہ یہ کہ دین کے اتباع سے انسان کو امتیازی زندگی حاصل ہوتی ہے۔ عمومی اور اوسط درجے کی زندگی بھی نہیں چہ جائیکہ ذلت و مسکنت کی زندگی اور امتیازی زندگی اللہ کا فضل ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّ يُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (۸/۲۹)

"اے ایمان والو! اگر تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے رہو گے تو وہ تمہیں ایک امتیاز عطا فرما دے گا اور تمہاری ناہمواریوں کو تم سے دور کر دیگا اور تمہیں سامانِ حفاظت عطا کر دے گا اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

ایسی قوم کو ہمیشہ زندہ اقوام میں شمار ہونا چاہیئے۔ مُردہ قوم کو زندگی مل جانا بھی خدا کا فضل ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ هُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۪ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝ (۲/۲۴۳)

"کیا تم نے ان کو نہیں دیکھا جو اپنے گھروں سے ہزاروں کی تعداد میں نکلے، موت سے ڈرتے ہوئے۔ پس اللہ نے ان سے کہا کہ تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو مرنا سیکھو (چنانچہ جب وہ دشمن کے مقابلہ میں سربکف کھڑے ہو گئے تو اللہ نے) اس کے بعد انہیں حیاتِ تازہ سے سرفراز کر دیا۔ اللہ تو لوگوں پر فضل ہی کرنے والا ہے، لیکن اکثر لوگ اس کی قدر نہیں کرتے۔"

قوتوں کا حاصل ہونا فضل ہے

اسی طرح فائق قوتوں کا حاصل ہو جانا بھی خدا کا فضل ہے۔ حضرت سلیمانؑ کے قصہ میں جہاں ملکۂ سبا کے مطیع و فرمانبردار ہو جانے کا ذکر ہے، ان حیرت انگیز قوتوں کو دیکھ کر انہوں نے کہا کہ:-

قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۖ۫ لِيَبْلُوَنِيْۤ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ (۲۷/۴۰)

"یہ میرے اللہ کے فضل سے ہے تاکہ وہ دیکھ لے کہ میں شکر گزار ہوں یا ناشکرا!"

دوسری جگہ کہا ہے کہ سلیمانؑ کے پاس بڑا عظیم لشکر تھا جو بیشتر گھوڑوں کے رسالوں پر مشتمل تھا اور حضرت سلیمانؑ کو ان لشکروں سے متعلق قواعد و ضوابط کا پورا پورا علم حاصل تھا۔ اسے بھی خدا کا فضل کہا گیا (۲۷/۱۶)۔ حضرت داؤدؑ کو زرہ سازی کے فن میں کمال حاصل تھا۔ اسے بھی فضلِ خداوندی کہہ کر پکارا گیا۔ (۳۴/۱۰-۱۱)۔

فتح و نصرت فضلِ خداوندی ہے

دشمن کے مقابلہ میں فتح و نصرت کا حاصل ہونا، میدانِ کارزار سے کامران و شادکام لوٹنا، یہ بھی فضلِ خداوندی

ہے (۲/۱۷۱-۳/۱۷۳)۔ دوسری جگہ میدانِ جنگ میں "مصیبت" کے مقابلہ میں "فضل" کا لفظ آیا ہے، جس سے اس کے معنی اور بھی واضح ہوجاتے ہیں (۴/۷۲-۴/۷۳)۔ میدانِ جنگ سے قطع نظر، اس دنیائے جدّوجہد میں کونسا مقام ایسا ہے جس میں کوئی نہ کوئی مُبارزت سامنے نہیں ہوتی۔ زندگی تو نام ہی سعیٔ پیہم، کشمکشِ مسلسل اور جہادِ غیر منقطع کا ہے۔ لہٰذا، جہادِ زندگانی میں کامیابی خدا کا فضل ہے۔ اس کے برعکس، اگر دشمن کی کوئی چال کارگر ہوگئی، اس کی کوئی تدبیر غالب آگئی یا یہ اس کے فریب میں آکر کوئی ایسا کام کر بیٹھا جو مفادِ ملّت کے خلاف ہے، تو یہ اتباعِ شیطانی ہے۔ اس سے محفوظ رکھے جانا بھی فضلِ خداوندی ہے۔ (۴/۸۳)۔

انفاق فی سبیل اللہ سے فضلِ ایزدی

اس لئے کہ شیطانی وساوس (انسان کی ذاتی مفاد پرستی کے جذبات) اسے اپنے دامِ فریب میں پھنسا کر جادۂ ہدایت سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً قرآنی نظامِ ربوبیّت کا تقاضا ہے کہ جو کچھ اپنی ضروریات سے زیادہ ہو، اُسے نظامِ معاشرہ کی تحویل میں دیدیا جائے تاکہ اس سے دیگر ضرورتمندوں کی ضروریات پوری کی جائیں۔ لیکن انسان کی انفرادی مفاد پرستیاں اسے یہ کہہ کر ڈراتی ہیں کہ اگر تم نے یہ سب کچھ "دوسروں" کو دے ڈالا تو تمہارے "اپنے" پاس کیا رہے گا؟ بھوکے مر جاؤ گے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ جو بظاہر دوسروں کو دینا سمجھا جاتا ہے، فی الحقیقت خود "اپنے آپ" ہی کو دینا ہے۔ اس لئے کہ درخت کی جڑ کو سیراب کرنا خود پتّوں اور شاخوں کی شگفتگی و شادابی کے لئے ہوتا ہے۔ ملّت کی اجتماعی زندگی کا فروغ، افراد کی کامرانی اور کامیابی کا باعث ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کو قرآنِ کریم نے انفاق کی تاکید کے بعد ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَ یَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَ اللّٰہُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَۃً مِّنْہُ وَ فَضْلًا ؕ وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۚ (۲/۲۶۸)

"شیطان تمہیں محتاجی سے ڈراتا ہے اور بخل کی ترغیب دیتا ہے اور اللہ تم سے حفاظت اور فضل (زیادہ دینے) کا وعدہ کرتا ہے اور اللہ وسعت والا جاننے والا ہے"۔

قیامِ امن فضلِ ربّی ہے

انسان کی انتہائی خواہش اور تمنا یہ ہے کہ وہ امن اور چین سے رہے۔ لیکن جو لوگ (کسی نہ کسی طرح) قوّت اور اقتدار حاصل کر لیتے ہیں، وہ دوسروں کا امن چھین لیتے اور معاشرہ میں فساد برپا کر دیتے ہیں۔ لیکن ان کے مقابلے میں ایک اور جماعت کھڑی کر دی جاتی ہے جو ان مُستبدین کی دست درازیوں کو روکتی ہے اور اس طرح معاشرہ میں امن قائم

کردیتی ہے۔ اسے بھی اللہ کے فضل سے تعبیر کیا گیا ہے۔

وَ لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ○ (۲/۲۵۱)۔

"اور اگر اللہ بعض لوگوں (کی سرکشی) کو دوسرے لوگوں (کی قوت) سے رُکتا نہ رہے، تو زمین پر فساد ہی فساد برپا ہو جائے۔ لیکن اللہ تو اہلِ عالم پر فضل کرنے والا ہے"۔

جو لوگ دنیا میں قوت حاصل کر لیتے ہیں، وہ سمجھ لیتے ہیں کہ اب جو ہمارے جی میں آئے ہم کریں۔ ہم سے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اگر فی الواقعہ ایسا ہو تو دنیا میں فساد ہی فساد برپا ہو جائے، لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہاں خدا کا قانون مکافاتِ عمل کارفرما ہے جس کے مطابق ہر عمل (حتیٰ کہ دل میں گزرنے والے خیالات تک) کا نتیجہ مرتب ہو کر رہتا ہے۔ یہ قانون اور اس کا بلا رُو رعایت نافذ العمل ہونا، بجائے خویش فضلِ خداوندی ہے۔

مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۚ وَ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ۙ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ○ (۳۰/۴۴-۴۵)۔

"جو حق و صداقت سے انکار اور سرکشی کی راہ اختیار کریگا، تو اس کا خمیازہ وہ خود بھگتے گا اور جو اعمالِ صالح کا مرتکب ہو گا، تو وہ اِن اعمال کے حیات بخش نتائج سے متمتع ہو گا۔ خدا کا یہ قانونِ مکافات اس لئے سرگرمِ عمل ہے کہ ایمان و اعمالِ صالح والوں کو ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ مل سکے۔ یہ خدا کا فضل ہے۔ وہ حق و صداقت سے انکار و سرکشی کو پسند نہیں کرتا"۔

فضل کس کو ملتا ہے

ہم نے دیکھ لیا ہے کہ فضلِ خداوندی کی کیا کیا متنوع شکلیں ہیں اور وہ کس کس انداز و اسلوب سے کارفرما رہتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ فضل ملتا کسے ہے اور کیسے ملتا ہے؟ اس کے لئے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ خدا کا یہ فضل اسے ملتا ہے جو اس کا مستحق ہوتا ہے اور مستحق ہونے کی شرائط یہ ہیں کہ انسان شاہراہِ حیات پر ہر وقت اپنا جائزہ لیتا رہے کہ اُس کا قدم غلط سمت کی طرف تو نہیں اُٹھ گیا؟ اگر وہ دیکھے کہ وہ کہیں سے غلط راستے پر چل پڑا تھا تو پھر واپس اُس مقام پر پہنچے جہاں سے اُس کا قدم غلط سمت کی طرف اُٹھا تھا (اسے توبہ کہتے ہیں) اور اس کے بعد پھر اُس راستے پر چلے جسے قانونِ خداوندی (قرآن) نے اُس کے لئے متعین کیا ہے۔ اس سے وہ راہرو فضلِ خداوندی

کا مستحق بنتا ہے۔ بہرحال فضل ملتا اسی کو ہے جو اس کا مستحق ہوتا ہے۔

وَّ اَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْهِ یُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّ یُؤْتِ كُلَّ ذِیْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ..... (۱۱/۳)۔

"اور یہ کہ تم اپنے رب سے سامانِ حفاظت طلب کرو۔ پھر اس کی طرف لوٹ آؤ تو وہ تم کو ایک وقتِ معینہ تک کے لئے (زندگی کے) فوائد سے اچھی طرح بہرہ مند کریگا اور وہ ہر صاحبِ فضیلت کو اپنا فضل عطا کرتا ہے"۔

اور اس "توبہ" کے بعد یہی نہیں کہ تلافیٔ مافات ہو جاتی ہے بلکہ طلب سے بھی زیادہ ملتا ہے۔ (۴۲/۲۵-۲۶)

مُہلت کا ملنا بھی فضل ہے خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ایک حقیقتِ ثابتہ ہے جس کی رُو سے ہر عمل اپنا نتیجہ مرتب کرتا ہے، لیکن عمل کے سرزد ہونے اور اس نتیجہ کے محسوس شکل میں سامنے آنے میں ایک وقفہ ہوتا ہے (ایسے ہی جیسے زمین میں بیج ڈالنے اور فصل کے پکنے میں ایک وقفہ ہوتا ہے) اگر اس وقفہ میں انسان اپنی غلط روش سے باز آکر صحیح راستہ اختیار کر لے اور ایسے کام کرے جن کے تعمیری نتائج بہت زیادہ وزنی ہوں تو اس سے اس کی سابقہ غلط روش کے تخریبی نتائج زائل ہو جاتے ہیں۔ اسے "معافی مل جانا" کہتے ہیں، یعنی اس کے خوشگوار اعمال (حسنات) اس کے سابقہ ناخوشگوار اعمال (سیّات) کے مُضر اثرات سے اسے محفوظ کر دیتے ہیں۔ اسے "مغفرت" کہتے ہیں۔ لہٰذا یہ مہلت کا وقفہ (جس میں اس قسم کی باز آفرینی کا امکان ہوتا ہے) خدا کا فضل ہوتا ہے۔ قرآن کے مختلف مقامات میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے (مثلاً ۲/۶۴؛ ۲۷/۱۱-۷۳)۔ جنگِ اُحد میں جب مسلمانوں کی ایک جماعت سے عسکری لغزش ہو گئی اور اس کی وجہ سے انہیں پسپا ہونا پڑا تو اس کے بعد ان کی "توبہ" سے انہیں "معافی دیدی گئی" یعنی جب انھوں نے پھر اپنی منتشر قوتوں میں جمعیت پیدا کر لی اور ہمت اور حوصلہ سے دشمنوں کے مقابلہ میں جم کر کھڑے ہو گئے تو ان کی شکست، فتح سے بدل گئی۔ اُسے بھی فضلِ خداوندی سے تعبیر کیا گیا ہے (۳/۱۵۱)

اسی طرح واقعۂ اِفک میں کہا گیا ہے کہ جن لوگوں سے لغزش ہو گئی تھی، جب انھوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا اور اس طرح اپنی غلط روش سے تائب ہو گئے تو قوم پر سے تباہی کا عذاب ٹل گیا۔ اسے بھی خدا کا فضل کہہ کر پکارا گیا ہے۔ (۲۴/۱۴)۔

محنت سے زیادہ معاوضہ یہ تو تھی کیفیت غلطیوں اور لغزشوں کی۔ جہاں تک اعمالِ صالحہ کا

تعلق ہے، ان کا بدلہ، انسانی حساب و شمار سے بھی زیادہ ملتا ہے۔ اسے بھی فضلِ خداوندی سے تعبیر کیا گیا ہے۔
(۲۲/۳۸؛ ۳۰—۲۹؛ ۳۵/۲۹؛ ۴/۱۷۳؛ ۴/۳۲)۔

فضل بمعنی معاشی سہولتیں

معاشی سہولتوں کے لئے فضل کا لفظ متعدد مقامات میں آیا ہے۔ مثلاً سورۂ جمعہ میں ہے؛

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ...... (۶۲/۱۰)۔

"پس جب صلوٰۃ ختم ہو جائے تو تم زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل کی تلاش کرو۔"

اسی فضل کی تلاش، نبی اکرمؐ اور جماعتِ مومنینؓ کرتی تھی۔

يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا (۴۸/۲۹)۔

"اللہ کے فضل اور رضا جوئی کی جستجو میں لگے رہتے ہیں۔"

دوسری جگہ مہاجرین کے متعلق ہے۔

يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا (۵۹/۸)۔

"اللہ کے فضل اور رضا جوئی کی تلاش میں رہتے ہیں"

یہ کیسے ہوتا ہے؟

قرآن نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ دولت اور حکومت، شوکت و حشمت، زندگی کی خوشگواریاں اور رزق کی فراوانیاں، غرضیکہ وہ سب کچھ جسے "فضل" سے تعبیر کیا گیا ہے، دین کی پابندی سے حاصل ہوتا ہے۔ اگر مسلمانوں نے اپنے دین کو چھوڑ دیا تو خدا یہی کچھ کسی اور قوم کو عطا کر دیگا۔ سورۂ مائدہ میں ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗۤ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۫ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ (۵/۵۴)۔

"اے ایمان والو! جو شخص تم میں سے اپنے دین کے نظام سے پھر جائے گا (تو وہ یہ نہ سمجھے کہ

پھر جانے سے دینِ حق کو کچھ نقصان پہنچے گا) اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ ایک ایسی قوم پیدا کردیگا
جنہیں اللہ دوست رکھتا ہوگا اور وہ خدا کو دوست رکھتے ہوں گے۔ مومنین کے سامنے وہ
جُھک جانے والے ہوں گے اور کفار کے مقابلہ میں سخت گیر۔ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور
کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے عطا
کرے اور اللہ وسعت والا علم والا ہے"!

حاصلِ کلام | ہم نے یہ دیکھ لیا کہ اللہ کی ذات (جو مکمل ترین اور بلند ترین ذات ہے) ذو الفضل العظیم ہے، یعنی ہر قسم کے فضل (بلکہ فضلِ عظیم) کی مالک۔ وہ ساری نوعِ انسانی کو (اپنے قانون کے مطابق) فضل عطا کرتا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ جو معاشرہ اُن افراد پر مشتمل ہوگا جن کی ذات کی نشوونما ہوگئی ہو، اس معاشرہ کو یہ تمام افضال واکرام حاصل ہوں گے اور وہ انہیں تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت کے لئے عام کردیگا۔ لہٰذا یہ دیکھنے کے لئے کہ کوئی معاشرہ قوانینِ خداوندی (دینِ الٰہی) کے مطابق متشکل ہے یا نہیں، دیکھنا یہ ہوگا کہ اُس معاشرہ کو زندگی کی خوشگواریاں بافراط میسر ہیں یا نہیں (اسی کو فضل کہتے ہیں) اور پھر وہ ان خوشگواریوں کو نوعِ انسانی کے لئے عام کئے ہوئے ہے یا نہیں۔ جو قوم خود کمزور اور محتاج ہے یا وہ فطرت کی قوتوں اور رزق کے سرچشموں کو کسی خاص گروہ (قوم یا ملک) تک محدود رکھے ہے اور ہر فرزندِ آدم کو اس میں برابر کا شریک نہیں سمجھتی، اس قوم کو خدا کے مقرر کردہ نظامِ زندگی (الدّین) سے کوئی واسطہ نہیں۔ سمجھ لیجئے کہ اس قوم کے افراد کی ذات کی نمود نہیں ہوئی۔

۱۱

فضل، رحمت اور انعام کے سلسلہ میں قرآنِ کریم نے ایک اور خصوصیت کا بھی ذکر کیا ہے جسے اس نے مَنّ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ مَنّ سے مراد ہے کسی کو بلا مزد و معاوضہ اور بغیر محنت اور مشقت کے کچھ دینا، جیسے سامانِ زیست (ہوا، روشنی، پانی، زمین میں رزق) تمام نوعِ انسانی کو بلا مزد و معاوضہ دے رکھا ہے۔ یہ خدا کی صفت ہے جس کی نمود "اس کے بندوں" میں بھی ہونی چاہیئے[1]۔

لیکن اگر کوئی شخص کسی کو بلا معاوضہ کچھ دے کر، پھر ساری عمر اسے احسان جتاتا رہے، تو یہ مَنّ ایک بوجھ بن جاتا ہے۔ (مَنّ ایک وزن کا نام ہے جو رطل سے زیادہ وزنی ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں کا مَن (MAUND) بھی اس وزن کی شہادت دیتا ہے)۔ ان مقامات میں مَنّ کا لفظ صفت نہیں ہوگی، بلکہ عیب ہوگا۔

مَنّ بلا مزد و معاوضہ کے لئے قرآن میں ہے کہ جنگ میں دشمن کے جو قیدی تمہارے ہاتھ آئیں انھیں؛

---

[1] چونکہ ہمارے ہاں اس خصوصیت کے لئے احسان کا لفظ رائج ہے، اس لئے مَنّ کا ترجمہ اس لفظ سے کیا جائیگا، ورنہ احسان کی حقیقت اس سے کچھ الگ ہے۔

فَاِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً (۴/۴۷)۔

"یا بلا معاوضہ چھوڑ دو اور یا فدیہ لے کر"۔

دوسری جگہ ہے کہ کسی کو بلا مزد و معاوضہ کچھ دو تو اس نیّت سے نہ دو کہ اس کے بدلہ میں اس کی طرف سے تمہیں زیادہ کچھ ملے گا۔

وَ لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (۷۴/۶)

"اس غرض سے بلا معاوضہ مت دو کہ اس کے بدلے میں زیادہ (معاوضہ) ملے گا"۔

"بوجھ بن جانے" کے معنوں میں سورۂ بقرہ میں ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَآ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ٥ (۲/۲۶۲)۔

"جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور پھر اس انفاق کو نہ تو اس کے سر پر اس طرح لاد دیتے ہیں کہ وہ بے چارہ اس کے بوجھ تلے دبا رہے اور نہ ہی اس کی وجہ سے کسی کی دل آزاری کرتے ہیں۔ ان کا اجر اپنے ربّ کے ہاں ہے ان پر نہ کوئی خوف ہوگا نہ حزن"۔

اس سے ذرا آگے ہے کہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰى... (۲/۲۶۴)۔

"اے ایمان والو اپنے صدقات کو بوجھ بن کر یا کسی کی دل آزاری کر کے ضائع مت کرو"۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ مَنّ کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اب دیکھئے کہ خدا کی طرف سے مَنّ کس کس شکل میں عطا ہوتا ہے۔

نبوّت احسانِ خداوندی ہے

نبوّت بلا مزد و معاوضہ ملتی ہے۔ جب اُمم سابقہ نے اپنے انبیاءؑ سے کہا کہ تم تو بالکل ہمارے جیسے انسان ہو، رسول کس طرح ہو سکتے ہو؟ تو اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ یہ ٹھیک ہے۔

اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ......... (۱۴/۱۱)۔

"ہم تمہارے ہی جیسے انسان ہیں. لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنے قانونِ مشیئت کے مطابق اپنا احسان کر دیتا ہے"۔

کسی قوم میں نبی کا مبعوث ہونا بھی خدا کا احسان (مَنّ) ہے.

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَ إِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۳/۱۶۳)۔

"اللہ نے یقیناً مومنین پر احسان کیا کہ انہی میں سے ایک رسول مبعوث کر دیا جو ان کو خدا کی آیات سناتا ہے اور ان کی ذات کی نشوونما کرتا ہے، انھیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے (اور اس طرح سے اس نے ان پر ہدایت کی راہ کھول دی) حالانکہ اس سے پیشتر یہ لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں تھے"۔

ہدایت مل جانا احسان ہے

اسی لئے یہ بات اور بھی کھول کر بیان کر دی کہ

يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوْا ۖ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ إِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدٰكُمْ لِلْإِيْمَانِ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (۴۹/۱۷)۔

"(اے رسول!) یہ لوگ اسلام قبول کر کے تم پر احسان جتاتے ہیں؟ ان سے کہدو کہ تمہارا اسلام لانا مجھ پر کوئی احسان نہیں، بلکہ یہ تو (اُلٹا) خدا کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت کی، اگر تم سچے ہو تو"۔

اس لئے کہ رسالت (معاذ اللہ) کوئی تجارت نہ تھی کہ جس کے فروغ کے لئے "دوکاندار" کو گاہک کا شرمندۂ احسان ہونا پڑے۔

دولت و حکومت کا ملنا احسان ہے

محکومی اور غلامی خدا کا عذاب ہے. کسی قوم کا اس عذاب سے مخلصی حاصل کر کے حکومت اور دولت کی نعمتوں سے سرفراز ہو جانا مَنّ ہے. بنی اسرائیل جب فرعون کے استبداد سے پس گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی زیردستی کو بالادستی میں تبدیل کرنا چاہا تو فرمایا.

وَ نُرِيْدُ أَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْأَرْضِ........

وَ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۙ وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ......(۵-۶/۲۸)۔

"اور ہم نے ارادہ کیا کہ ان لوگوں پر احسان کریں جن کو دنیا میں (مستبد حکومت نے یوں) ضعیف و ناتواں بنا رکھا تھا اور یہ کہ اُن کو (اقوامِ عالم کا) پیشرو بنا دیں اور ان کو (فرعون کے ملک و سلطنت کا) وارث بنا دیں اور انہیں تمکّن فی الارض عطا فرمادیں۔"

یہ ہے حقیقی احسان جو خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ایک قسم کا احسان وہ بھی ہے جو اُن "خداؤں" کی طرف سے ہوتا ہے جنہیں انسان خود اپنا معبود بنالیتا ہے اور وہ احسان اس قسم کا ہوتا ہے جیسے قصاب بکری کی پرورش سے اس پر احسان کرتا ہے۔ جب فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ "تو بڑا ناشکرگزار ہے۔ ذرا یاد تو کر کہ ہم نے تجھ پر کس قدر احسانات کئے اور تو اب اُن کا بدلہ کس طرح دے رہا ہے۔" اس کے جواب میں حضرت موسیٰؑ نے چار مختصر سے الفاظ میں ایسی حقیقت بیان کردی جس سے سیاستِ فرعونی یکسر بے نقاب ہوجاتی ہے۔ آپ نے فرمایا۔

وَ تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ؕ (۲۶/۲۲)۔

"ہاں تو مجھ پر اپنی وہ نعمتیں گنا رہا ہے جن کے بدلے میں تم نے بنی اسرائیل کو یوں غلام بنا رکھا ہے۔"

غلامی سے نجات مل جانا احسان

یہ "احسان اور نعمت" تو وہ تھی جس سے نجات مل جانا ہی دراصل احسان تھا اور حقیقی احسان جو خدا کی طرف سے ہوا، یہ تھا۔

وَ لَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ۚ وَ نَجَّيْنٰهُمَا وَ قَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ۚ (۱۱۴ ۔ ۱۱۵ ۳۷)

"اور ہم نے موسیٰ اور ہارون پر احسان کیا کہ ان کو اور ان کی قوم کو اس بلائے عظیم سے نجات دلادی۔"

بلکہ یہ احسان تو اس وقت سے ہی شروع ہوگیا تھا جب حضرت موسیٰؑ کو بچپن میں فرعون کی گرفت سے بچایا گیا تھا۔ فرمایا کہ

وَ لَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ۙ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ۙ (۲۰ ۔ ۳۷ ۔ ۳۸)

"(اے موسیٰ)، ہم نے تم پر (اس سے پیشتر) ایک اور مرتبہ احسان کیا تھا جب ہم نے تمہاری ماں

کی طرف وہ حکم بھیجا تھا جو ہم بھیجنا چاہتے تھے۔"

اس کے بعد حضرت موسیٰؑ کو دریا میں بہا دینے کا واقعہ ہے۔ لہٰذا کسی کے پنجۂ استبداد سے یوں محفوظ رکھنا بھی خدا کا احسان ہے۔

جب کسی ظالم انسان یا ظالم قوم کو ان کے جرائم کی پاداش میں گرفتارِ عذاب کیا جائے تو جن لوگوں کو اس عذاب سے محفوظ رکھا جاتا ہے ان پر اللہ کا احسان ہوتا ہے۔ قارون کو جب اس کی انانیت نے گھیر لیا اور سرمایہ پرستی کا بوجھ اسے "زمین میں لیکر دھنس گیا" تو وہ لوگ جو اس کی دولت کو دیکھ کر کہا کرتے تھے کہ کتنا ظلم ہے کہ ہمیں یہ دولت نہ مل سکی، تو انھوں نے دوسرے دن سجدۂ شکر ادا کیا اور کہا کہ

لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ؕ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (۲۸/۸۳)۔

"اگر ہم اللہ کا احسان نہ ہوتا تو ہم بھی یونہی (زمین میں) دھنس گئے ہوتے۔ (یاد رکھو) صداقت سے انکار کرنے والوں کو کامیابی نہیں ہو سکتی۔"

اب اُن پر یہ راز کھُل گیا کہ محض دولت کا مل جانا حقیقی کامیابی اور خوش بختی نہیں۔ اس کے ساتھ صحیح نظام کا ملنا بھی نہایت ضروری ہے۔ نبی اکرمؐ پر شروع شروع میں عام طور پر غریب آدمی ایمان لائے تھے۔ اس نئے معاشرہ میں (جو قانونِ خداوندی کے مطابق متشکل ہوا تھا) ان غریبوں کا مقام، قریش کے بڑے بڑے سرداروں سے بھی بلند تھا۔ اسے دیکھ کر وہ سردار جلا اور کڑھا کرتے تھے کہ ان "ذلیل" لوگوں کی کس قدر عزت افزائی ہو رہی ہے؟ ان کی اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ۝ (۶/۵۳)۔

"اور ہم اس طرح بعض لوگوں کو دوسرے لوگوں کے لئے باعثِ مصیبت بنا دیتے ہیں (کہ یہ سرورانِ قریش جل بھُن کر کہتے ہیں کہ) کیا یہی لوگ ہیں جنہیں اللہ نے اپنے انعام و احسان کے لئے ہم میں سے منتخب فرمایا ہے! (ان سے کہو کہ) کیا خدا کو اس کا علم نہیں کہ کس کی مساعی مشکور ہونی چاہئیں۔"

ان مقامات سے واضح ہے کہ خدا کی ذات نوعِ انسانی کو سامانِ زیست اور ہدایت بلا معاوضہ

دیتی ہے اور پھر اس کی وجہ سے کسی پر کوئی احسان نہیں رکھتی. جس معاشرہ کے افراد کی ذات کی نشوونما (قوانینِ الٰہیہ کے قالب میں) ہو جائے، اس میں ہر ضرورتمند کی ضرورت کو بلا معاوضہ دُور کیا جاتا ہے اور پھر اُن پر کوئی احسان نہیں رکھا جاتا۔ ایک نشوونما یافتہ ذات کی پہچان یہ ہے کہ وہ ضرورت مند کو بلا معاوضہ دیتی ہے اور اس کے بدلہ کا خیال تک بھی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ جس ضرورت مند کی ضرورت پوری کرتے ہیں، ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیتے ہیں کہ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْرًا (۷۶/۹)۔ ہم تم سے، کوئی معاوضہ تو ایک، شکریہ تک کے بھی متمنّی نہیں۔

پہلے باب میں بتایا جاچکا ہے کہ صفاتِ خداوندی میں ایسی صفات بھی ہیں جو بظاہر متضاد دکھائی دیتی ہیں. مثلاً وہ رحیم بھی ہے اور قہار بھی، لیکن اگر ذرا بہ نظرِ تعمق دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہوجائے گی کہ ان صفات کے متضاد ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا. اگر آپ کسی مظلوم کی حمایت کرتے ہیں تو یہ چیز آپ کی رحمدلی اور ہمدردی کے جذبات کی دلیل ہوگی لیکن مظلوم کی حمایت کے لئے ضروری ہے کہ آپ ظالم کے ہاتھ کو ظلم سے روکیں. اس کے لئے آپ کو (عند الضرورت) سختی بھی کرنی پڑے گی. اس سے کہا یہ جائے گا کہ ایک طرف آپ اس قدر رحمدل ہیں اور دوسری طرف اس قدر سخت گیر. لیکن بغور دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ دونوں صفات درحقیقت ایک ہی سکّہ کے دو رُخ ہیں. مظلوم سے ہمدردی اور ظالم کے خلاف سختی، عدل کا تقاضا ہے. صفاتِ خداوندی چونکہ ہر طور سے مکمل ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ اگر وہ غفور الرحیم ہے تو اس کے ساتھ ہی شدید العقاب بھی ہو. لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جس موقع پر جس صفت کے جس قدر اظہار کی ضرورت ہو اس صفت کی اسی قدر نمود ہو. اس کا نام ہے صفاتِ خداوندی کا اسماء الحسنیٰ ہونا، یعنی ان صفات میں پورا پورا توازن و تناسب ہونا.

سابقہ عنوانات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ خدا کی صفات (رحمت، انعام، فضل وغیرہ) کا ظہور کس طرح ہوتا ہے اب تصویر کا دوسرا رُخ سامنے آتا ہے جس میں یہ دکھائی دے گا کہ اس کی (دوسری قسم کی) صفات مثلاً غضب، لعنت وغیرہ کا اظہار کن مواقع پر ہوتا ہے. اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آجائے گی کہ

کہ جس انسان کی ذات کی نشوونما ہوگی اُس سے بھی اس قسم کی (بظاہر) متضاد صفات کا ظہور ہوگا۔ ایسے افراد ایک طرف، رحماء بینھم ہوں گے، تو دوسری طرف اشداء علی الکفار بھی ہوں گے، لیکن یہ صفات ہوں گی ٹھیک ٹھیک توازن لئے ہوئے اسی سے خود اس فرد کی ذات متوازن ہوگی جسے (BALANCED PERSONALITY) کہا جاتا ہے اور جو قوم ایسے افراد پر مشتمل ہوگی، اس قوم کا معاشرہ بھی توازن بدوش اور امنِ عالم کا ضامن ہوگا۔

پہلے خدا کی صفت "غضب" کے متعلق دیکھئے۔ ہمارے ہاں عام طور پر غضب کے معنی غصّہ کے لئے جاتے ہیں اور جب غصّہ کا لفظ بولا جاتا ہے تو ذہن فوراً ایک ایسے جذبہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس کے ماتحت انسان اپنے عقلی توازن کو کھو کر آتش در پیرہن ہو جاتا ہے اور اس دیوانگی کے عالم میں وہ کچھ کر بیٹھتا ہے جس پر اسے بعد میں خود ہی نادم ہونا پڑتا ہے۔ لیکن جب یہ لفظ خدا کی طرف منسوب کیا جائے گا تو اس کے معنی غصّہ کے نہیں ہوں گے، بلکہ یہ غضب دراصل مکافاتِ عمل ہی کا دوسرا نام ہے۔

غضب کا مفہوم

اس سے مقصود جرائم کی پاداش ہے۔ جب اہلِ کتاب مسلمانوں پر اس لئے نکتہ چینیاں کرتے کہ وہ قرآن پر کیوں ایمان لائے ہیں، تو اس کے جواب میں کہا۔

قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِنْ ذٰلِكَ مَثُوبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۚ مَنْ لَعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيْهِ .... (۵/۶۰)۔

"کہئے کہ کیا میں تم کو بتاؤں کہ خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق کن کی حالت ابتر ہوگی، وہ جن پر اللہ نے لعنت کی اور غضب اتارا۔"

یعنی لعنت اور غضب اعمال کی سزا ہی کی مختلف کیفیتیں ہیں۔ اسی طرح بنی اسرائیل نے جب گوسالہ پرستی اختیار کی تو ان سے کہا گیا کہ

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَیَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ ذِلَّةٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُفْتَرِیْنَ ○ (۷/۱۵۲)۔

"جن لوگوں نے گوسالہ پرستی اختیار کی ہے، ان پر بہت جلد ان کے رب کی طرف سے غضب آئیگا۔ اور اس دنیاوی زندگی میں بھی ذلت و رسوائی ہوگی اور ہم افترا پردازوں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں۔"

اس سے واضح ہوگیا کہ غضبِ الٰہی اعمال کی سزا ہی کا دوسرا نام ہے۔ اِس میں اس جذباتی کیفیت کا شائبہ تک نہیں جو انسانی غضب یعنی غصّہ میں پائی جاتی ہے۔

لوگ اس غضبِ الٰہی کو اپنے اعمال کے ذریعے خود دعوت دیتے ہیں اور اسے اپنے اُوپر واجب کر لیتے ہیں۔ بنی اسرائیل کو مخاطب کرکے کہا۔

كُلُوا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ لَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَ مَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ○ (۲۰/۸۱)۔

"جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے خوشگوار چیزیں کھاؤ اور زیادتی نہ کرو ورنہ میرا غضب تم پر واجب ہو جائے گا اور جس پر میرا غضب واجب ہو جاتا ہے وہ یقیناً ہلاک ہو جاتا ہے۔"

پھر جب انہوں نے سامری کے فریب میں آکر گئو سالہ پرستی اختیار کرلی تو حضرت موسیٰؑ نے واپس آکر دیکھا اور غضب آلود ہو کر کہا۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۬ۥ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ ○ (۲۰/۸۶)۔

"اے قوم! (یہ تم نے کیا کیا؟) کیا تمہارے رب نے تمہارے ساتھ ایک بڑی بھلائی کا وعدہ نہیں کیا تھا؟ یا کیا اس عہد کا زمانہ بہت طویل ہو گیا تھا (اور تم اسے یاد نہ رکھ سکے تھے یا مایوس ہو چکے تھے) یا تمہارا یہ ارادہ تھا کہ تم پر خدا کا غضب واجب ہو جائے جو تم نے (یوں) مجھ سے ٹھہرائی ہوئی بات توڑ ڈالی۔

مغضُوبِ علیہ کون ہیں؟ قرآنِ کریم نے اُمَمِ سابقہ کے احوال و کوائف سے بتایا ہے کہ خدا کا غضب کن اعمال کی پاداش میں نازل ہوتا ہے اور اس سے قوموں کی حالت کیا ہو جاتی ہے۔ جب قومِ عاد کو حضرت ہودؑ نے خدائے واحد کی عبودیت کی طرف دعوت دی تو انہوں نے اپنی سرکشی سے اس دعوت کو ٹھکرا دیا اور کہنے لگے کہ ہمارے لئے تو وہی روش ٹھیک ہے جس پر ہمارے آباؤ اجداد چلتے آئے ہیں۔ اس پر حضرت ہودؑ نے کہا۔

قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّ غَضَبٌ ط (۷/۷۱)

"بس اب تمہارے اُوپر تمہارے رب کی طرف سے عذاب اور غضب آیا ہی چاہتا ہے۔"

اور یہ غضب اس انداز سے آیا کہ وَ قَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا (۷/۷۲) اس قوم کی جڑیں تک کاٹ دی گئیں۔ قوموں کی جڑیں کیسے کٹتی ہیں؟ جب ان پر خدا کے غضب کی مار پڑتی ہے تو ان کی کیا حالت ہو جاتی ہے؟ اس کے متعلق قرآنِ کریم نے کھلے کھلے الفاظ میں بتا دیا ہے تاکہ ہر ایک قوم خود دیکھ لے کہ وہ مغضوب علیہ لوگوں میں سے تو نہیں؟ مثلاً جب بنی اسرائیل کے اجتماعی جرائم انتہا سے بڑھ گئے اور ان کی اصلاحِ حال کی کوئی صورت باقی نہ رہی اور ان کے اعمال کے ظہورِ نتائج کا وقت آگیا تو ان کے متعلق کہا گیا کہ

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ط ... (۳/۱۱۱)۔

"جہاں کہیں بھی یہ پائے گئے ان پر ذلت کی مار پڑی، اِلّا یہ کہ خدا کے عہد سے یا انسانوں کے عہد سے کہیں پناہ مل گئی ہو اور خدا کا غضب ان پر چھا گیا اور محتاجی اور بدحالی میں گرفتار ہو گئے۔"

(نیز ۵/۸۰؛ ۲/۶۱؛ ۷/۱۵۲)۔

انکارِ قرآن سے غضب خداوندی

نزولِ قرآن کے بعد یہ غضب انکارِ قرآن کی وجہ سے نازل ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ راستہ جس پر چل کر انسان منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے، صرف قرآن کے اتباع سے مل سکتا ہے۔ اس کے سوا خدا کی راہ نمائی اور کہیں نہیں۔ سو جو لوگ اس راہ نمائی کو چھوڑ کر، دوسری راہیں اختیار کریں گے، وہ یقیناً تباہی اور بربادی کی طرف جائیں گے۔ اس کا نام غضبِ خداوندی ہے۔ انہی لوگوں کے متعلق کہا ہے کہ

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ط وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ (۲/۹۰)۔

"جس چیز کے عوض انھوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا ہے، وہ کیا ہی بُری ہے، یعنی یہ کہ وہ اللہ کی بھیجی ہوئی راہ نمائی کا انکار کرتے ہیں. محض اس ضد کی بنا پر کہ اللہ نے اپنے بندوں میں سے جس پر اُس نے چاہا اپنا فضل کیوں کر دیا ہے (ان کی نسل و جماعت میں نبوت کیوں نہیں آئی)۔ پس یہ لوگ غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے اور (ایسے) انکار کرنے والوں کے لئے ذلّت آمیز عذاب ہے۔"

اس لئے کہ قرآن سے انکار کرنا درحقیقت خدا سے اس بات پر جھگڑنا ہے کہ اس نے صرف اُسی راستے کو صراطِ مستقیم کیوں قرار دیا ہے جو قرآن کے اندر محفوظ ہے. اب ظاہر ہے کہ ان لوگوں کی اس قسم کی روش کا نتیجہ وہی ہوگا جو صداقت اور حقیقت کی مخالفت کرنے والوں کا ہوتا ہے. انہی کے متعلق کہا ہے کہ

وَ الَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ عَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۝ (۴۲/۱۶)

"اور جو لوگ اللہ کے بارے میں جھگڑے نکالتے ہیں بعد اس کے کہ اس کو (مومنین نے) تسلیم کر لیا ہے، ان کی حجّت (دلیل) ان کے رب کے نزدیک باطل ہے اور ان پر غضب (واقع ہونے والا ہے) اور ان کے لئے سخت عذاب ہے۔"

مغضوب علیہم نہی عن المنکر کے فریضہ سے غافل ہو جاتے ہیں

غضبِ الٰہی کی مستوجب قوم کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں کہ وہ برائیوں میں مبتلا ہیں لیکن کوئی کسی کو اس سے منع نہیں کرتا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک بہت بڑا فریضہ ہے، لیکن جب کسی قوم میں عیوب اس قدر عام ہو جاتے ہیں کہ سوسائٹی ان عیوب کو عیوب ہی نہیں سمجھتی، کوئی کسی کو روکتا ہی نہیں یا اخلاقی جرأت اتنی کمزور ہو جاتی ہے کہ کسی کو روکنے کی ہمت ہی نہیں پڑتی یا منافقت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ انسان پاپولر (ہر دلعزیز) ہونے کے لئے ہر ایک کی ہاں میں ہاں ملاتا چلا جاتا ہے، تو اس وقت اس قوم کو خدا کا غضب گھیر لیتا ہے. بنی اسرائیل پر جب خدا کا غضب وارد ہوا تو ان کی یہی حالت ہو چکی تھی. فرمایا.

لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ (۵/۷۹)

"وہ ایک دوسرے کو بُری باتوں سے روکا نہیں کرتے تھے. یقیناً وہ جو کچھ کرتے تھے بہت بُرا تھا۔"

باہمی عداوت اتنا ہی نہیں بلکہ اس قوم میں باہمی عداوت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ باہمی مخالفتوں میں جنگ و قتال پر اُتر آتے ہیں۔ یہی کچھ بنی اسرائیل نے کیا تھا اور اسی کی طرف امتِ مسلمہ کی توجہ منعطف کرائی گئی کہ یاد رکھو۔

وَ مَنۡ یَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِیۡهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیۡهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِیۡمًا ○ (۴/۹۳)۔

"جو شخص کسی مومن کو ارادۃً قتل کر ڈالے تو اس کی سزا جہنم ہوگی جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔ اور اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہوگی اور اس کے لئے خدا نے بڑا سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

میدانِ جنگ سے بھاگ جانا صرف باہمدگر متحد اور متفق ہونا ہی کافی نہیں بلکہ دشمن کے مقابلہ میں ثابت قدم اور مستقل مزاج رہنا بھی نہایت ضروری ہے۔ جو قوم میدانِ جنگ میں حوصلہ ہار کر بھاگ اٹھتی ہے اُسے غضبِ خداوندی چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے۔ اسی بنا پر جماعتِ مومنین سے کہا گیا ہے کہ

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا لَقِیۡتُمُ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا زَحۡفًا فَلَا تُوَلُّوۡهُمُ الۡاَدۡبَارَ ○ وَ مَنۡ یُّوَلِّهِمۡ یَوۡمَئِذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوۡ مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَةٍ فَقَدۡ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاۡوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ ○ (۸/۱۵-۱۶)۔

"اے ایمان والو جب تم کفار سے مدِ مقابل ہو جاؤ تو ان سے پیٹھ نہ پھیرنا اور جو شخص ان سے پیٹھ پھیر گیا سوائے اس کے جو لڑائی کے لئے پینترا بدلے یا اپنی جماعت کی طرف پناہ لینے آئے تو وہ اللہ کے غضب کا مستحق ہو جائے گا اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا اور وہ بہت بُری جگہ ہے رہنے کی!"

اس لئے کہ ایسے وقت میں ان کی بزدلی کی وجہ سے قوم کی قوم کا غیروں کی غلامی کی لعنت میں گرفتار ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اور محکومیت اور غلامی خدا کا بہت بڑا غضب ہے۔ چنانچہ جب مومنین کو فتح مکہ کی بشارت دی گئی تو مکہ کے وہ منافق اور مشرک جو محکوم بننے والے تھے ان کے متعلق کہا کہ

غلامی خدا کا غضب ہے

اُن پر اللہ کا غضب نازل ہونے والا ہے یعنی ان کے اعمال کی وجہ سے ان پر ذلت و خواری مسلط ہونے والی ہے۔ (۶/۴۸)۔

مغضوب علیہ کی دوستی

خود غضبِ الٰہی میں گرفتار ہونا تو ایک طرف، مغضوب علیہ کی دوستی بھی خطرناک ہے۔ اس لئے کہ جس طرح کوڑھی کے قریب جانے سے اس کے جراثیم سے متأثر ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، اسی طرح ان لوگوں کی دوستی سے جن پر خدا کا غضب نازل ہو چکا ہو، انسان کا قلب و دماغ ان کے متعدی امراض قبول کر لینے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور دلوں کے وہ پاکیزہ و طیّب کاشانے جو خدا کی رحمتوں کے مہبط بننے کے لائق تھے، بوسیدہ اور خبیث ہڈیوں کے قبرستان بن جاتے ہیں جن پر گدھ منڈلائیں اور بوم چیخیں۔ فرمایا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ (۶۰/۱۳)

"اے ایمان والو! ان لوگوں سے دوستی نہ رکھو جن پر اللہ کا غضب ہو چکا ہو۔" (نیز ۵۸/۱۴)

ارتداد

یہ تو تھا مغضوب علیہم اور کفار کی دوستی کے متعلق۔ لیکن جو ایک مرتبہ صحیح راستے پر چلنے کے بعد، اسے چھوڑ دے اور غلط راہیں اختیار کر لے، اس کا انجام بالکل واضح ہے۔ ان کے متعلق سورۂ نحل میں ہے:

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِیْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَىٕنٌّۢ بِالْاِیْمَانِ وَ لٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَیْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ○ (۱۶/۱۰۶)

"اور جو شخص ایمان لانے کے بعد اللہ سے منکر ہوا اور اس کا دل اس انکار پر رضامند ہو گیا تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔ مگر ہاں جو کوئی کفر کے کسی کام پر مجبور کیا جائے اور اس کا دل اندر سے ایمان پر مطمئن ہو (تو ایسے لوگوں سے مؤاخذہ نہیں)"۔

عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ ایمان کے بعد کفر وہی اختیار کرتا ہے یعنی مرتد وہی ہوتا ہے جو علی الاعلان اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لے۔ بے شک یہ ارتداد ہے۔ لیکن ارتداد صرف اسی کا نام نہیں، بلکہ قرآنِ کریم ایسی شکلیں

بھی بتاتا ہے جہاں ایک شخص مسلمان کہلاتے ہوئے بھی مشرک ہو جاتا ہے۔ اس کی تفصیل آپ کو ایمان و شرک کے عنوان میں ملے گی۔ اس جگہ صرف اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ ہم اس خوش فہمی میں نہ رہیں کہ چونکہ ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اس لئے ہم پر خدا کا غضب وارد نہیں ہو سکتا خواہ ہم کچھ ہی کیوں نہ کریں کیونکہ غضب کے مورد وہی ہوتے ہیں جو اس مذہب کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لیتے ہیں۔ یاد رکھئے! مومن وہی ہوتا ہے جو اپنی پوری زندگی قوانینِ خداوندی کے عین مطابق بسر کرے۔ اس قسم کی زندگی کا نتیجہ ایسا واضح اور مبین ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں اور اُن میں جو دوسری روش اختیار کرتے ہیں، تمیز کرنا کچھ بھی مشکل نہیں ہوتا۔ کون نہیں جانتا کہ زندگی کی خوشگواریاں کیا ہوتی ہیں اور بدحالیاں کیا؟

مومن اور مغضوب علیہ کی زندگی یکساں نہیں ہو سکتی

اسی لئے کہا کہ ان دونوں کی زندگی کبھی ایک جیسی نہیں ہو سکتی۔

اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ (۳/۱۶۱)

"کیا وہ جو قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگی کی زندگی بسر کرتا ہو' اس کی طرح ہو سکتا ہے جس پر اللہ کا غضب آ چکا ہو اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہو جو بہت بُری جگہ ہے"؟

جب دونوں ایک جیسے نہیں ہو سکتے تو اس بات کے جانچنے میں بھی مشکل نہیں رہتی کہ کون صحیح معنوں میں مومن ہے اور کس پر خدا کا غضب ہے۔ کون مُنعم علیہ ہے اور کون مغضوب علیہ۔ کون صراطِ مستقیم پر ہے اور کون راہ گم کردہ۔ مومن کی زندگی امتیازی زندگی ہوتی ہے۔

ہم ہر روز نماز کی ہر رکعت میں دعائیں مانگتے ہیں کہ اے اللہ ہم کہیں ان لوگوں کی روشِ زندگی پر گامزن نہ ہو جائیں جو تیرے غضب و عتاب کے مستوجب قرار پائے۔ لیکن کبھی اس پر غور نہیں کرتے کہ کیا ہماری زندگی ان لوگوں کی سی ہے جو اللہ کے انعام و افضال سے سرفراز کئے گئے یا ان کی سی جو اس کے غضب میں گرفتار ہوئے۔ قرآن کریم نے دونوں قسم کی زندگیوں کے امتیازی خط و خال اس صراحت سے بیان کر دیئے ہیں کہ دونوں میں تمیز کرنا کچھ مشکل نہیں۔ لہٰذا اس بات کا متعین کرنا بھی مشکل نہیں کہ ہماری زندگی مُنعم علیہ قوم کی زندگی ہے یا مغضوب علیہ کی۔

زندگی بسر کرنا مغضوب علیہ قوم جیسی اور آرزو رکھنا مُنعم علیہ قوم کی سرفرازیوں اور خوشگواریوں کی اگر

خود فریبی نہیں تو اور کیا ہے؟ ایسی ہی دعائیں ہیں جو دعا کرنے والے کے مُنہ پر لوٹا کر ماردی جاتی ہیں۔

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ جس قوم کے افراد کی ذات کی نشوونما ہوچکی ہوگی یعنی اس میں صفاتِ خداوندی کی نمود ہو رہی ہوگی:

(۱) اس قوم کی زندگی ان جیسی کبھی نہیں ہوگی جن پر "خدا کا غضب" وارد ہوچکا ہو۔ اور

(۲) وہ قوم اتنی قوتوں کی مالک ہوگی کہ غلط روش پر چلنے والی قوموں کے اعمال کے تباہ کن نتائج مشہود طور پر ان کے سامنے لاسکے یعنی انھیں ان کے جرائم کی سزا دے سکے اور اس طرح دنیا میں نظامِ عدل وانصاف عملاً قائم کرکے دکھادے۔ اسی کا نام حکومتِ خداوندی کا قیام ہے اور یہی نظام امنِ عامّہ کا کفیل ہے۔

۱۳

لعنت

مَفہُوم سابقہ عنوان میں، ہم نے انعام کے مقابلہ میں غضبِ الٰہی کا ذکر کیا ہے۔ یہ باب مکمل نہیں ہوسکتا جب تک رحمت کے مقابلہ میں لعنت کا بھی ذکر نہ کیا جائے۔ لفظ لعنت کے غلط مفہوم نے ہمارے ہاں ایک بہت بڑی غلط فہمی پیدا کر رکھی ہے۔ غیر مسلم حضرات کو شکایت ہے کہ (نعوذ باللہ) قرآنِ کریم گالیوں سے بھرا پڑا ہے۔" مسلمانوں کا خدا کفار پر لعنتوں کی بوچھاڑ کرتا ہے۔" یہ غلط فہمی اس بنا پر ہے کہ ہم لعنت کے معنی وہی لیتے ہیں جن معنوں میں یہ لفظ ہمارے ہاں مستعمل ہے۔ ورنہ اگر اس لفظ کا صحیح مفہوم سامنے ہو تو یہ بات کسی کے لئے وجہ شکایت نہیں ہوسکتی (اور غیر مسلموں ہی پر کیا موقوف ہے بعض مسلمان ستم ظریف بھی اپنی بدزبانی کے جواز میں اسی دلیل کو پیش کر دیتے ہیں)۔

لعنت کے معنی ہیں دُور کرنا، دُور رکھنا۔ مطلب اس کا بالکل واضح ہے۔ جس فرد کی ذات کی نشوونما ہو جاتی ہے اور جو قوم قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے، وہ زندگی کی خوشگواریوں (انعاماتِ خداوندی) سے بہرہ یاب ہو جاتی ہے۔ جو ان قوانین کے خلاف زندگی بسر کرتی ہے، وہ ان خوشگواریوں سے دُور رہ جاتی ہے، ان سے محروم ہو جاتی ہے۔ اسے خدا کی لعنت کہتے ہیں، یعنی اُس کے افضال و اکرام سے محرومی، اُس کی رحمت و نعمت سے دُوری۔ اور چونکہ خدا کی رحمت سے محرومی بہت بڑی بدبختی ہے، اس لئے اس اعتبار سے لعنت ایک بددُعا ہے۔ لہٰذا جب لعنت کا لفظ خدا کی طرف منسوب ہوگا تو اس کے معنی اس کے

انعامات سے محرومی ہوگا اور جب غیر خدا کی طرف سے بولا جائے گا تو اس کے معنی ایک ایسی بد دُعا کے ہوں گے جس میں حرماں نصیبی و شوریدہ بختی کا مفہوم مضمر ہوگا۔ چنانچہ قرآن میں جہاں لعنت کے مترادف اور الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان میں بھی دوری اور محرومی کا مفہوم موجود ہے۔ مثلاً قوم مدین کے متعلق فرمایا:

اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ع (۱۱/۹۵)

"یقیناً اہلِ مدین کے لئے ہلاکت تھی، جیسی قوم ثمود ہلاک ہوئی تھی"۔

نعمائے خداوندی سے محرومی

یہاں ہلاکت کے لئے بُعد کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی دُوری اور محرومی کے ہیں، یعنی جو رحمتِ خداوندی سے دور ہو گیا، اس کی ہلاکت یقینی ہے۔

شیطان کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے۔

وَ اِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطَانًا مَّرِيْدًا ۙ لَّعَنَهُ اللّٰهُ م (۴/۱۱۷-۱۱۸)

"یہ مشرک شیطان کو پکارتے ہیں جو تمام بھلائیوں سے محروم ہے۔ اس پر اللہ نے لعنت کر رکھی ہے"۔

مَرَدَ کے معنی عاری ہونا، محروم ہونا ہیں۔ اس لئے شَيْطَانًا مَّرِيْدًا کے معنی ہیں مَنْ مَرَدَ عَنِ الْمَحَاسِنِ وَ الطَّاعَةِ (مفردات) وہ جو بھلائیوں سے اور اطاعت سے محروم ہو، جیسے بنجر ریت کو رَمْلَةٌ مَرْدَاءُ کہتے ہیں کیونکہ اس میں سبزی کا کہیں نشان نہیں ہوتا اور اسی لئے اس کے معنی بے برگ و بار بھی ہیں۔ شَجَرٌ اَمْرَدُ کے معنی ہیں وہ درخت جس پر کوئی پتہ نہ ہو۔ چنانچہ قرآن میں شجرۃ الزقوم کو شجرِ ملعون کہا گیا ہے (۱۷/۶۰) اور شیطانِ ملعون کو شیطانِ رجیم بھی کہا گیا ہے (۱۵/۳۴-۳۵)؛ (۳۸/۷۷)۔ رَجِيْم کے معنی بھی دُور افتادہ اور راندۂ درگاہ ہیں۔ رجیم اس ہتھیار کو کہتے ہیں جسے دُور سے پھینک کر مارا جائے۔ چنانچہ مرجام گوپیے کو کہتے ہیں جس سے دُور سے پتھر پھینکا جاتا ہے۔ اسی طرح لفظ سُحْقً بھی لعنت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ (۶۷/۱۱) لفظ سحق کے معنی بھی دور ہیں۔ مکانِ سحیق قرآن میں آیا ہے جس کے معنی دُور دراز مقام کے ہیں۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ لعنت اور اس کے مرادف الفاظ کے معنی دُور رکھے جانے

رحمتِ خداوندی سے دُوری

کے ہیں، یعنی محروم کئے جانے کے اور اس کا مطلب واضح ہے، یعنی جن پر خدا کی لعنت ہوگی وہ اس کی نوازشات سے

دور، لہٰذا محروم رکھے جائیں گے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اس لفظ کے استعمال میں نفرت یا دشمنی یا گالی کا کونسا شائبہ ہے؟ مشکل یہ ہوتی ہے کہ اکثر الفاظ اصل زبان میں کسی اور معنی میں استعمال ہوتے ہیں اور دوسری زبان میں ان سے کچھ اور مفہوم لیا جاتا ہے۔ قرآن کے الفاظ کے صحیح معانی متعین کرنے کے لئے عربی مبین اور خود قرآن کو دیکھنا چاہیئے نہ کہ اپنی زبان کے الفاظ اور ان کے استعمال کو۔ (میں نے اپنی لغات القرآن میں قرآن کے تمام مفردات کے معانی اسی طرح متعین کئے ہیں)۔

لعنت مکافاتِ عمل سے ہوتی ہے

جیسا کہ ہم غضب کے عنوان میں دیکھ آئے ہیں، خدا کی لعنت یونہی نہیں برس پڑتی، بلکہ یہ انسان کے اعمالِ سیئہ کا فطری نتیجہ ہوتی ہے، یعنی یہ بھی مکافاتِ عمل ہی کی ایک شق ہے۔ اہلِ کتاب جب مسلمانوں پر نکتہ چینی کرتے تھے کہ یہ کس چیز پر ایمان لے آئے ہیں تو انہیں جواب میں کہا گیا کہ:

قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيْهِ ..... (۵/۶۰)۔

"کہو کہ کیا میں تمہیں ایسی چیز بتاؤں جو اللہ کی طرف سے سزا ملنے میں اس سے بھی زیادہ بُری ہو، یعنی وہ شخص جس پر اللہ کی لعنت اور اس کا غضب نازل ہو جائے"۔

گویا خدا کی لعنت اعمال کی سزا ہی کا دوسرا نام ہے۔ میدانِ حشر کے فیصلوں کے بعد اہلِ جنت اور اہلِ جہنم میں ایک مکالمہ کا ذکر سورۂ اعراف میں ہے۔ اس میں ایک پکارنے والا اہلِ دوزخ کو مخاطب کرکے پکارے گا کہ

اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ۝ (۴۴-۴۵/۷)۔

"اللہ کی لعنت ہے ظالمین پر یعنی وہ لوگ جو دوسروں کو اللہ کے راستے سے بہکاتے تھے اور خود بھی اس میں کجروی پیدا کرتے تھے اور وہ آخرت سے انکار کرتے تھے"۔

قریب قریب یہی الفاظ (۱۸-۱۱/۱۹) میں آئے ہیں۔

گویا جہنم کی لعنت کجروی اختیار کرنے اور دوسروں کو سیدھے راستے سے روکنے کی پاداش میں ملے گی۔

کن قوموں پر لعنت برستی ہے؟

قرآنِ کریم نے اُمم سابقہ کے حالات بیان کر کے یہ حقیقت سامنے رکھ دی ہے کہ ان اقوام پر کن جرائم کے بدلے میں دنیا اور آخرت کی لعنت پڑی اور پھر یہ چیز بھی واضح کر دی کہ دُنیاوی لعنت کسے کہتے ہیں اور آخرت کی لعنت کیا ہوگی۔ قومِ عاد جب خدا کے عذاب سے ہلاک ہو چکی تو ان کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

وَ تِلْكَ عَادٌ ۟ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَ عَصَوْا رُسُلَهٗ وَ اتَّبَعُوْۤا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۝ وَ اُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ۝ (۱۱/۶۰-۵۹)

"یہ تھی (قومِ عاد) جنہوں نے قوانینِ خداوندی کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ایسے لوگوں کے کہنے پر چلتے رہے جو سرکش اور (خدا کے حکم سے) باغی تھے۔ سو اس دنیا میں بھی لعنت ان کے پیچھے رہی اور قیامت کے دن بھی۔ خوب سُن لو کہ قومِ عاد نے اپنے رب کے قوانین سے انکار کیا اور خبردار! کہ قومِ ھود یعنی عاد کے لئے بُعد (لعنت) ہوئی۔ (وہ ہلاک ہوگئی، رحمت سے دُور ہوگئی)۔

قومِ مدین پر مثلِ قومِ ثمود لعنت (بعد) کا ذکر (۱۱/۹۵) میں آچکا ہے۔ ثمود کے متعلق (۱۱/۶۸) میں بھی یہی الفاظ آئے ہیں۔ قومِ فرعون پر بھی دنیا و آخرت میں لعنت ہوئی۔ (۱۱/۹۹)؛ (۲۸/۴۲)۔

بنی اسرائیل کے متعلق ہے کہ

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَ جَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ (۵/۱۳)۔

"ہم نے ان کے نقضِ عہد کی بنا پر (عہد توڑنے کی سزا میں) ان پر لعنت کی اور ان کے دلوں کو سخت بنا دیا۔

اس کے بعد ان کے جرائم کی فہرست دی گئی ہے (۵/۱۳) اور یہ بنی اسرائیل کے ساتھ ہی مخصوص نہ تھا، جو قوم بھی عہد شکنی کرے گی، اس کی یہی سزا ہوگی۔ اللہ کے عہد سے مراد یہ ہے کہ جب آپ خدا پر ایمان لے آئے تو آپ نے اس کے ساتھ یہ معاہدہ کر لیا کہ آپ اپنی زندگی کو اس کے قوانین کے تابع رکھیں گے۔ اس کے بعد اگر آپ نے اپنی زندگی کو اس کی اطاعت سے آزاد کر دیا، تو یہ خدا کے معاہدہ کی عہد شکنی ہے اور

عملاً عہد شکنی، خواہ زبان سے آپ لاکھ اقرار کرتے رہیں۔ بنی اسرائیل نے بھی یہ کبھی اعلان نہیں کیا تھا کہ ہم خدا کی ہستی سے انکار کرتے ہیں۔

وَ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَ يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۙ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ۝ (۱۳/۲۵)۔

"اور جو لوگ اللہ کے معاہدے کو اس کی توثیق کے بعد توڑ ڈالتے ہیں اور جن چیزوں کے ملانے کا حکم دیا تھا ان کو قطع کر دیتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے پھرتے ہیں، یہ لوگ ہیں جن پر لعنت ہے اور ان کے لئے بُرا ٹھکانا ہے۔"

بنی اسرائیل کے خلاف ایک اور بھی سنگین الزام عائد کیا گیا جس کی وجہ سے وہ موردِ لعنت ہوئے، یعنی كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ (۵/۷۹)۔ اور ایک دوسرے کو ان بُرائیوں سے نہیں روکتے تھے جن کے وہ مرتکب ہوتے تھے۔ یقیناً جو وہ کرتے تھے بہت بُرا تھا۔

باہمی بغض و عداوت خدا کی لعنت ہے

اب یہ دیکھئے کہ جس لعنت کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، اس کی تفصیل کیا ہے فرمایا،۔

وَ اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ (۵/۶۴)۔

"اور ہم نے ان میں ہمیشہ کے لئے باہمی بغض اور عداوت ڈال دی۔"

یہی نہیں کہ یہود محض سرکشی اور بغاوت اختیار کئے ہوئے تھے، انہوں نے دینِ الٰہی کو بازیچۂ اطفال بنا رکھا تھا۔ اس کی قدر و قیمت ان کی نگاہ میں کچھ نہ تھی۔ وہ اس سے تمسخر کرتے تھے، استہزا کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ جب کسی قوم کا معیارِ ایمان و شرافت اس درجہ پست ہو جائے تو وہ بلند اخلاقی جذبات کو اپنے سینے میں کس طرح پرورش دے سکتی ہے؟ (۴/۴۶)۔

یہ ظاہر ہے کہ زندگی کی خوشگواریاں صحیح نظامِ حیات پر عمل پیرا ہونے سے مل سکتی ہیں اور صحیح نظامِ حیات، قرآنِ کریم کے سوا کہیں نہیں مل سکتا۔ اس لئے جو قوم اس نظام کی صداقت سے انکار کرتی ہے یا محض زبانی اقرار کرتی ہے لیکن عملاً اسے اختیار نہیں کرتی، وہ ان خوشگواریوں سے محروم

رہ جاتی ہے۔ قرآنِ کریم کے مختلف مقامات میں اس حقیقت کو سامنے لایا گیا ہے۔ (۴/۴۷؛ ۸۸-۸۹؛ ۲/۸۸؛ ۳۳/۶۴ — ۶۵)۔

یہی نہیں کہ جو قوم اس نظام سے قطعاً اعراض برتتے وہی اس کے خوشگوار نتائج سے محروم رہ جاتی ہے، بلکہ وہ قوم بھی جو اسے ایک دفعہ اختیار کرنے کے بعد اسے چھوڑ دے، اس کا بھی یہی حشر ہوتا ہے (جیساکہ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے)۔ چنانچہ سورۂ آلِ عمران میں ہے:۔

كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَ شَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۙ (۸۵ — ۸۶/۳)۔

"اللہ ایسی قوم کو کیسے راہِ راست دکھا دے جو ایمان لے آنے کے بعد کفر اختیار کرلے، بعد اس کے کہ انہوں نے خود مشاہدہ کرلیا تھا کہ فی الواقع رسول برحق ہے اور ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں بھی آچکی ہیں۔ اللہ ان لوگوں کو جو خود اپنے اوپر زیادتی کریں، راہِ راست پر نہیں لاتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن (کی اس روش کا نتیجہ یہ ہے کہ ان) پر خدا کی لعنت ہے اور ملائکہ اور تمام انسانوں کی!

خدا کی لعنت سے مراد ہے ان سعادتوں اور سرفرازیوں سے محرومی جو نظامِ خداوندی کے تابع زندگی بسر کرنے سے حاصل ہوتی تھیں۔ اس کے بعد، دوسری نہج زندگی یہ ہے کہ انسان تنہا عقل و بصیرت سے کام لے کر فطرت کی قوتوں کو مسخر کرے اور اس طرح کچھ وقت کے لئے زندگی کی آسائشوں سے بہرہ یاب ہو جائے، لیکن "غلط مذہب" پر چلنے والی قوم دنیا کو قابلِ نفرت قرار دے دیتی ہے اور اس طرح فطرت کی قوتوں سے بھی محروم رہ جاتی ہے۔ یہ ہے ملائکہ کی لعنت۔ اس کے بعد، تیسری چیز یہ ہے کہ دیگر اقوامِ عالم میں برتری نہیں ہو تو کم از کم ہمسری ہی حاصل ہو تاکہ جو مفاد نوعِ انسانی کو مشترکہ طور پر میسر ہیں، یہ انہی سے بہرہ یاب ہو سکے۔ لیکن اس قسم کی ذلیل و خوار قوم کی کوئی عزت نہیں کرتا اور اس طرح وہ ان مفادات سے بھی محروم رہ جاتی ہے جو عام انسانی حیثیت سے اسے حاصل ہوتے تھے۔ یہ "انسانوں کی لعنت ہے"۔

یہ حشر ہوتا ہے ایسی قوم کا جو ایک بار دین کی صحیح روش پر چلنے کے بعد، پھر غلط راستہ اختیار

کر لے۔ آپ شاید تاریخ کے اوراق پر ایسی قوم کا نشان ڈھونڈھتے ہوں، لیکن آپ کو اس کے لئے اس قسم کی تجسس اور کاوش کی ضرورت نہیں۔ ذرا آئینہ سامنے رکھ کر اپنی صورت دیکھئے۔ صاف نظر آجائے گا کہ یہ قوم کونسی ہے جس کا ذکر قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

اس کے بعد یقیناً یہ سوال سامنے آئے گا کہ کیا ہماری یہ محرومی اور شقاوت ہمیشہ کے لئے رہیگی یا اس سے نجات کی بھی کوئی صورت ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ اگر تم اب بھی اس غلط روش کو چھوڑ کر، قرآن کا صحیح راستہ اختیار کر لو، تو زندگی کی خوشگواریوں سے پھر اسی طرح متمتع ہو سکتے ہو۔

اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ وَ اَصۡلَحُوۡا ۟ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۳/۸۸﴾

"مگر وہ لوگ جو اس روش کے بعد پھر سے نظامِ خداوندی کی طرف لوٹ آئیں اور اپنی اصلاح کریں، تو خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے اُنہیں سامانِ حفاظت و پرورش مل سکتا ہے۔"

یعنی جب تم اپنی حالت میں تبدیلی کر لو گے تو خدا کی دوسری صفت کا ظہور ہو جائے گا۔ (آپ نے دیکھ لیا کہ ذاتِ خداوندی میں، بظاہر، متضاد صفات کے موجود ہونے کے معنی کیا ہیں؟)

کتمانِ حقیقت سے لعنت

صداقت سے انکار کرنے کا نتیجہ ہی لعنت نہیں، جو کتمانِ حقیقت کرے، صداقت کو چھپائے، وہ بھی سعادتوں سے محروم رہ جاتا ہے۔ (۲/۱۵۹)۔

قرآن کی رُو سے ایمان کے معنی یہ ہیں کہ انسان، قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین کر لینے کے بعد، اس نظام کے تابع زندگی بسر کرے جو ان قوانین کے نفاذ کا ذمہ دار ہو۔ (اسے نظامِ خداوندی کہتے ہیں جسے سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے متشکل فرمایا تھا)۔ اس نظام کی اطاعت "خدا اور رسول کی اطاعت" ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس معاشرہ کے افراد کی طرف سے کوئی ایسی حرکت جو اس نظام میں خرابی (یا مضرت) کا باعث ہو، بہت بڑا جرم ہوگا۔ قرآن نے اسے "اللہ اور رسول" کی ایذا رسانی سے تعبیر کیا ہے اور اس کا نتیجہ اُن سعادتوں سے محرومی بتایا ہے جو اس نظام کے ساتھ وابستگی سے حاصل ہوئی تھیں۔ فرمایا:

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُؤۡذُوۡنَ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ لَعَنَہُمُ اللّٰہُ فِی الدُّنۡیَا

وَ الْاٰخِرَةِ وَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا ٥ وَ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ٥ (۵۷ — ۳۳/۵۸)۔

"بے شک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کو ایذا دیتے ہیں، ان پر اللہ دنیا و آخرت میں لعنت کرتا ہے اور ان کے لئے ذلت آمیز عذاب تیار کر رکھا ہے اور جو لوگ مومن مردوں اور عورتوں کو ایذا دیتے ہیں، بلا ان کی کسی خطا کے، وہ یقیناً ایک (سخت) بہتان تراشی کے مجرم ہیں اور ایک کھلا ہوا گناہ کر رہے ہیں۔"

قتلِ مومن کے بدلے لعنت | جب مومنین کی ایذا رسانی لعنت کی مستوجب ہے تو قتلِ مومن جیسا سنگین جرم تو کبھی بغیر پاداش کے رہ نہیں سکتا۔

وَ مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ٥ (۴/۹۳)۔

"اور جو شخص کسی مومن کو عمداً قتل کر دے، تو اس کی سزا جہنم ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہیگا اور اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہو گی اور اللہ نے اس کے لئے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔

فساد، لعنت کا موجب | اس لئے کہ یہ تمام باتیں ایسی ہیں جن سے نظامِ ملت میں ابتری پھیل جاتی ہے، فساد برپا ہو جاتا ہے اور فساد وہ خرابی ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن نازل ہوا ہے۔ کفار کے خلاف یہی الزام عائد کیا گیا ہے۔ (۲۳ — ۴۷/۲۲)۔

غلامی لعنت ہے | سابقہ عنوانات میں دیکھا جا چکا ہے کہ حکومت و سطوت' انعاماتِ خداوندی میں سے ہیں۔ لہٰذا محکومی اور محتاجی کی زندگی' خدا کی لعنت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے "مغلوب" اور "ملعون" الفاظ کو مرادف المعنی قرار دیا ہے۔ (۶۱ — ۳۳/۶۲)۔ مثلاً جب مسلمانوں کو فتحِ مکہ کی خوشخبری سنائی گئی تو جن کفار نے مغلوب ہونا تھا ان کے متعلق کہا:

وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ لَعَنَهُمْ ..... (۴۸/۶)۔

"ان پر اللہ کا غضب ہو گا اور اس کی لعنت۔"

اسی دنیا میں محرومی اور بدنصیبی کی زندگی نہیں، بلکہ آخرت میں بھی جہنم کی زندگی جو بجائے خویش لعنت کی زندگی ہے۔ (۹/۶۸)؛ (۴۰/۵۲)۔

اندھی تقلید لعنت کا موجب ہے

ان جرائم کو بیان کرنے کے بعد (جن کی پاداش میں سعادتوں سے محرومی ہوجاتی ہے) قرآن نے اُس اساسی اور بنیادی جُرم کی طرف توجہ دلائی ہے جو ان تمام جرائم کی اصل اور جڑ بنیاد ہے اور وہ جرم ہے، اپنی عقل و بصیرت سے کام لینے کے بجائے، آنکھیں بند کرکے، دوسروں کے پیچھے پیچھے چلتے رہنے کی روش۔ چنانچہ قرآن نے جہنم میں داخل ہونے والی اقوام کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ۭ حَتّٰٓي اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ.....
فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۝ (۷/۳۸—۳۹)

"جب کوئی جماعت جہنم میں داخل ہوگی تو اپنے جیسی دوسری جماعت پر لعنت کرے گی یہاں تک کہ جب یہ لوگ سب وہاں جمع ہوجائیں گے تو متاخرین متقدمین کے متعلق کہیں گے کہ اے اللہ ہمیں ان لوگوں نے گمراہ کیا تھا، سو انھیں ہم سے دوگنا عذاب دیجئے۔ اللہ کہے گا کہ ہر ایک کے لئے دُگنا عذاب ہے۔ لیکن تم کو خبر نہیں اور متقدمین متاخرین سے کہیں گے کہ تمہیں بھی ہم پر کوئی فضیلت نہیں (تم نے کونسا اپنی عقل سے کام لیا تھا) سو اپنے کردار کے بدلے میں عذاب کا مزہ چکھو"!

اسی چیز کو حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے جواب میں فرمایا تھا۔

وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۡ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝ڎ (۲۹/۲۵)۔

"(اے قوم) جو کچھ تم نے خدا کو چھوڑ کر بتوں کو تجویز کر رکھا ہے، یہ تمہاری دنیاوی دوستی کی بنا پر ہے۔ قیامت کے دن تم ایک دوسرے سے انکار کرو گے اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجو گے

اور تمہارا ٹھکانہ دوزخ ہوگا اور تمہارا کوئی مددگار نہ ہوگا"!

یعنی یہ غلط روش فہم و تدبر کا نتیجہ نہیں، بلکہ تم نے صرف اس لئے اختیار کر رکھی ہے کہ تم ایک دوسرے کے دوست ہو اور جو ایک کرتا ہے' اندھا دھند دوسرا کرنے لگ جاتا ہے اور یہ اندھی تقلید شروع اس طرح سے ہوتی ہے کہ انسان اپنے ذہن میں بعض لوگوں کو بڑا سمجھ لیتا ہے' انہیں اپنا پیشوا تسلیم کر لیتا ہے. پھر جو کچھ اُن سے سُنتا ہے یا اُن کی طرف منسوب کر کے اسے دیا جاتا ہے، آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے ہو لیتا ہے۔ یہ روش انسانیت کے لئے باعثِ ذلت ہے اور حقیقت واضح ہونے پر انسان خود تسلیم کر لیتا ہے کہ کس قدر گمراہ کن روش ہے. قرآنِ کریم نے اسے جس شدت و تکرار سے بیان کیا ہے' اسے کسی دوسرے موقع پر بیان کیا جائے گا. یہاں صرف اس قدر دیکھئے کہ یہ روش کس طرح خدا کی لعنت کا مورد بنا دیتی ہے. دوزخیوں کی زندگی کا ایک اور باب قرآنِ کریم نے یوں پیش کیا ہے۔

وَ قَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا۝ رَبَّنَا اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَ الْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا۝ (۶۷-۶۸/۳۳)

"اور وہ کہیں گے کہ یا اللہ ہم نے اپنے سرداروں کا اپنے بڑوں کا اتباع کیا تھا. انہوں نے ہمیں سیدھے راستے سے بھٹکا دیا. اے ہمارے رب ان (بڑوں) کو دوہری سزا دیجئے اور ان پر بڑی سخت لعنت کیجئے"۔

قرآن میں تدبر نہ کرنے سے لعنت

لیکن آپ یہ سمجھ کر اپنے آپ کو مطمئن نہ کر لیجئے کہ یہ قصے اقوامِ سابقہ کے ہیں. ان سے ہمارا کچھ تعلق نہیں. قرآن نے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ جو لوگ قرآن میں تدبر و تفکر سے کام نہیں لیتے اور جس روش پر قوم چلی جا رہی ہے، اندھا دھند اُسی روش پر چلے جاتے ہیں، وہ ان سعادتوں سے محروم رہ جاتے ہیں جو سوچ سمجھ کر (قرآن پر) چلنے سے حاصل ہوئی تھیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَ اَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ۝ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا۝ (۲۳-۲۴/۴۷)۔

"یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کر دی. سو ان کو بہرہ بنا دیا اور ان کو آنکھوں سے اندھا کر دیا. کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے. کیا ان کے دلوں پر قفل پڑ چکے ہیں"؟

قرآن میں تدبر نہ کرنا، اس کی روشنی میں اپنی آنکھوں سے کام نہ لینا، خدا کی لعنت نہیں تو اور کیا ہے؟

کیا اب بھی یہ پوچھنے کی ضرورت ہے کہ ہم ذلیل کیوں ہیں؟

۱۴

قہّار

مَفہوم ہمارے ہاں چونکہ قہر بھی غصہ اور عتاب کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، اس لئے اس عنوان کو غضب و عتاب کے تسلسل میں لانا مناسب سمجھا گیا. قہر سے مفہوم غصہ اور عتاب نہیں، بلکہ غلبہ اور تسلط ہے. جب فرعون کے ارکانِ سلطنت نے شکایت کی کہ موسیٰؑ اور ان کی قوم کو اس طرح آزاد چھوڑ دینے سے وہ انقلاب برپا کر دیں گے، تو فرعون نے کہا گھبراؤ نہیں، میں ان کا بندوبست کئے لیتا ہوں.

سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَ نَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَ اِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُوْنَ ۝ (۷/۱۲۷).

"ہم ان کے ابنائے قوم کو ذلیل کر دیں گے اور جو لوگ جوہرِ مردانگی سے عاری ہوں گے انہیں معزز و محترم بنا دیں گے. ہم ان پر پورا پورا غلبہ و تسلط رکھتے ہیں (وہ ہماری طاقت سے دبے ہوئے بے بس ہیں!)."

اس سے ظاہر ہے کہ قہر کے معنی غلبہ و تسلط اور قوت و شدت کے ہیں. لیکن خدا کے قہر (اور جبر) کا صحیح صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے عربوں کے ہاں ان الفاظ کے استعمال کو سامنے لانا ضروری ہے. جب کوئی ہڈی جائے تو اس کے اوپر نیچے لکڑیاں رکھ کر اسے زور سے باندھ دیا جاتا ہے. اس سے کچھ دنوں کے بعد، وہ ہڈی جڑ جاتی ہے. اس طریقِ علاج کو جبر کہتے ہیں، یعنی اس قسم کی قوت اور شدت جس سے (جڑ جاتی ہے)

ہڈیاں توڑی نہ جائیں بلکہ) ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جوڑی جائیں۔

دوسری طرف لَحْمٌ مَقْهُوْرٌ کہتے ہیں اس گوشت کو جسے آگ پر رکھ کر گلایا جائے اور اس طرح کھانے کے قابل بنا دیا جائے یعنی حرارت سے اس کی سختی میں نرمی پیدا ہو جائے تاکہ اسے صحیح مصرف میں لایا جائے۔

ظاہر ہے کہ جبر اور قہر دونوں میں قوّت اور شدّت کا پہلو مضمر ہے لیکن عام انسان اس قوّت کو فساد کے لئے استعمال کریں گے، اس لئے ان کی طرف سے جبر اور قہر مذموم ہو گا۔ لیکن جب یہی قوّت (جبر اور قہر) خدا کی طرف سے (یا اس کے نظام کی طرف سے جو قوانینِ خداوندی کے نفاذ کا ذمہ دار ہو) استعمال ہو گی تو اس سے مقصد اصلاح ہو گا۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ اس جگہ قہر (اور جبر) سے مفہوم ہو گا سرکش قوّتوں کو قوانین کی گرفت میں رکھنا۔ اس سے هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ (۶/۱۸) کا مفہوم بآسانی سمجھ میں آ جائے گا۔ پوری آیت یوں ہے۔

وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ وَ هُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ○ (۶/۱۸-۱۷)

"یاد رکھو! انسان کو جو نقصان، قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی سے پہنچتا ہے، اس کے ازالہ کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ انسان اسی کے قوانین کی طرف رجوع کرے، یہی صورت نفع پہنچنے کی ہے۔ اس لئے کہ نفع اور نقصان کے پیمانے سب اس کے قوانین کی رُو سے متعین ہوتے ہیں جن پر اُسے پورا پورا کنٹرول ہے۔ اس کے قوانین کی زد سے کوئی شخص باہر نہیں جا سکتا۔ وہ ہر ایک کو محیط ہیں۔ لیکن اس کا یہ غلبہ، استبداد اور دھاندلی کا نہیں، وہ ہر بات سے باخبر ہے اور اس کا ہر فیصلہ حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔"

بات بالکل واضح ہے۔ کائنات کا سلسلہ اندھی قوّتوں کے تابع نہیں چل رہا۔ یہاں ہر عمل کا نتیجہ خدا کے قوانین کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔ اگر کسی پر مصیبت آتی ہے تو وہ بھی خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق اس کے اعمال کے نتیجہ میں آتی ہے اور اگر زندگی کی خوشگواریاں ملتی ہیں تو ان کا انداز بھی یہی ہے۔ خدا نے ان امور کے لئے اندازے (قوانین) مقرر کر رکھے ہیں اور صرف قوانین مقرر ہی نہیں کر رکھے بلکہ وہ ایسا صاحبِ قوّت و اقتدار ہے کہ اس کے قوانین اپنا نتیجہ مرتب کرتے چلے جاتے ہیں۔ کائنات کی کوئی شے ان کی گرفت سے باہر

نہیں. اگر یہاں کوئی قانون نہ ہو یا قوانین کی گرفت کمزور ہو، تو نظام کائنات درہم برہم ہو جائے۔ اسی طرح انسانوں کی دنیا میں بھی اُس کا قانون عمل پیرا ہے اور اس نے ایسی قوتیں مقرر کر رکھی ہیں جو انسانی اعمال کو نتیجہ خیز بناتی چلی جاتی ہیں.

هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَ يُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً (۶/۶۱)۔

"وہی اپنے بندوں پر غلبہ رکھنے والا ہے اور تم پر محافظ (قوتیں) بھیجتا ہے"

وعظِ یوسفی

لہٰذا قاہر و قہار کے معنی ہیں صاحبِ غلبہ و تسلّط، پورے پورے اختیارات کا مالک، سب پر بالادست، جس کے قانون کی گرفت سے کوئی باہر نہ ہو اور اس کے سوا کسی اور کا قانون نہ چلے. چنانچہ حضرت یوسفؑ نے اپنے قیدخانہ کے ساتھیوں سے یہی کہا تھا۔

ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ؕ (۱۲/۳۹)

"کیا الگ الگ آقاؤں کا ہونا بہتر ہے یا ایک ایسے خدا کا جو یگانہ اور سب پر غالب ہو"

ہر قسم کے اختیارات کا مالک

اس لئے کہ جب ہر قسم کا غلبہ و اختیار اسی ذات کے لئے ہے تو پھر مختلف اور الگ الگ "خدا" کیسے؟ سورۂ رعد میں ہے کہ "اے رسول! ان لوگوں سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کا پروردگار کون ہے؟ تو کہتے ہیں اللہ ہے اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں. پھر ان سے کہو کہ جب وہی پروردگار ہے تو پھر یہ کیا ہے کہ تم نے اس کے سوا دوسروں کو اپنا کارساز بنا رکھا ہے جو (دوسروں کو نفع نقصان پہنچانا تو ایک طرف) خود اپنی ذات کے لئے بھی نفع نقصان کا کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ ان سے کہو کہ (جب صورتِ حالات یہ ہے تو پھر خود ہی سوچو) کیا اندھا اور دیکھنے والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اندھیرا اور اُجالا برابر ہو جائے۔ یا کیا پھر یہ بات ہے کہ ان لوگوں کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں نے بھی اسی طرح کی مخلوقات پیدا کی ہے جس طرح اللہ نے پیدا کی ہے اور اس لئے یہ امر ان کے لئے مشتبہ ہو گیا ہے (کہ صرف اللہ ہی نہیں بلکہ دوسرے بھی خدا بن سکتے ہیں)۔ ان تصریحات کے بعد ہے۔

قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ (۱۳/۱۶)

"کہیئے کہ اللہ ہی ہے جو ہر شے کا پیدا کرنے والا ہے۔ وہ (اپنی تمام باتوں میں) یگانہ ہے سب پر غالب ہے"

سورۂ زمر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی امداد کے لئے اولاد کی ضرورت نہیں اس لئے کہ وہ (واحد القہار ۳۹/۴) یگانہ ہے اور ہر معاملہ پر غلبہ و تسلط رکھتا ہے۔ اسے کسی ساتھی اور حمایتی کی ضرورت نہیں۔ اس سے اگلی آیت میں ہے کہ اس نے زمین و آسمان کی پیدائش کے بعد نظامِ عالم کو ایک ٹھیک پیمانہ پر جاری کر دیا۔ لیل و نہار کی گردشیں، چاند اور سورج کی تقدیریں، سب اسی کے اختیار و قدرت سے ظہور پذیر ہوتی ہیں کہ وہ خدائے عزیز الغفار ($\frac{۳۹}{۵}$) غلبہ و قدرت والا، حفاظت بہم پہنچانے والا ہے۔ اسی ترتیب سے سورۂ ص میں بھی فرمایا کہ وہ واحد القہار اور عزیز الغفار (۳۸/۶۵-۶۶) ہے۔ کائنات میں انقلابات اسی کے قانون کے مطابق آتے ہیں۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝ (۱۴/۴۸)

"وہ دن کہ جب یہ زمین بدل کر ایک اور ہی زمین ہو جائے گی اور آسمان بھی بدل جائیں گے اور سب لوگ خدائے یگانہ و غالب کے حضور حاضر ہوں گے۔"

سورہ المومن میں ہے۔

يَوْمَ هُمْ بَارِزُوْنَ ۚ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ؕ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝ (۴۰/۱۶)۔

"جس دن تمام انسان (اس کے حضور) حاضر ہو جائیں گے۔ ان کے متعلق کوئی بات بھی اللہ سے چھپی ہوئی نہ ہوگی۔ اس دن سلطنت کس کی ہوگی؟ اس یگانہ اور غالب خدا کے سوا اور کس کی ہوگی؟"

یہ ہے قہار کا صحیح مفہوم۔ نہ وہ جو عام طور پر ہمارے ہاں سمجھا جاتا ہے جس میں ذہنِ انسانی فوراً جور و استبداد اور وحشت و بربریت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ ایک نشوونما یافتہ ذات میں جہاں ایک طرف، رافت و محبت کی صفات ہوتی ہیں، دوسری طرف، قوت اور صلابت کی صفات بھی ہوتی ہیں تاکہ ان سے فساد انگیز قوتوں کو سرکشی سے روکا جائے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؔ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت ۔۔۔ یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

دنیا میں نظامِ عدل اس قسم کی قوموں کے ہاتھوں قائم ہو سکتا ہے۔

۱۵

اَلْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ

جبّار کا مفہوم قہار کی طرح جبّار سے بھی ہمارے ہاں عام طور پر صحیح مفہوم نہیں لیا جاتا۔ اس سے بھی ذہن جبر و اکراہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور یہ اس لئے کہ ان الفاظ کے صحیح معانی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ جیسا کہ سابقہ عنوان میں بتایا جا چکا ہے' جبر کے معنی ہیں کسی بگڑی ہوئی بات کی اس انداز سے اصلاح کرنا جس میں قوت سے کام لیا جائے۔ مثلاً جب ہڈی ٹوٹ جائے، تو اسے دو لکڑیوں میں جکڑ کر بطریقِ احسن باندھ دیا جاتا ہے جس سے وہ جُڑ جاتی ہے۔ اس اندازِ اصلاح کو جَبر کہتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکڑی جس سے ہڈی کو اس طرح جکڑا جاتا ہے جِبَارَةٌ کہلاتی ہے اور جس پٹّی سے اسے باندھا جاتا ہے اسے جَبِیْرَۃ کہتے ہیں۔ لہٰذا جَبَّار کے معنی ہیں وہ ذات جس نے اس تمام نظامِ کائنات کو اپنے قوانین کی قوت سے اس انداز سے جکڑ رکھا ہے کہ کوئی شے اپنے مقامِ متعیّنہ سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہٹ سکتی اور اسے جکڑنے میں ظلم و جور کا شائبہ نہیں بلکہ یہ سر تا سر حکمت و مصلحت پر مبنی اور نظامِ عالم کو جادۂ اعتدال پر چلانے کے لئے ہے۔ نیز جبّار کے معنی ہیں وہ ذات جو ہر بگڑی کو بنانے والی ہے' بایں اسلوب کہ اس طریقِ علاج و اصلاح میں غلبہ و قوت بھی شامل ہے۔ جب انسان غلط طریق کے مطابق زندگی بسر کرے گا تو اس کی زندگی میں فساد رُونما ہوگا۔ اب اگر وہ اپنی اصلاح چاہتا ہے' تو اسے اپنے آپ کو قوانینِ الٰہیہ کی زنجیروں میں جکڑنا پڑے گا۔ زندگی کے دھارے کو قیود و حدودِ خداوندی کے سخت

ساحلوں کے اندر لے جانا ہوگا۔ اس کے بعد اس کی "ٹوٹی ہوئی ہڈیاں" جڑ جائیں گی۔ اس کی بگڑی ہوئی حالت سنور جائے گی۔ یہ ہے جبّار کا صحیح مفہوم۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کے لئے یہ لفظ صرف ایک مرتبہ آیا ہے یعنی (۵۹/۲۳) میں۔

انسانوں کی صفتِ جباریت لیکن یہی صفت جب ان انسانوں کی طرف منسوب ہوگی جو اسے زیردستوں پر ظلم کرنے کے لئے استعمال کریں گے، تو عیب ہو جائیگی۔ اس لئے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان کو قوت اور شدت کی بنا پر اپنا محکوم اور تابع فرمان بنائے۔ ایسا کرنے والا مستبد اور ظالم کہلائے گا اور قانونِ خداوندی سے سرکشی برتے گا۔ ایسی روش اختیار کرنے والا خاسر و نامراد رہے گا۔ سورۂ ابراہیم میں ہے۔ وَ خَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيۡدٍ (۱۴/۱۵)۔ ہر سرکش و ضدی خاسر و نامراد ہوا۔ سورۂ المومن میں ہے۔

كَذٰلِكَ يَطۡبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلۡبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۝ (۴۰/۳۵)

"اس طرح اللہ ہر متکبر اور سرکش ضدی کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔"

لیکن یہی قوتیں جب دنیا میں نظامِ عدل و اصلاح کے قیام کے لئے صرف کی جائیں گی تو صفاتِ خداوندی کی مظہر بن جائیں گی۔ یہ فرق ہے ایک نشوونما یافتہ ذات کی طرف سے قوت کی نمود اور حیوانی سطح پر قوت کے استعمال میں۔

المتکبر مندرجہ صدر آیت میں جَبَّارٌ کے ساتھ مُتَكَبِّرٌ کا لفظ بھی آیا ہے۔ جب یہ لفظ عام انسانوں کے لئے بولا جائے گا تو اس کے معنی ہوں گے وہ لوگ جو محض قوت اور اقتدار کے نشہ میں اپنے آپ کو دوسرے انسانوں سے بڑا سمجھیں اور اس طرح ان پر حکومت کرنا اپنا حق قرار دیں۔ لیکن یہی صفت جب اللہ کی طرف منسوب ہو تو اس کا مفہوم عظمت و بلندی، جبروت و کبریائی ہوتا ہے۔ المتکبر کا لفظ بھی قرآن میں (اَلۡجَبَّارُ کے ساتھ) ایک ہی مرتبہ آیا ہے (۵۹/۲۳)۔ سورۂ نساء میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيۡرًا ۝ (۴/۳۴)

"یقیناً اللہ عالی مرتبت، بلند و بالا اور بہت بڑا ہے۔"

سورۂ جاثیہ میں ہے۔

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۴۵/۳۷)

"زمین اور آسمانوں میں کبریائی اسی کے لئے ہے اور وہ غالب حکمت والا ہے۔"

یہی کبریائی اُس جماعت (حزبُ اللہ) کے حصّہ میں آئے گی جو دنیا میں نظامِ خداوندی کے قیام کی کفیل ہو گی اور جس کے افراد کی ذات میں صفاتِ خداوندی منعکس ہوں گی۔ انھیں اس قسم کا تکبّر (بڑا ہونا) زیب دیگا اس لئے کہ جس تکبّر کو قرآن نے معیوب قرار دیا ہے، وہ تکبّر ہے جو بِغَيْرِ الْحَقِّ ہو۔ سورۂ اعراف میں ہے۔ سَأَصْرِفُ عَنْ آيَاتِيَ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (۷/۱۴۷)۔ اسی طرح سورۂ حٰم میں ہے۔ فَأَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (۴۱/۱۵)۔ لہٰذا جو تکبّر (بڑائی) حق کے ساتھ ہو، وہ معیوب نہیں۔ یہ تو اُس ذات کی بنیادی خصوصیت ہے جس میں صفاتِ خداوندی کی جھلک ہو۔ یہ بڑائی نوعِ انسان کی نفع بخشیوں کے سلسلہ میں تعمیری نتائج پیدا کرنے سے حاصل ہو گی اور یہی ان افراد کا شیوہ ہے جن کی ذات کی نمود ہو چکی ہو۔

۱۶

اَلْمُنْتَقِمُ۔ ذُوْانْتِقَامٍ

مفہوم صفاتِ باری تعالےٰ کے متعلق ہمارے ہاں کے مروّجہ معانی کے اعتبار سے جن الفاظ سے غلط مفہوم پیدا ہوجاتا ہے ان میں ایک لفظ "انتقام" بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت ذوانتقام ہے جس کا بالعموم ترجمہ کیا جاتا ہے "انتقام لینے والا" اور انتقام کے مروّجہ معانی سے ذہن فوراً غیظ و غضب کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، اس لئے کہ ہمارے ہاں "انتقام" میں غصہ کا شائبہ ضرور پایا جاتا ہے۔ لیکن، جیسا کہ ہم "غضب" کے عنوان میں لکھ چکے ہیں، اللہ تعالےٰ غصہ و غضب کے ان جذبات سے بلند و بالا ہے جو انسانوں میں پائے جاتے ہیں۔ نَقَمٌ کے معنی وسطِ طریق کے ہیں، یعنی راستہ کا درمیانی حصہ۔ لہٰذا انتقام کے معنی یہ ہوں گے کہ جو جانور راستے سے اِدھر اُدھر ہٹ جائیں، انھیں گھیر کر پھر راستے کے بیچ میں لے آیا جائے تاکہ وہ سیدھی راہ پر چلیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے بھی مُراد قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے غلط اعمال کی پاداش ہے۔ لہٰذا جب کہا جائے گا کہ اللہ ذوانتقام ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق مجرموں کو ان کے اعمال کی سزا دیتا ہے۔ قوم فرعون کی سرکشی و بغاوت کے تذکرہ کے بعد فرمایا۔

مکافاتِ عمل فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا

بِاٰیٰتِنَا وَ کَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِیْنَ ٥ (۷/۱۳۶ نیز ۴۳/۵۵)۔

"بالآخر ہم نے (ان کی بدعملیوں پر) انہیں سزا دی اور انہیں سمندر میں غرق کر دیا اس جرم کی پاداش میں کہ انہوں نے ہمارے قوانین کو جھٹلایا اور ان کی طرف سے غافل رہے"۔

اُممِ گذشتہ کے مجرمین کے متعلق اُن کی بداعمالیوں کے سلسلہ میں ہے۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ع (۴۳/۲۵ نیز ۳/۱۲۷)

"بالآخر ہم نے (ان کے اعمالِ بد کی) سزا دی۔ پس دیکھو کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جنہوں نے ہمارے قوانین کی تکذیب کی تھی"۔

دوسری جگہ ہے۔

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ ع (۳۲/۲۲)۔

"اور اُس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا کہ جسے اس کے رب کے قوانین کی یاددہانی کرائی جائے اور وہ ان سے مُنہ موڑے۔ یقیناً ہم مجرموں کو (ان کے اعمال کی) سزا دیں گے"۔

عہدِ رسالت مآبؐ کے مکذبین و منکرین کے متعلق بھی فرمایا۔ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُنْتَقِمُوْنَ ٥ (۴۳/۴۱)۔ "ہم یقیناً ان کے اعمال کی انہیں سزا دیں گے"۔ جب اللہ کا قانونِ مکافات پکڑتا ہے تو پھر اس کی گرفت سے کوئی نہیں چھوٹ سکتا۔ یہ ہے اللہ کا انتقام۔

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ٥ (۴۴/۱۶)۔

"جس دن ہم انہیں ایک سخت گرفت سے پکڑیں گے، یقیناً ہم انھیں ان کے اعمالِ بد کی سزا دینے والے ہیں"۔

وہ مجرمین کو آگاہ کر دیتا ہے کہ

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

لیکن وہ اس تنبیہہ سے کچھ فائدہ نہیں اُٹھاتے اور اپنی ضد اور سرکشی پر اڑے رہتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی شامتِ اعمال ان کے سامنے آجاتی ہے۔ عذابِ الٰہی کی اس گرفت سے انہیں پھر کوئی نہیں چھڑا سکتا۔

اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ؕ (۸۵/۱۲)۔

"تیرے رب کی گرفت یقیناً بڑی محکم ہوتی ہے"۔

قوم لوطؑ کے متعلق فرمایا:

وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ؕ (۵۴/۳۶)

"یقیناً (لوطؑ نے) ان لوگوں کو (مکافاتِ عمل کی) گرفت سے آگاہ کردیا لیکن انہوں نے اس تنبیہ سے ضد اور سرکشی اختیار کرلی"۔

یہ ہے اللہ کے انتقام کا مفہوم اور اسی انتقام کی وجہ سے وہ ذوانتقام ہے۔

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ؕ (۱۴/۴۷ نیز ۳/۴ ، ۳۹/۳۷، ۵/۹۵)۔

"پس ایسا خیال نہ کرو کہ اللہ اپنے رسولوں سے جو وعدہ کرچکا ہے اس کے خلاف کریگا۔ (ایسا ہونا ناممکن ہے) وہ (سب پر) غالب ہے اور (اعمالِ بد کی) سزا دینے والا ہے"۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ انتقامِ خداوندی سے مُراد ہے اس کے قانونِ مکافات کی رُو سے، غلط اعمال کا تباہ کن نتیجہ۔ یہی مفہوم قوانینِ الٰہیہ کو نافذ کرنے والی جماعتِ مومنین کے "انتقام" سے ہوگا۔ ان کا انتقام کسی ذاتی رنجش یا عناد کی بنا پر نہیں ہوگا، بلکہ ان کی محبت اور عداوت دونوں "اللہ" کے لئے ہوں گے اور حقیقت یہ ہے کہ جسے عرفِ عامہ میں عداوت کہا جاتا ہے، ان کے ہاں وہ بھی اصلاح کا پہلو لئے ہوگی۔ زہر آلود انگلی کو کاٹ کر پھینک دینا بظاہر سفاکی کا شائبہ لئے ہوئے ہے لیکن جس کی نگاہ جسم کے مفادِ کلّی پر ہے وہ جانتا ہے کہ اس قطع و برید میں بھی شفقت و رافت کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے ان امور کی تفصیل تو "جنگ اور جہاد" وغیرہ عنوانات میں (معراجِ انسانیت میں) ملے گی۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ صفاتِ الٰہیہ کو اپنے اندر منعکس کرنے والے بندگانِ خدا کا انتقام بھی نظامِ انسانیت کی اصلاح کے لئے ہوگا۔ اس میں ذاتی بغض و عناد کا کوئی جذبہ پنہاں نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ قوانینِ الٰہیہ کو نافذ کرنے والی قوم، درحقیقت، انسانی حدود کے ماتحت "انتقامِ خداوندی" کی تنفیذ ہی کا ذریعہ بنے گی، اپنا ذاتی انتقام نہیں لے گی۔ برائی کو روکنے کی قوّت اور گرفت ایک نشوونما یافتہ ذات کی بنیادی خصوصیت ہے۔ یہی اس کا "انتقام" ہے۔

۱۷

علمِ الٰہی

کائنات کی ہر شے کا علم

خدا اگر اپنی مخلوق کے حالات سے بے خبر ہو تو وہ خدا کیا ہوا؟ اسی لئے قرآنِ کریم میں علمِ الٰہی کے متعلق بڑی شرح و بسط سے ذکر آیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس محیّر العقول نظامِ کائنات کا ربط و ضبط اور نظم و نسق اسی ہستی سے سرانجام پا سکتا ہے جسے قطرے سے لے کر سمندر اور ذرّے سے لے کر آفتاب تک ہر شے کا پورا پورا علم ہو، ایسا علم جس میں ظن و تخمین اور قیاس و گمان کو کوئی دخل نہ ہو۔ یقینی علم اور مکمل علم جس طرح ذاتِ خداوندی مکمل ترین ہے اسی طرح اس کا علم بھی مکمل ترین ہے۔ قرآنِ کریم نے علمِ خداوندی کی ہمہ گیری کو تین لفظوں میں اس جامعیت سے بیان کر دیا ہے کہ جوں جوں نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، وجد میں آجاتی ہے۔ یعنی

(وَهُوَ) بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ٥ (۲/۲۹)

"وہ ہر شے کا پورا پورا علم رکھتا ہے۔"

عَلِيمٌ میں دوام و استمرار پایا جاتا ہے، یعنی یہ نہیں کہ کسی وقت علم رکھتا ہے اور کسی وقت نہیں، بلکہ ہر شے کا ہر وقت علم رکھتا ہے۔ اس حقیقت کو انسان کے دل پر نقش کرنے کے لئے ان الفاظ کو مختلف مقامات پر مختلف مضامین کے ضمن میں بار بار دہرایا گیا ہے اور اس انداز سے کہ آپ ان الفاظ کو متعلقہ آیات کے سیاق و سباق سے ملا کر دیکھیں، تو یہ حقیقت خود بخود سامنے آجائے کہ ان کے اعادہ و تکرار کی

کس قدر ضرورت تھی۔ ملاحظہ ہو۔ (۲/۲۳۱؛ ۲/۲۸۲؛ ۲۱/۸۱)۔ سورۂ حدید میں ہے۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ ۚ وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝ (۵۷/۳)۔

"وہی سب سے پہلے ہے وہی سب سے آخر۔ مخلوق کے ذریعے اس کی صفات کا ظہور ہوتا ہے لیکن اس کی ذات انسانی نگاہوں سے مخفی رہتی ہے اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے"۔

اسی حقیقت کو دوسرے الفاظ میں یوں بیان فرمایا ہے۔

وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ۝ (۶/۸۱)۔

"(حضرت ابراہیمؑ نے کہا) میرا پروردگار اپنے علم سے تمام چیزوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے"۔

ان الفاظ کا بھی مختلف مقامات پر مختلف پیرایوں میں اعادہ فرمایا۔ مثلاً (۸۹/۷؛ ۲۰/۹۸؛ ۴۰/۷) وَسِعَ کی تفسیر دوسرے مقام پر اس طرح کر دی۔

اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ۚ (۶۵/۱۲)

"اللہ ہر شے کو اپنے احاطۂ علم میں لئے ہوئے ہے"۔

دوسری جگہ ہے۔

وَ اَحْصٰی كُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا ۚ (۷۲/۲۸)۔

"اور ہر شے کے اعداد و شمار کو (محفوظ) رکھے ہوئے ہے"۔

ارض و سما میں ذرّہ ذرّہ کا واقف

یہ تو تھا اجمال۔ اس اجمال کی تفصیل قرآنِ کریم کے مختلف گوشوں میں ملے گی۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَخْفٰی عَلَیْهِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ ۝ (۳/۵)

"بلاشبہ اللہ کے علم سے کوئی شے پوشیدہ نہیں، خواہ وہ زمین میں ہو خواہ آسمان میں"۔

اسی کا اعادہ (۱۴/۳۸؛ ۲۹/۵۲؛ ۳۵/۳۸) میں کیا گیا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔

یَعْلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ (۲۵/۶؛ ۲۷/۷۵؛ ۴۹/۱؛ ۵/۹۷؛ ۱۰/۶۱؛ ۳۴/۳)

"وہ آسمانوں اور زمین کے تمام رازوں سے واقف ہے"!

ہر ذی روح کے احوال وظروف سے باخبر

کوئی جاندار ایسا نہیں جس کے حالات سے وہ آگاہ نہ ہو۔

یَعۡلَمُ مُسۡتَقَرَّهَا وَ مُسۡتَوۡدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِیۡ كِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ ۝ (۱۱/۶)

"وہ جانتا ہے کہ اس کا عارضی ٹھکانا کہاں ہے اور مستقر کہاں یہ سب کچھ (علم الٰہی کی) کتابِ مبین میں مندرج ہے۔"

مظاہرِ فطرت کے کاروبار کا علم

مظاہرِ فطرت میں جو انقلابات رُونما ہوتے رہتے ہیں اور جس انداز سے کارخانۂ کائنات کا ہر پُرزہ اپنے اپنے فرائضِ مفوّضہ کی سرانجام دہی میں سرگرداں ہے، اسے سب کا علم ہے۔

یَعۡلَمُ مَا یَلِجُ فِی الۡاَرۡضِ وَ مَا یَخۡرُجُ مِنۡهَا وَ مَا یَنۡزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا یَعۡرُجُ فِیۡهَا ؕ وَ هُوَ الرَّحِیۡمُ الۡغَفُوۡرُ ۝ (۳۴/۲)

"جو کچھ زمین کے اندر داخل ہوتا ہے اور جو کچھ اس سے باہر نکلتا ہے اور جو چیز آسمان سے نازل ہوتی ہے اور جو چیز اس کی طرف چڑھتی ہے، اللہ سب کا علم رکھتا ہے اور وہ غفور ورحیم ہے۔"

سورۂ انعام میں ہے۔

وَ عِنۡدَهٗ مَفَاتِحُ الۡغَیۡبِ لَا یَعۡلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَ یَعۡلَمُ مَا فِی الۡبَرِّ وَ الۡبَحۡرِ ؕ وَ مَا تَسۡقُطُ مِنۡ وَّرَقَةٍ اِلَّا یَعۡلَمُهَا وَ لَا حَبَّةٍ فِیۡ ظُلُمٰتِ الۡاَرۡضِ وَ لَا رَطۡبٍ وَّ لَا یَابِسٍ اِلَّا فِیۡ كِتٰبٍ مُّبِیۡنٍ ۝

(۶/۵۹ ؛ ۵۷/۴)

"اسی کے پاس غیب کی کُنجیاں ہیں۔ اُسے اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ جو کچھ بیابانوں میں ہے اور جو سمندروں میں ہے وہ سب کا علم رکھتا ہے (درختوں سے) کوئی پتا نہیں گرتا اور زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ نہیں (ڈالا جاتا) جس کا اسے علم نہ ہو اور خشک و تر کوئی چیز ایسی نہیں کہ جو (علم الٰہی کے) واضح نوشتہ (کتابِ مبین) میں مندرج نہیں۔"

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، صفاتِ الٰہی پر صحیح ایمان انسان کی عملی زندگی پر خاص طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ علیم ہے۔ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ اگر تمام انسان اس صفتِ خداوندی پر ایمان لے آئیں جب بھی وہ ایسا ہی علیم و خبیر ہوگا، جیسا اس صورت میں

علمِ الٰہی پر ایمان اعمالِ انسانی پر اثر انداز ہوتا ہے

کہ کوئی شخص بھی اس حقیقت پر ایمان نہ رکھے وہ تو اس وقت بھی ایسا ہی علیم و خبیر تھا جب کوئی انسان موجود نہ تھا. اس لئے انسان کے ایمان کا اللہ کی صفات پر کچھ اثر نہیں پڑتا. اس سے خود اس کی اپنی زندگی سنورتی ہے، نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے، ذہنیت میں تبدیلی آجاتی ہے. اگر ایک شخص کا یہ محکم یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کے محسوس اعمالِ حیات تو ایک طرف، دل کے ارادوں تک سے واقف ہے اور اس کے ساتھ اس حقیقت پر بھی اس کا ایمان ہو کہ کوئی عمل بلا نتیجہ نہیں رہ سکتا، تو اندازہ لگایئے کہ اس کی زندگی کس قدر قوانینِ خداوندی کے تابع ہوگی. وہ بزمِ انسانیت کا کیسا معزز اور مفید رکن ہوگا اور اگر ایسا ایمان ایک فرد کی بجائے ایک جماعت کے دل میں پیدا ہو جائے اور پھر جماعت سے آگے بڑھ کر نوعِ انسانی کی اکثریت اس طرف آجائے تو یہ دنیا، جسے اس ایمان کے فقدان نے آج یوں جہنم زار بنا رکھا ہے، ایک ایسی جنت میں تبدیل ہو جائے جہاں ہر طرف اطمینان اور سکون کی فضا ہو۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے قرآنِ کریم، اللہ کی صفات کو اس قدر وضاحت اور تکرار سے سامنے لاتا اور ان پر ایمانِ محکم کی اتنی تاکید کرتا ہے. اعمالِ انسانی کے متعلق فرمایا کہ جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ ظاہر کرتے ہو، اللہ ان تمام باتوں سے واقف ہے۔

ظاہر و پوشیدہ تمام اعمالِ حیات کا واقف

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ (۳/۲۸)۔

"کہہ دیجئے کہ تمہارے دلوں کے اندر جو کچھ ہے، تم اُسے چھپاؤ یا ظاہر کرو، ہر حال میں اللہ اسے خوب جانتا ہے. آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے، سب اس پر روشن ہے اور اس نے ہر شے کے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں۔"

سورۂ مائدہ میں فرمایا۔

وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا تَكْتُمُوْنَ ۝ (۵/۹۹)۔

"جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ ظاہر کرتے ہو، اللہ سب سے واقف ہے"۔

سورۂ انعام میں ہے۔

يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَ جَهْرَكُمْ وَ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ۝ (۶/۳؛ ۲۹/۲۴)۔

"وہ تمہاری چھپی اور کھلی ہر قسم کی باتوں کا علم رکھتا ہے اور جو کچھ تم (اچھی یا بُری) کمائی کرتے ہو، وہ بھی اس کے احاطۂ علم سے باہر نہیں"۔

دوسری جگہ ہے۔

يَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ ۝ (۲۷/۲۵؛ ۳۶/۷۶)۔

"جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ ظاہر کرتے ہو، وہ سب کا علم رکھتا ہے"۔

سورۂ نحل میں ہے۔

وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ ۝ (۱۶/۱۹؛ ۱۶/۲۳)

"جو کچھ تم چھپاتے ہو اور ظاہر کرتے ہو، اللہ سب سے واقف ہے"۔

سورۂ طٰہٰ میں ہے۔

وَ اِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَ اَخْفٰى ۝ (۲۰/۷)

اور اگر تم پکار کر بات کہو (تو بھی کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ) وہ بھیدوں کا جاننے والا ہے۔ زیادہ سے زیادہ چھپائے ہوئے بھید (بھی اس سے پوشیدہ نہیں)"۔

سورۂ نمل میں ہے

وَ اِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ ۝

(۲۷/۷۴؛ ۲۸/۶۹)

"اور یقیناً تمہارا رب خوب جانتا ہے جو کچھ یہ لوگ اپنے سینے میں چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں"۔

دوسری جگہ ہے۔

يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَ مَا يَخْفٰى ۝ (۸/۷؛ ۲۱/۱۱۰؛ ۲۷/۲۶؛ ۳۳/۵۴؛ ۲/۲۸۴؛ ۲۳/۸)

"وہ کھلی اور پوشیدہ تمام باتوں کا علم رکھتا ہے۔"

جب اللہ کا علم اس طرح حاضر و غائب، کھلی اور پوشیدہ ہر شے پر حاوی ہے، تو ظاہر ہے کہ جو لوگ یہ سمجھتے

منافقین کا فریبِ نفس

ہیں کہ ہم دل میں کچھ رکھیں اور زبان سے کچھ کہیں، کسی کو اس کا علم نہیں ہو سکتا، وہ کس قدر فریبِ نفس میں مبتلا ہیں۔ انہی کے متعلق فرمایا۔

اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ ۝ (۲/۷۷؛ ۲/۱۴؛ ۵/۶۱)

"کیا یہ اس بات کو نہیں جانتے کہ جو کچھ یہ دل میں چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں، اللہ ان سب باتوں سے واقف ہے۔"

اس لئے کہ اللہ تو سینہ کے بھیدوں اور دل کے رازوں سے واقف ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ ۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ (۳/۱۱۸؛ ۵/۷؛ ۱۱/۵؛ ۲۹/۱۰؛ ۳۱/۲۳؛ ۳۹/۷؛ ۴۲/۲۴؛ ۶۴/۴)۔

نگاہوں کی خیانت اور دل کے بھیدوں سے واقف

اور واضح الفاظ میں فرمایا کہ

يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَ مَا تُخْفِى الصُّدُوْرُ ۝ (۴۰/۱۹؛ ۵/۱۶)

"وہ نگاہوں کی خیانت اور دلوں کے بھید سے واقف ہے۔"

تمام سرگوشیوں سے باخبر

جب وہ دل کی گہرائیوں میں گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہے، تو لوگوں کی سرگوشیاں اور خفیہ تدابیر اس سے کیسے چھپ سکتی ہیں۔ فرمایا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِى الْاَرْضِ......

اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ۝ (۵۸/۷)۔

"کیا تم یہ نہیں جانتے کہ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے؛ جہاں کہیں تین آدمی سرگوشیاں کر رہے ہوں، تو وہ ان میں چوتھا ہوتا ہے اور اگر وہ پانچ ہوں، تو وہ چھٹا ہوتا ہے۔"

خواہ وہ اس سے کم ہوں یا زیادہ، اللہ ہر جگہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ پھر وہ ظہورِ نتائج کے وقت انہیں بتا دیگا کہ وہ کیا کیا کرتے تھے۔ یقیناً اللہ ہر شے سے واقف ہے۔"

اللہ تعالیٰ سے کچھ چھپایا نہیں جا سکتا۔

وَ اللّٰہُ اَعۡلَمُ بِمَا یُوۡعُوۡنَ ﴿۸۴/۲۳﴾۔

"اللہ جانتا ہے جو کچھ یہ چھپاتے ہیں۔"

ماضی و مستقبل کا علم

زمان (TIME) کے متعلق فلسفیانہ گفتگو کا یہ مقام نہیں۔ اس جگہ اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ چونکہ انسان کا علم محدود ہے اس لئے اس نے زمان کے لامتناہی سلسلہ کو ماضی، حال اور مستقبل کے حصّوں میں تقسیم کر رکھا ہے، لیکن خدا کا علم لامتناہی ہے لہٰذا اس کے لئے ماضی، حال اور مستقبل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے سامنے (اقبالؒ کے الفاظ میں) ہر وقت ایک ابدی حال (ETERNAL NOW) ہے۔ لہٰذا

یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ مَا خَلۡفَہُمۡ ﴿۲/۲۵۵ ; ۲۰/۱۱۰ ; ۲۱/۲۸ ; ۲۲/۷۶﴾

"جو کچھ انسان کے سامنے ہے، وہ اسے بھی جانتا ہے اور جو کچھ پیچھے ہے، وہ بھی اس کے علم سے باہر نہیں۔"

اس کا یہ غیر محدود علم صرف موجودہ انسانوں ہی سے متعلق نہیں، بلکہ گذرے ہوئے اور آنے والے سب انسانوں سے متعلق ہے۔

وَ لَقَدۡ عَلِمۡنَا الۡمُسۡتَقۡدِمِیۡنَ مِنۡکُمۡ وَ لَقَدۡ عَلِمۡنَا الۡمُسۡتَاۡخِرِیۡنَ ﴿۱۵/۲۴﴾

"اور بلا شبہ ہمیں ان لوگوں کا بھی علم ہے جو گذر چکے اور ان کا بھی جو بعد میں آنیوالے ہیں"

زمان کی طرح مکان (SPACE) کی بھی یہ کیفیت ہے کہ کچھ چیزیں انسان کے سامنے مشہود ہوتی ہیں (جنہیں وہ دیکھ سکتا ہے) اور کچھ نامشہود (UN-SEEN) لیکن نگہ، خداوندی" میں مشہود و نامشہود (حاضر و غائب) میں کچھ فرق نہیں ہو سکتا۔ ہر شے، ہر وقت، اس کے سامنے ہے۔ اس حقیقت کو قرآن میں ان تین الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

عَالِمُ الۡغَیۡبِ وَ الشَّہَادَۃِ

عَالِمُ الۡغَیۡبِ وَ الشَّہَادَۃِ ﴿۶/۷۴﴾

۶/۹۴ ؛ ۹/۱۵ ؛ ۲۳/۹۲ ؛ ۳۲/۶ ؛ ۳۹/۴۶ ؛ ۵۹/۲۲ ؛ ۶۲/۸)۔

"غیب و شہادت جاننے والا۔"

اسی کو عَلَّامُ الْغُیُوْبِ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (۵/۱۱۶) ؛ ۹/۷۸)۔
یعنی

وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ۝ (۳۴/۴۷)

"اور وہ ہر شے کا شاہد ہے (ہر چیز اس کے سامنے حاضر ہے)۔"

علمِ غیب صرف اللہ کے لئے ہے

خدا غیب کا علم رکھتا ہے اور یہ علم اس کی ذات تک محدود ہے۔ خدا کے سوا کوئی غیب کا علم (ازخود) نہیں رکھتا۔ نبیِ اکرمؐ سے کہا گیا کہ

فَقُلْ اِنَّمَا الْغَیْبُ لِلّٰهِ (۱۰/۲۰)

"(ان سے) کہہ دو کہ غیب کا علم صرف اللہ کے لئے ہے۔"

دوسری جگہ ہے۔

قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ ....(۲۷/۶۵)

"کہیئے کہ زمین و آسمان میں اللہ کے سوا کوئی نہیں جو غیب کو جانتا ہو"....

انسان غیب سے واقف نہیں

اس کے بعد اس کی وضاحت کر دی کہ انسان غیب کے علم سے واقف نہیں۔ سورۂ مریم میں ہے کہ کیا تم نے اس شخص کو بھی دیکھا ہے جو ہمارے قانون سے انکار کرتا ہے اور حتمی طور پر کہتا ہے کہ مجھے اولاد اور دولت ملے گی۔

اَطَّلَعَ الْغَیْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۝ (۱۹/۷۸)

"کیا اسے (کوئی) غیب کی اطلاع مل گئی ہے یا اس نے خدا سے (ایسا) وعدہ لے رکھا ہے؟"

نبوتِ محمدیؐ کے منکرین، مکذبین اور معترضین کے متعلق منجملہ دیگر امور یہ بھی کہا کہ

اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَیْبُ فَهُمْ یَكْتُبُوْنَ ۝ (۵۲/۴۱ ؛ ۵۳/۳۵ ؛ ۶۸/۴۷)

"یا کیا ان کو علمِ غیب ہے جسے یہ لکھ لیتے ہیں۔"

رسولوں کو بھی ازخود غیب کا علم نہیں ہوتا

حتیٰ کہ رسولوں کو بھی ازخود غیب کا علم

نہیں ہوتا۔ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے کہا۔

وَ لَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَ لَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ (۱۱/۳۱)

"میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ یہ کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں۔"

جب حضرت ہودؑ سے ان کی قوم نے تقاضا کیا کہ جس عذاب سے آپ ڈراتے ہیں اسے لے آیئے تو فرمایا

اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ (۴۶/۲۳)

"(اس کا) علم تو صرف خدا ہی کو ہے (کہ وہ عذاب کب آئے گا)۔"

خود نبی اکرمؐ نے اس کا اقرار کیا کہ علمِ غیب اللہ کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَ لَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ (۶/۵۰)

"کہہ دو کہ میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ ہی میں غیب کا علم رکھتا ہوں۔"

دوسری جگہ ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ ۚ (۷/۱۸۷)۔

"یہ (لوگ) تم سے آنے والے انقلاب کی بابت پوچھتے ہیں کہ وہ کب واقع ہوگا۔ کہدو کہ اس کا علم تو صرف میرے خدا کو ہے۔"

منافقین وہ لوگ تھے جن کے دل میں کچھ اور زبان پر کچھ اور ہوتا تھا۔ وہ مسلمانوں کے اندر ملے جُلے رہتے اور حضورؐ کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے تھے۔ ان کے متعلق فرمایا۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ ○ وَ لَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ؕ وَ لَتَعْرِفَنَّهُمْ فِیْ لَحْنِ الْقَوْلِ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ ○ (۴۷/۲۹-۳۰)

"جن لوگوں کے دل میں منافقت کا مرض ہے کیا وہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ کبھی ان کی دلی عداوتوں کو ظاہر نہ کریگا۔ اگر ہم چاہتے تو تمہیں ان کا پورا پتہ بتا دیتے سو تم اُن کو حلیہ سے پہچان لیتے (لیکن ہم ایسا نہیں کرنا چاہتے۔ تمہیں، ان کو خود ہی پہچاننا ہوگا) تم انہیں ان کے طرزِ کلام (دبی چھپی

باتوں) سے پہچان سکتے ہو اور اللہ تعالیٰ تم سب کے اعمال سے واقف ہے۔

صرف نبیٔ اکرمؐ کے متعلق ہی نہیں بلکہ جملہ انبیائے کرامؑ کے متعلق فرمایا:۔

یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰہُ الرُّسُلَ فَیَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ○ (۵/۱۰۹)۔

"جس دن اللہ تمام رسولوں کو جمع کریگا اور پوچھے گا کہ تمہیں (تمہاری اُمتوں کی طرف سے دعوتِ حق کا) کیا جواب ملا (یعنی کہاں تک انہوں نے بہ خلوصِ نیت دعوتِ حق کو دل سے قبول کیا) وہ کہیں گے کہ (ہم تو ان کی ظاہری حالت ہی کو جان سکتے تھے) ان کے دل کی حالت کا ہمیں علم نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ تو تیری ہی ہستی ہے جو غیب کی باتیں جاننے والی ہے"!

وحی کا تعلق غیب سے ہے

رسولوں کا غیب کے متعلق عدمِ علم ان کی بشری حیثیت سے تھا۔ انھیں جو وحی خدا کی طرف سے ملتی تھی وہ علمِ غیب پر مشتمل ہوتی تھی، یعنی کوئی انسان ان حقائق کو اپنے ذاتی علم کی بنا پر نہیں جان سکتا۔ یہی وہ غیب (وحی) ہے جس کے متعلق کہا ہے کہ

عَالِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۙ (۷۲/۲۶-۲۷؛ ۳/۱۷۸)

"غیب کا جاننے والا وہی ہے۔ وہ اپنے علمِ غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا البتہ جس شخص کو وہ رسالت کے لئے منتخب کرتا ہے اسے غیب کے متعلق جو کچھ بتانا مقصود ہوتا ہے، بذریعہ وحی بتا دیتا ہے اور اس کے آگے اور پیچھے محافظ بھیج دیتا ہے۔ (تاکہ وہ اس کی وحی کی حفاظت کریں)"۔

اس سے واضح ہے کہ نبی کا علمِ غیب اس کی طرف بھیجی ہوئی وحی ہی کا ایک حصہ ہوتا ہے، اس سے باہر کہیں نہیں ہوتا۔ بنا بریں، علمِ غیب کے ضمن میں جو کچھ رسول اللہؐ کو دیا گیا تھا وہ قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے۔

قصصِ قرآن بطور علمِ غیب

اسی علمِ غیب کے ذیل میں وہ قصصِ اُممِ سابقہ اور کوائف حضرات انبیاءؑ گذشتہ

ہیں جو قرآنِ کریم میں مذکور ہیں۔ مثلاً قصۂ حضرت مریمؑ کے متعلق فرمایا۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ (۳/۴۳)

یہ غیب کی ان خبروں میں سے ہے جسے اللہ نے تیری طرف وحی کیا ہے۔

قصۂ نوحؑ کے تذکار کے بعد کہا۔

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَ لَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ (۱۱/۴۹)۔

"یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جسے ہم تمہیں وحی کے ذریعے بتا رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تو یہ باتیں تُو خود جانتا تھا اور نہ تیری قوم"۔

قصۂ حضرت یوسفؑ کے ضمن میں بھی یہی فرمایا کہ "یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جس کی ہم تجھ پر وحی کر رہے ہیں۔ (۱۲/۱۰۲) وحی کے علاوہ غیب کا علم کسی کو حاصل نہیں ہوتا، خواہ وہ عام انسان ہوں یا لوگوں کے بنائے ہوئے "خدا"۔ بلکہ معبودانِ باطل[۱] کے متعلق بالتصریح فرما دیا

معبودانِ باطل کو علمِ غیب نہیں ہوتا

کہ انہیں کسی چیز کا علم نہیں ہوتا، حالانکہ لوگ انکی پرستش اس لئے کرتے اور انہیں اپنا وسیلہ بناتے ہیں کہ وہ (ان کے زعم میں) مقربینِ بارگاہِ الٰہی ہونے کی حیثیت سے غیب کا علم رکھتے ہیں۔

وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○ (۱۰/۱۸، از ۱۳/۳۳)۔

"اور یہ لوگ خدا سے ورے ہی ان کی عبودیت اختیار کر لیتے ہیں جو نہ ان کو نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔ اور کہتے یہ ہیں (ہم اس لئے ان کی عبودیت اختیار کرتے ہیں کہ) یہ اللہ کے نزدیک

---

[۱] خدا کے سوا ہر معبود باطل ہوتا ہے۔

ہمارے سفارشی ہیں. کہیئے کہ کیا تم (اپنی باتوں کو) اللہ تک ایسی چیزوں کے ذریعے پہنچاتے ہو
جنہیں خود زمین و آسمان میں کسی چیز کا علم نہیں. اللہ اُن سے کہیں بلند و بالا ہے جو یہ لوگ اس
کے ساتھ شریک کرتے ہیں۔"

ان کی تو یہ حالت ہے کہ وہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ مرنے کے بعد کب دوبارہ اٹھائے جائیں گے.

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ
وَ مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۝ (۲۷/۶۵)۔

" کہیے کہ زمین و آسمان میں اللہ کے سوا کوئی اور ایسا نہیں جو غیب سے واقف ہو (باقی رہے یہ
معبودانِ باطل سو) وہ تو اتنا بھی نہیں جانتے کہ وہ کب (دوبارہ) اُٹھائے جائیں گے۔"

نہ کوئی پیر، فقیر

ان "معبودانِ باطل" میں وہ تمام پیر، فقیر، اولیاء وغیرہ شامل ہیں جن کے متعلق ان کے معتقدین کہتے ہیں کہ (ہم ان کی پرستش نہیں کرتے لیکن) وہ غیب کا علم رکھتے ہیں. صرف زندگی ہی میں نہیں، بلکہ مرنے کے بعد بھی ـــــ یہ عقیدہ قرآن کے خلاف ہے. ہم سابقہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کی رُو سے.

(۱) خدا کے سوا کوئی اور غیب کا علم نہیں رکھتا۔ اور

(۲) خدا نے انسانوں کو غیب کا جس قدر علم دینا ہوتا، اُسے بذریعہ وحی، اپنے رسولوںؑ کی وساطت سے دے دیتا۔

وحی کا یہ سلسلہ نبی اکرمؐ پر ختم ہو گیا. لہٰذا اب کسی شخص کو (خواہ اسے کتنا ہی مقرّبِ بارگاہِ خداوندی کیوں نہ سمجھ لیا جائے) غیب کا علم حاصل نہیں ہو سکتا. جو اس کا دعوےٰ کرتا ہے وہ درحقیقت نبوّت (خدا سے وحی پانے) کا دعوےٰ کرتا ہے، خواہ وہ اس کا نام کشف، الہام، محدّثیت، بشارات وغیرہ کچھ ہی کیوں نہ رکھ لے. جو اس کا عقیدہ رکھتا ہے کہ فلاں بزرگ کو غیب کا علم حاصل ہے، وہ ختمِ نبوّت کے بعد اجرائے نبوّت کا قائل ہے جو قرآن کی کھلی ہوئی مخالفت ہے. انسان کی تو یہ حالت ہے کہ وہ یقینی طور پر اتنا بھی نہیں کہہ سکتا کہ فلاں معاملہ کا انجام اس کے حق میں مُفید ہو گا یا مضر. چنانچہ اس ضمن میں قرآن میں ہے.

وَ عَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ عَسٰۤى
اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ

وَ اَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ع (۲/۲۱۶)۔

"ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ تمہیں ایک چیز ناپسند ہو اور وہی چیز تمہارے حق میں بہتر ہو اور ایک چیز کو تم پسند کرتے ہو، وہ تمہارے لئے نقصان رساں ہو۔ اللہ جانتا ہے (کہ کونسی چیز تمہارے لئے انجام کار اچھی اور کونسی بری ہے)۔ تم نہیں جانتے۔"

یہ اس لئے کہ انسان کو علمِ الٰہی کے مقابلہ میں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

وَ مَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۱۷/۸۵﴾

اور تمہیں جو علم دیا گیا ہے، وہ بہت تھوڑا ہے۔

اس مقام پر ایک اور حقیقت کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ یہ سلسلۂ کائنات، خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق چل رہا ہے۔ ان میں سے ایک حصہ ان قوانین کا ہے جنھیں قوانینِ فطرت (LAWS OF NATURE) کہا جاتا ہے۔ انسان ان قوانین کا علم حاصل کر سکتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ

(۱) اگر کوئی بات کسی خاص قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتی ہو۔ اور

(۲) ایک شخص کو اس قانون کا علم ہو۔

تو وہ قبل از وقت بتا سکتا ہے کہ فلاں بات کیسے واقع ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اسے غیب کا علم نہیں کہا جا سکتا۔ اسے قانون کا علم کہا جائے گا۔ مثلاً سورج، چاند اور زمین کی گردش کے متعلق قوانین کے ماہرین، سینکڑوں سال پہلے بتا دیتے ہیں کہ سورج، چاند یا زمین کو کب گہن لگے گا۔ وہ کتنا بڑا ہوگا اور کتنے عرصہ تک رہے گا۔ اور ان کی اس "پیش گوئی" میں ذرا سا بھی فرق نہیں آتا۔ اسے علمِ غیب نہیں کہا جائے گا، اجرامِ فلکی سے متعلق قوانین کے علم کا نتیجہ کہا جائیگا۔

لیکن اس قسم کی "پیش گوئی" ان اشیائے کائنات کے متعلق کی جا سکے گی جنہیں کسی قسم کا اختیار و ارادہ نہیں دیا گیا۔ کسی ذی اختیار شے کے متعلق اس قسم کی بات کبھی نہیں کہی جا سکے گی۔ مثلاً ایک سائنسدان یہ بتا دیگا کہ سورج کو گہن کب لگے گا لیکن اگر اس قسم کے دس سائنسدان بھی جمع ہوں تو وہ یہ نہیں بتا سکیں گے کہ ان کے سامنے میز پر بیٹھی ہوئی مکھی اڑ کر دوبارہ کہاں بیٹھے گی۔

اور جب وہ ایک مکھی کے مستقبل کے متعلق اتنی سی بات بھی نہیں بتا سکیں گے تو انسان جیسے صاحبِ

اختیار وارادہ کے مستقبل کے متعلق کون کچھ بتا سکتا ہے؟ یہی وہ حقیقت ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ

تیرے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے تُو تابعِ ستارہ نہیں

اس کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں ہو سکتا۔

لیکن قرآن میں بعض مقامات پر اسلوبِ بیان اس قسم کا اختیار کیا گیا ہے جس سے ایک سطح بین انسان کے دل میں یہ شبہ گزر سکتا ہے کہ خدا کو حقیقتِ حال کا (معاذ اللہ) علم نہیں ہوتا۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں یہ کہا گیا ہے کہ ہم نے ایسا اس لئے کیا ہے لِنَعْلَمَ۔ تاکہ ہم جان لیں کہ تم میں سے کون کیسا ہے۔

اسی قبیل سے وہ اندازِ بیان ہے جس میں کہا جاتا ہے کہ ہم نے ایسا اس لئے کیا ہے لِنَبْلُوَكُمْ (جس کا عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے) تاکہ ہم تمہیں آزمائیں۔ اس سے بھی یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ کو حقیقتِ حال کا علم نہیں جو وہ انسان کو آزمانا چاہتا ہے؟

یہ درحقیقت ایک دوسرا انداز ہے یہ کہنے کا کہ "اللہ نے ایسا اس لئے کیا تاکہ یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجائے کہ تمہارا ردِّعمل کیا ہوتا ہے۔ تمہارے اندر کس قدر قوت آچکی ہے۔ تمہاری صلاحیتوں میں کس قدر نشوونما ہو چکی ہے۔ تمہاری ذات کی کس قدر نمو ہو چکی ہے۔" "ابتلاء" کے معنی ہیں کسی چیز کی اصلی حالت کو ظاہر کرنا۔ انسانی زندگی کا مقصود یہ ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما ہو جائے۔ دنیا میں مختلف موانع انسان کے سامنے آتے ہیں۔ ان مقامات پر انسان دیکھ سکتا ہے کہ اس کی ذات کی کس حد تک نشوونما پا چکی ہے۔ جس حد تک نشوونما ہو چکی ہو گی اسی حد تک وہ ان موانع کا مقابلہ کر سکے گا۔ اسی کو قرآن نے کہیں لِنَعْلَمَ اور کہیں لِنَبْلُوَنَّكُمْ وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ ان الفاظ کا صحیح مفہوم ہے "تاکہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ ...." اس سے بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ "آزمائش" سے مراد یہ نہیں کہ خدا کو ان کے اعمال کا علم نہیں وہ تو ان کے اعمال کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ حقیقت اُن پر اور دوسروں پر واضح ہو جائے کہ اُن میں کس قدر قوت اور استقامت ہے۔

لِنَعْلَمَ کا مفہوم تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ اللہ تعالیٰ حاضر و غائب کا علم رکھتا ہے وہ دل کی گہرائیوں میں گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہے۔

اس کائنات میں کوئی ذرہ ایسا نہیں جس کا اسے پورا پورا علم نہ ہو۔ لہٰذا جن آیات میں لِنَعْلَمَ وغیرہ الفاظ آتے ہیں ان سے یہ مُراد نہیں کہ اس طرح خدا ان امور کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ان سے مقصود حقیقت کو واضح اور ظاہر کر دینا ہوتا ہے۔ مثلاً سورۂ سبا میں ہے۔

وَ مَا كَانَ لَهٗ عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِيْ شَكٍّ ؕ وَ رَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ۠ (۳۴/۲۱)۔

"اور (ابلیس کا) ان لوگوں پر غلبہ بجز اس کے اور کسی وجہ سے نہیں کہ ہم ظاہر کردیں کہ کون آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور کون اس کی بابت شک میں ہے اور اللہ ہر شے کا نگران ہے"۔

"لِنَعْلَمَ" کے معنی ہیں تاکہ ہم تمیز کر دیں، الگ الگ کر کے بتا دیں۔ یہ حقیقت واضح ہو جائے "کہ کون آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور کون شک کرتا ہے۔ ان معانی کے بعد مطلب بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ تحویلِ قبلہ کا حکم دیا تو اس کی غرض یہ بیان فرمائی۔

وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَاۤ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ ...... (۲/۱۴۳)

"اور جس قبلہ پر تم ہو اُسے ہم نے قبلہ اس لئے بنایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ کون لوگ رسولؐ کی پیروی میں سچے ہیں اور کون لوگ اُلٹے پاؤں پھر جانے والے ہیں"۔

ظلم و استبداد کی روک تھام اور حکومتِ خداوندی کے قیام کے لئے مسلمانوں کو جو لڑائیاں لڑنی پڑیں اُن کے ضمن میں کہا کہ اگر تمہیں کہیں شکست بھی ہو جائے تو گھبرانے کی بات نہیں۔

وَ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ يَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ (۳/۱۴۰)

"یہ تو (ہار جیت کے) حوادث ہیں جنہیں ہم گردش دیتے رہتے ہیں (اور یہ شکست) اس لئے تھی تاکہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ کون (سچا) ایمان رکھنے والا ہے اور اس لئے (بھی کہ تم میں

سے ایک گروہ کو (نتائج اعمال کا) شاہد بنا دے"۔

سورۂ توبہ میں ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَ لَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لَا رَسُوْلِهٖ وَ لَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ؕ وَ اللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ (۹/۱۶)۔

"کیا تم نے سمجھا ہے کہ تم (یونہی) چھوڑ دیئے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے ان لوگوں کی اصلی حالت کو واضح کرنے کے مواقع ہی نہیں بہم پہنچائے جو تم میں سے جہاد کریں گے اور اللہ اس کے رسول اور مومنین کو چھوڑ کر کسی کو اپنا پوشیدہ دوست نہیں بنائیں گے اور اللہ کو تمہارے تمام اعمال کی پوری پوری خبر ہے"۔

آیت کا آخری ٹکڑا واضح طور پر بتا رہا ہے کہ ان مواقع کے بہم پہنچانے سے مقصود ان لوگوں کی پختگی ایمان کا اظہار ہے، ورنہ اللہ کو کس بات کا علم نہیں؟ سورۂ محمدؐ کی ایک آیت میں اس حقیقت کو اور بھی واضح فرما دیا۔

وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَ الصّٰبِرِيْنَ ۙ وَ نَبْلُوَا اَخْبَارَكُمْ ۝ (۴۷/۳۱)۔

"اور ہم ضرور ایسے مواقع پیدا کریں گے جن سے یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ تم سے مجاہدین اور ثابت قدم کون ہیں اور ہم ضرور تمہاری اصلی حالت کو ظاہر کر دیں گے"۔

اس سے ماسبق آیت میں ہے وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ ۝ اور اللہ کو تمہارے اعمال کا پورا پورا علم ہے۔ سورۂ حدید میں ہے، ہم نے رسولؐ اور کتابیں اور ان کے ساتھ شمشیرِ خارا شگاف اس لئے نازل کی ہے کہ

لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ .... (۵۷/۲۵)

"تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ اللہ اور اس کے رسولوں کی کون بالغیب مدد کرتا ہے"۔

اس سے منافقین کی منافقت کھل جاتی ہے۔ مومن اور منافق میں تفریق و تمیز ہو جاتی ہے (۳/۱۶۵-۱۶۶)، سچے اور جھوٹے کی پہچان ہو جاتی ہے (۲۹/۳-۱۱)۔ یہی مقصد، حدود اللہ کے تعین اور حرام و حلال

کی تفریق سے ہے۔ (۵/۹۴)۔

اس سے ظاہر ہے کہ ان آیات میں اس ٹکڑے کا حقیقی مفہوم کیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ معلوم کرلے کہ تم میں سے کون کیسا ہے"۔ اس کی وضاحت سورۂ انفال کی اس آیت میں ملے گی جہاں جنگ کے قیدیوں کے متعلق کہا کہ اگر تم نے اپنی روش سے ثابت کر دیا کہ تم آمادہ بہ فساد نہیں بلکہ امن و صُلح کے متمنّی ہو تو تمہیں کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا، بلکہ تمہیں بہت کچھ ملے گا۔

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِمَنْ فِي أَيْدِيكُمْ مِنَ الْأَسْرَىٰ إِنْ يَعْلَمِ اللَّهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِمَّا أُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ...... (۸/۷۰)۔

"اے رسول! لڑائی کے قیدیوں میں سے جو لوگ تمہارے قبضہ میں ہیں، ان سے کہہ دو کہ اگر اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں کچھ نیکی پائی تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے، اس سے کہیں بہتر چیز تمہیں عطا فرمائے گا اور تمہاری حفاظت کا سامان کر دیگا۔"

یہاں بھی مقصود یہی کہنا ہے کہ اگر تم نے اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دیا کہ تمہاری نیّت نیک ہے، تو تمہیں ہر طرح کی حفاظت اور آسائش مل جائے گی۔ ورنہ اللہ کو تو سب کچھ معلوم ہوتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ کون کس چیز کو دل میں جگہ دیئے ہوئے ہے۔ (قَدْ يَعْلَمُ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ (۲۴/۶۴)۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کون تکذیب کرنے والے ہیں (۶۹/۴۹)۔ اُسے علم ہے کہ مُفسِد کون ہے اور مُصلِح کون (۲/۲۲۰)۔ اُسے خبر ہے کہ ہدایت پر کون ہے اور گمراہ کون (۶/۱۱۸ و ۶۸/۷ نیز ۳۰ — ۵۳/۳۲)۔

علیم و خبیر و بصیر و سمیع

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، علمِ الٰہی پر ایمان، ہمارے اعمال پر بڑا گہرا اثر ڈالتا ہے۔ اللہ ان باتوں کا بھی علم رکھتا ہے جن کے متعلق ہمیں یقین ہو کہ دنیا میں ہمارے سوا ان سے کوئی اور واقف نہیں، اس لئے کہ وہ عَلِیْم ہے۔ وہ ہمارے ان اعمال و احوال سے بھی باخبر ہے جن کی ہم کسی کو خبر نہ کریں، اس لئے کہ وہ خبیر ہے۔ وہ ہمیں اس وقت بھی دیکھتا ہے جس وقت ہم سمجھ رہے ہوں کہ ہمیں کوئی نہیں دیکھتا، اس لئے کہ وہ بصیر ہے۔ وہ ہماری ان خفیہ سرگوشیوں کو بھی سُنتا ہے جن کے متعلق ہمیں اطمینان ہو کہ انہیں کوئی نہیں سنتا، اس لئے کہ وہ سمیع ہے۔ ہم جہاں

کہیں بھی ہوں وہ ہمارے ساتھ ہے۔ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۵۷/۴) "وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو اور اللہ تعالےٰ تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے" کہ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ (۲/۱۹۷) جو نیکی تم کرتے ہو اللہ اس سے واقف ہوتا ہے اور جو کچھ تم اس کی راہ میں صرف کرو خفیہ یا اعلانیہ اسے اس کا پورا پورا علم ہوتا ہے (۲/۲۷۰ ؛ ۲/۲۷۳ ؛ ۳/۹۲ ؛ ۲/۲۱۵)۔ صرف نیک اعمال ہی نہیں، وہ ہر قسم کے عمل سے واقف ہے۔ وہ کسی عمل سے بھی بے خبر نہیں۔ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ (۲/۸۵ ؛ ۲/۸/۳۵ ؛ ۲/۹۵ ؛ ۱۶/۹۱ ؛ ۴۲/۲۵ ؛ ۴۲/۱۳ ؛ ۲۹/۴۵ ؛ ۳۰/۴۷)۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالےٰ کے عَلِيْم ہونے کا ذکر بار بار آیا ہے۔ کم و بیش ۱۶۱ مقامات پر اس کا تذکرہ ہے۔ اسی طرح اس کے بصیر ہونے کے متعلق بھی متعدد مقامات پر ذکر آیا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ (۲/۲۳۳ ؛ ۲/۹۶ ؛ ۲/۲۳۷ ؛ ۲/۲۶۵ ؛ ۳/۱۶۲ ؛ ۱۱/۱۱۲ ؛ ۴۱/۴۰ ؛ ۴۹/۱۸ ؛ ۵۷/۴)

اللہ سب کچھ دیکھتا ہے

انسان کی یہ غلط اندیشی ہے جو سمجھتا ہے کہ اسے کوئی نہیں دیکھتا۔ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗۤ اَحَدٌ ۝ (۹۰/۷)۔ کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسے کوئی دیکھ نہیں رہا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝ (۳/۱۹)۔ اللہ اپنے تمام بندوں کو دیکھتا ہے۔ اس حقیقت کا اظہار کم و بیش چالیس مقامات پر کیا گیا ہے۔ اسی حقیقت کو کہیں لفظ خبیر سے تعبیر فرمایا ہے۔ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ (۲/۲۳۴ ؛ ۲/۲۷۱ ؛ ۳/۱۵۲ ؛ ۱۱/۱۱۱ ؛ ۲۷/۸۸ ؛ ۵۸/۱۳)۔ اس کا قریباً ۳۶ مرتبہ اعادہ ہوا ہے۔

سب کچھ سنتا ہے

پھر جس طرح وہ ہر شے کو دیکھتا ہے، وہ ہر بات کو سنتا بھی ہے خواہ وہ کیسی ہی تنہائی میں کیوں نہ کی جائے۔

قُلْ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ؗ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ (۲۱/۴)۔

"کہہ دو کہ زمین و آسمان میں جو بات بھی ہو اللہ اسے جانتا ہے کہ وہ سننے والا جاننے والا ہے۔"

وہ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝ (۵۸/۱ ؛ ۲۲/۶۱)۔ اس کا کم از کم بیالیس مرتبہ اعادہ ہوا ہے۔

جب اللہ تعالےٰ کے علم کی وسعت کا یہ عالم ہو تو اس سے کون سی بات چھپائی جا سکتی ہے؟ جہاں

مکافاتِ عمل

تک انسان کا تعلق ہے اللہ کے علیم و خبیر، سمیع و بصیر ہونے سے مطلب یہ ہے کہ مکافاتِ عمل میں کسی قسم کا سہو یا فروگذاشت نہیں ہو سکتی۔ ہر اچھے اور بُرے عمل کا نتیجہ (خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو) انسان کے سامنے آ جائے گا۔

کوئی عمل بغیر بدلے کے نہیں رہ سکتا

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (۷ — ۹۹/۸)

"جس نے ایک رائی کے دانہ کے برابر عملِ خیر کیا ہوگا، وہ بھی اس کے سامنے آجائے گا اور جس نے ایسا ہی کوئی بُرا کام کیا ہوگا، اسے بھی وہ موجود پائے گا۔"

یہ ہے (خدا کی) مکمل ترین ذات کے علم کی حقیقت اور کیفیت۔ جس طرح وہ ذات لامتناہی ہے، اسی طرح اس کا علم لامتناہی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو انسان اپنی ذات کی نشوونما، صفاتِ خداوندی کے معیار کے مطابق کرے گا، اس کا علم بھی اس کی ذات کی نمود کے ساتھ بڑھتا جائے گا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن نے مومنین کو اربابِ علم و بصیرت اور صاحبانِ فکر و نظر بتایا ہے۔ دوسری طرف اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ جو لوگ علم و دانش سے کام نہیں لیتے وہ اہلِ جہنم ہیں۔ وہ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ بدترین مخلوق ہیں (۸/۲۲)۔ اس لئے کہ انسان اور حیوان میں بنیادی فرق ذات ہی کا تو ہے۔ سو جن انسانوں کی ذات خوابیدہ اور غیر نشوونما یافتہ رہ جائے، وہ انسانی سطح پر آتے ہی نہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ جو معاشرہ نظامِ خداوندی کے قیام کا ضامن ہوگا، وہ کس قدر علیم و بصیر و سمیع و خبیر ہوگا۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کی طرف دشتِ شام میں رہنے والی اس بڑھیا نے حضرت عمرؓ کی توجہ دلائی تھی جب ان کے اس سوال کے جواب میں کہ کیا تم نے اپنی پریشانیوں کی خبر خلیفہ تک پہنچائی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ اگر خلیفہ اپنی مملکت کے ہر فرد کے حالات سے باخبر رہنے کا انتظام نہیں کر سکتا تو اسے خدائے خبیر کے نام پر حکومت قائم کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

خلیفہ (یا امیر المؤمنین) سے مُراد ہے جماعتِ مومنین کا وہ فرد جس کی ذات کی نمود سب سے

زیادہ ہو چکی ہو۔ خود جماعتِ مومنین ان افراد پر مشتمل ہوتی ہے جو "صفاتِ خداوندی کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں،" یعنی (علیٰ حدِ بشریّت) علیم، خبیر، سمیع، بصیر۔

۱۸

قُدرت

قَ دَ رَ کے معنی اندازہ کرنے کے ہیں۔ اندازہ اور پیمانہ کو اصطلاحِ عام میں قاعدہ اور قانون کہا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کائنات کا نظم و نسق ان قوانین کے مطابق سرانجام پا رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیئے ہیں۔ قانون کسی محسوس قوت کا نام نہیں ہوتا۔ یہ ایک اصول یا فارمولا ہوتا ہے جس کے مطابق ایک اسکیم عمل پیرا اور نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی قانون یا اصول کو نتیجہ خیز بنانے کے لئے قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر قانون کے پیچھے قوتِ نافذہ نہ ہو تو وہ قانون کچھ معنی نہیں رکھتا۔ کائنات میں جس حُسن و خوبی سے قوانینِ خداوندی کارفرما ہیں اس سے ظاہر ہے کہ ان کے پیچھے جو قوت کام کر رہی ہے وہ مکمل اور عظیم ہے۔ اس قوتِ خداوندی کو کہیں قوت اور کہیں قُدرت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لفظ قُدرت اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ قوتِ خداوندی (معاذ اللہ) کسی مستبد ڈکیٹر کی قوت نہیں جو اندھا دھند کام کرتی ہے، بلکہ ایک حکیمِ مطلق کی قوت ہے جو اس کے قوانین کے نتیجہ خیز ہونے میں صرف ہوتی ہے۔

سورۃ ذاریات میں ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّۃِ الْمَتِیْنُ ○ (۵۱/۵۸)

”یقیناً اللہ سب کو رزق پہنچانے والا، قوت والا، استوار ہے۔“

اسی لئے فرمایا کہ اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک مت ٹھہراؤ، کیونکہ جب ہر قسم کی قوت اسی کو حاصل ہے تو

کوئی اس کا شریک وسہیم کیسے ہو سکتا ہے؟

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَ لَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ۝ (۲/۱۶۵)۔

"اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو خدا کے علاوہ اوروں کو بھی (شریکِ) خدائی قرار دیتے ہیں اور ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے رکھنی چاہیئے۔ حالانکہ جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں ان کے دلوں میں سب سے زیادہ محبت اللہ ہی کی ہوتی ہے[1]۔ جو بات ان ظالموں کو اس وقت سوجھے گی جب عذاب ان کے سامنے آجائے گا، کاش اس وقت سوجھتی۔ اُس وقت یہ دیکھیں گے کہ قوت، صرف اللہ ہی کو ہے اور (اس کے قوانین سے سرتابی کرنیوالوں کے لئے) اس کا عذاب بڑا ہی سخت ہے"۔

یہاں کہا ہے کہ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا قوت سب کی سب اللہ ہی کے لئے ہے۔ سورۂ کہف میں کہا کہ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ (۱۸/۳۹)۔

قادرِ مطلق

دوسرے مقامات میں قَادِرٌ کا لفظ آیا ہے۔ مثلاً:

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ...... (۱۷/۹۹)۔

"کیا ان لوگوں نے (جو حیاتِ اُخروی کے منکر ہیں ۱۷/۹۸) اس بات پر غور نہیں کیا کہ جس اللہ نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کر دیا ضرور اس پر قادر ہے کہ ان کی مثل اور بھی پیدا کر دے (انسانوں کی مثل یا ارض و سمٰوٰت کی مثل یا موجودہ زندگی کی مثل دوسری زندگی)"۔

سورۂ یٰسین میں ہے۔

اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ

---

[1] یہاں محبت کے معنی اطاعت کے ہیں۔

يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ؕ بَلٰی ق وَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ۝ (۳۶/۸۱)

"کیا وہ (اللہ) جس نے زمین و آسمان پیدا کئے ہیں اس پر قادر نہیں ہے کہ ان کی مثل (دوبارہ) پیدا کردے۔ ضرور وہ قادر ہے اور وہ تخلیق کی بہت بڑی قوتوں کا مالک اور (ہر شے کا) جاننے والا ہے۔"

اس لئے کہ وہ زمین و آسمان کی تخلیق کے بعد تھک نہیں گیا کہ ان چیزوں کو دوبارہ پیدا نہیں کرسکتا یا مرنے کے بعد انسانوں کو دوبارہ زندہ نہیں کرسکتا۔

اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ؕ بَلٰۤى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (۴۶/۳۳)۔

"کیا ان لوگوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ جس اللہ نے زمین اور آسمان کو پیدا کیا اور ان کی تخلیق سے وہ ذرا نہیں تھکا، وہ اس پر قدرت رکھتا ہے کہ مُردوں کو زندہ کردے۔ کیوں نہ ہو؟ بے شک وہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

نشاۃِ ثانیہ کی قدرت

جو قادرِ مطلق سلسلۂ کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے، اس کے لئے اس کی نشاۃِ ثانیہ کیا مشکل ہے؟ اسے ہر بات پر قدرت حاصل ہے۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (۲۹/۲۰)۔

"(اے رسول! ان سے) کہو کہ زمین پر چلو پھرو اور دیکھو کہ اللہ نے مخلوق کو کس طور پر اوّل بار پیدا کیا۔ پھر اللہ ان کو دوسری بار بھی پیدا کردیگا۔ یقیناً وہ ہر شے پر قادر ہے۔"

سورۃ قیامۃ میں ہے کہ جس اللہ نے انسان کو حقیر سی شے سے پیدا کردیا۔

اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ۝ (۷۵/۴۰)۔

"کیا وہ اس بات پر قدرت نہیں رکھتا کہ مُردوں کو زندہ کردے؟"

سورۂ طارق میں ہے کہ اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ؕ (۸۶/۸) یقیناً خدا اس پر قادر ہے کہ انسان کو دوبارہ پیدا کر دے۔ ایسا قادر کہ وہ چاہے تو جسمِ انسانی کا ایک ایک ذرہ پھر سے واپس آجائے۔ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ۝ (۷۵/۴) "یقیناً ہم اس پر قادر ہیں کہ انسان کی انگلیوں کی پوری تک (پھر سے) درست کر دیں۔" وہ چاہے تو نوعِ انسانی کو سطحِ ارض سے معدوم کر کے ان کی جگہ کسی دوسری مخلوق کو لے آئے۔

جدید مخلوق کی قدرت

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَ يَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ۝ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ۝ (۴/۱۳۳)۔

"اگر اللہ چاہے تو اے نوعِ انسانی! تم سب کو لے جائے اور تمہاری جگہ دوسروں کو لے آئے۔ اور اللہ اس پر پوری قدرت رکھتا ہے۔"

الوہیتِ مسیحؑ کے عقیدہ کے ابطال کے بعد فرمایا۔

قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (۵/۱۷)۔

"کہئے کہ اگر خدا مسیح ابنِ مریم کو اور اس کی ماں کو اور (اتنا ہی نہیں بلکہ) روئے زمین پر جتنے انسان بستے ہیں سب کو ہلاک کر دینا چاہے تو کس کی طاقت ہے کہ اس سے کسی کو بچا لے۔ آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کی حکومت اللہ ہی کے لئے ہے۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے اپنی مشیت کے مطابق پیدا کرتا ہے اور اللہ تمام چیزوں پر قادر ہے۔"

سرچشمۂ حیات پر قبضہ

اور یہ نہایت آسان ہے۔ دُور نہ جایئے۔ ایک پانی کو لیجئے جس پر حیات کا اس قدر دارومدار ہے۔ اگر وہ پانی کی ہیئت و خاصیت کو تبدیل کر دے یا اس کا موجودہ نظام بدل دے تو دیکھئے کس طرح زندگی کی جگہ ہر مقام پر موت طاری ہو جاتی ہے!

وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِی الْاَرْضِ ۖ
وَ اِنَّا عَلٰی ذَهَابٍۭ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ۝ (۲۳/۱۸)

"اور ہم نے ایک خاص انداز کے ساتھ آسمان سے پانی برسایا اور اسے زمین میں (حسبِ ضرورت) ٹھہرائے رکھا اور ہم اسے لے جانے پر بھی قادر ہیں۔"

اس لئے کہ زمین و آسمان کا انتظام اس کے امر کے تابع سرانجام پا رہا ہے۔ قوانینِ فطرت اس کی مشیّت کے مظاہر ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ...... (۶۵/۱۲)

"اللہ وہ ہے جس نے متعدد فضائی کرّے پیدا کئے اور ان کی مثل ارض بھی اور ان کے درمیان اس کا امر نازل ہوتا رہتا ہے۔ (اس کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے) تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے۔"

تبدیلیٔ اقوام پر اختیار جس طرح اس کا قانونِ حیات مظاہرِ فطرت میں جاری و ساری ہے، اقوامِ ملل پر بھی اس قسم کے قوانین کارفرما ہیں۔ قوموں کا عروج و زوال، ان کی حیات و ممات، ان کا استخلاف و استبدال انہی قوانین کے مطابق عمل میں آتا رہتا ہے۔

...... اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ۙ عَلٰۤی اَنْ نُّبَدِّلَ خَیْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَ مَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِیْنَ ۝ (۷۰/۴۰—۴۱)

"ہم اس پر قادر ہیں کہ ان کی جگہ ان سے بہتر لوگوں کو لے آئیں اور ہم ایسا کرنے سے عاجز نہیں ہیں۔"

جن قوانین کے مطابق یہ کچھ ہوتا ہے، چونکہ وہ خدا کی مشیّت کے مطابق مرتب ہوئے ہیں، اس لئے دوسرے مقام پر ہے کہ حکومت کا ملنا یا چھننا، خدا کی مشیّت پر موقوف ہے، یعنی یہ کچھ اُن قوانین کی رُو سے ہوتا ہے جو اُس نے اپنی مشیّت کے مطابق بنائے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۫ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ

بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (۳/۲۶)۔

"بارِ الٰہا! کائنات کی سروری اور جہانداری کا تو ہی مالک ہے۔ حکومت کا ملنا اور چھننا، عزت حاصل ہونا یا ذلت ملنا' سب تیرے قانونِ مشیّت کے مطابق ہوتا ہے۔ ہر قسم کے اختیارات کا سررشتہ تیرے ہاتھ میں ہے۔ تیری قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں۔"

جو قوم اس کے متعین کردہ قوانین کی خلاف ورزی کرتی ہے' وہ اس پر قدرت رکھتا ہے کہ اپنے قانونِ مکافات عمل کی رُو سے اس قوم پر "اوپر اور نیچے" سے عذاب نازل کردے۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ (۶/۶۵)۔

"کہئے کہ وہ اس پر قادر ہے کہ تم پر اُوپر سے کوئی عذاب بھیجدے یا تمہارے پیروں تلے سے کوئی عذاب پیدا کردے۔"

اسی قسم کی تباہی اور بربادی کا عذاب تھا جو مخالفینِ اسلام (قریشِ مکہ) پر نبیٔ اکرمؐ اور آپؐ کی جماعتؓ کے ہاتھوں نازل ہوا۔ اس کے متعلق حضورؐ سے کہا گیا تھا کہ

وَ اِنَّا عَلٰٓى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ۝ (۲۳/۹۵ نیز ۴۳/۴۲)

"اور ہم اس پر قادر ہیں کہ جن جن باتوں کا ان سے وعدہ کیا ہے انہیں (تیری زندگی میں ہی) تجھے دکھا دیں۔"

یہی وہ "آیتِ الٰہی" (خدا کی نشانی) تھی جس کے لئے وہ لوگ اس درجہ مضطرب و پریشان ہو رہے تھے۔

وَ قَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۶/۳۷)۔

"اور یہ کہتے ہیں کہ اس پر اس کے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی۔ کہہ دو، خدا یقیناً اس پر قادر ہے کہ نشانی اتار دے، لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت سے) واقف نہیں ہیں۔"

قوموں کی موت اور حیات کا یہی قانون ہے۔ اسی قانونِ تکذیبِ آیاتِ خداوندی کے ماتحت اممِ سابقہ

کی ہلاکت ہوئی اور اسی کے ماتحت آج بھی اقوامِ عالم کے مقدرات کے ستارے بنتے اور بگڑتے ہیں۔

خدائے مقتدر

اس قانون کے مطابق جب کسی قوم پر اس کے اعمالِ حیات کے نتائج دعواقب مسلط ہوتے ہیں، تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے ان کے اثرات سے بچا نہیں سکتی، اس لئے کہ اللہ کی گرفت ایک صاحبِ قدرت و سطوت کی گرفت ہوتی ہے، کمزور و ناتواں کی گرفت نہیں ہوتی جس سے کوئی چھوٹ جائے۔

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ ۝ (۵۴/۴۲)

"انہوں نے ہماری تمام نشانیوں کو جھٹلایا۔ سو ہم نے ان کو زبردست قدرت والے کی گرفت (کے انداز) سے پکڑا۔"

مکذبین کے مقابلہ میں متقین کے لئے اسی خدائے مقتدر کی رحمتوں کی نوازشات ہیں۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ ۝ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ۝ (۵۴—۵۵/۵۴)۔

"یقیناً متقی لوگ باغات و انہار میں ہوں گے، شاہنشاہِ صاحبِ قدرت کے ہاں ایک عمدہ مقام میں۔"

اس لئے انعام و اکرام کا ملنا یا ان کا چھن جانا سب اسی خدائے قادر و مقتدر کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ۝ (۱۸/۴۵) "اللہ تعالیٰ ہر ایک شے پر قدرت رکھتا ہے۔"

اٰلآء کا صحیح مفہوم

قرآنِ کریم میں اللہ تعالےٰ کے عجائباتِ قدرت کے لئے لفظ آلآء بھی آیا ہے، جس کا ترجمہ بالعموم "نعمت" کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سورۃ الرحمٰن میں فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ کا ترجمہ عام طور پر یہی ملے گا کہ "تم اپنے ربّ کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے"۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ لفظ نعماء کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے لیکن عربی زبان میں آلآء بمعنی قدرت بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ ابنِ جریر طبری نے اس کے معنی قدرت لکھے ہیں۔ (تفسیر ابنِ جریر جلد ۲۷) اور امام رازی نے جنوں کی پیدائشِ نار کی آیت کے متعلق لکھا ہے کہ ان الاٰدیۃ

مذکورۃ لبیان القدرۃ لا لبیان النعمۃ (تفسیر کبیر، جلد ۵) چنانچہ سورۃ الرحمٰن کے علاوہ بھی قرآنِ کریم میں جہاں یہ لفظ آیا ہے اس کے معنی نعمت کے بجائے قدرت زیادہ موزوں معلوم ہوتے ہیں۔

آلاء بمعنی قدرت

سورۃ اعراف میں جہاں حضرت ہودؑ نے اپنی قوم سے کہا ہے کہ اللہ نے انہیں قومِ نوحؑ کے بعد جانشین بنایا اور ان کی نسل کو توانائی اور وسعت عطا فرمائی، اس کے بعد ہے فَاذْكُرُوٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ (۷/۶۹) (تم اللہ کی ان قدرتوں سے غافل نہ ہو تاکہ تم کامیاب ہو) اس سے ذرا آگے حضرت صالحؑ نے جب اپنی قوم سے فرمایا کہ وہ وقت یاد کرو کہ اللہ نے تمہیں قومِ عاد کے بعد ان کا جانشین بنایا اور اس سرزمین میں اس طرح بسا دیا کہ تم میدانوں میں محلات تعمیر کرتے ہو اور پہاڑوں کو تراش کر ان میں قلعے بناتے ہو، تو اس کے بعد بھی فرمایا کہ فَاذْكُرُوٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ (۷/۷۴) سورۃ النجم میں اُمم سابقہ کی بربادی و تباہی کے تذکرہ کے ضمن میں فرمایا کہ اللہ نے ان کی سطحِ ارض سے ابھری ہوئی بستیوں کو اُلٹ دیا اور ان بستیوں کو اس کے عذاب نے گھیر لیا۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ○ هٰذَا نَذِیْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى ○ (۵۵ — ۵۶/۵۳)

○ سو تو اپنے رب کی کون کون سی قدرت میں شک کرے گا۔ یہ پیغمبر بھی پہلے پیغمبروں کی طرح (مکافاتِ عمل سے) ڈرانے والا ہے!

ان آیات سے بھی واضح ہے کہ یہاں قدرتِ خداوندی کے اظہار کا موقع ہے نہ کہ نعمتِ الٰہی کے تذکار کا۔

تصریحاتِ بالا سے ہم نے دیکھ لیا کہ ایک مکمل ذات کو مکمل قوت حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا جس قدر (انسانی) ذات کی نشوونما ہوتی جائے گی، اسی قدر اس کی قوتوں میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ ذات کی نمود قوت سے ہوتی ہے، لیکن اس کی یہ قوتیں آندھی کا جھکڑ یا سمندر کا طوفان نہیں ہوتیں جو اندھا دھند تخریب کرتی چلی جائیں۔ یہ قوتیں، قانون اور قاعدے کے ساحلوں میں محصور رہتی اور تعمیرِ انسانیت کے لئے صرف ہوتی ہیں۔ مجرمین کو ان کے جرائم کی سزا دینا بھی تعمیرِ انسانیت ہی کا ایک گوشہ ہے۔ اس لئے کہ اگر دنیا میں تخریبی قوتوں کی روک تھام نہ کی جائے تو تعمیر ناممکن ہو جاتی ہے۔ قرآن ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل چاہتا ہے جس میں تمام افراد کی ذات

کی نشوونما ہورہی ہو اور ان کی قوتیں نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے صرف ہوں۔ انہی کو وہ اُمَّۃً وَّسَطًا اور خَیْرُ اُمَّۃٍ کہہ کر پکارتا ہے۔ اسی امت کے نہ ہونے سے آج دنیا جہنم بن رہی ہے۔

تقدیر

لفظ تقدیر کا مادہ بھی (ق۔ د۔ ر) ہے جس سے لفظ قدرت بنا ہے۔ اس اعتبار سے میں نے' اس کتاب کے پہلے ایڈیشن میں ایک باب تقدیر سے متعلق بھی شامل کیا تھا۔ بعد میں میں نے محسوس کیا کہ تقدیر کا موضوع ایسا وسیع اور مسئلہ اس قدر پیچیدہ ہے کہ کسی کتاب میں ضمناً اس کی کماحقہ' وضاحت نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ چنانچہ میں نے مسئلہ تقدیر پر ایک مستقل کتاب لکھی جو "کتاب التقدیر" کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب کی موجودگی میں' اب اس کتاب میں اس باب کی ضرورت نہیں رہی جس کا تعلق مسئلہ تقدیر و مشیت سے تھا بنابریں زیرِ نظر ایڈیشن میں اسے حذف کر دیا گیا ہے۔ جو حضرات مسئلہ تقدیر سے دلچسپی رکھتے ہوں اور اسے بالوضاحت سمجھنا چاہتے ہوں' وہ اُس تصنیف (کتاب التقدیر) کی طرف رجوع فرمائیں۔

۱۹

عرش و کُرسی

لُغوی معنی خدا کے غلبہ و اختیار اور تسلّط و اقتدار کے مفہوم کی ادائیگی کے لئے قرآنِ کریم میں عرش کا لفظ بھی آیا ہے۔ عرش کے لفظی معنی چھت کے ہیں۔

فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَ هِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ بِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّ قَصْرٍ مَّشِيْدٍ ۝ (۲۲/۴۵)

"کتنی بستیاں ہیں کہ ہم نے انھیں ہلاک کر ڈالا (کیونکہ) وہ ظلم کرنے والی تھیں اور وہ ایسی اُجڑیں کہ اپنی چھتوں پر گر کر رہ گئیں۔ کنویں ناکارہ ہو گئے اور سربفلک عمارات کھنڈرات بن گئیں"۔

ہر بلند عمارت یا عمارات کی بلندی پر جو ٹٹیاں وغیرہ بنائی جائیں اُن کے لئے بھی یہ لفظ آتا ہے۔

وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا يَعْرِشُوْنَ ۝ (۱۶/۶۸)

"اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کی جبلّت میں یہ بات رکھ دی کہ وہ پہاڑوں میں، درختوں میں اور جو لوگ بلند عمارات بناتے ہیں اُن پر (یا ان ٹٹیوں میں جو اس غرض سے بلندی پر بنائی جاتی ہیں) اپنا گھر بنالے"۔

عام طور پر یہ لفظ تختِ حکومت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ حضرت یوسفؑ کے قصّہ میں ہے کہ

جب آپ کے ماں باپ تشریف لائے تو

وَ رَفَعَ اَبَوَیۡهِ عَلَى الۡعَرۡشِ (۱۲/۱۰۰)

"اس نے اپنے والدین کو تخت پر اونچا بٹھایا۔"

ملکۂ سبا کے تختِ حکومت کا تذکرہ قرآن میں ان الفاظ میں آیا ہے وَ لَهَا عَرۡشٌ عَظِیۡمٌ ٥ (۲۷/۲۳) " اور اس کے پاس ایک بہت بڑا تخت ہے۔" (۳۸-۴۱-۲۷/۴۱)۔ لہٰذا عرش کا لفظ غلبہ، اقتدار، حکومت وغیرہ کے لئے آتا ہے۔ دورِ حاضرہ میں اس کا مفہوم " کنٹرول" کے لفظ سے اچھی طرح ادا ہو سکتا ہے۔ "کنٹرول" میں یہ سب کچھ آجاتا ہے۔

دوسرا لفظ کرسی ہے۔ اس کے معنی اصل و بنیاد کے ہیں، لیکن یہ بھی غلبہ و اقتدار کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، نیز علم کے معنوں میں بھی۔ خدا کے قبضہ و اقتدار اور علم کی وسعتوں کے لئے یہ دونوں الفاظ آئے ہیں۔

عرشِ الٰہی سے مفہوم

مثلاً سورۂ مومنون میں ہے کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں یونہی بے کار، بلا مقصد پیدا کر رکھا ہے۔ اس کے بعد ہے:۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الۡمَلِكُ الۡحَقُّ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡكَرِیۡمِ ٥ (۲۳/۱۱۶)۔

" اللہ کہ بادشاہِ حقیقی ہے (ایسی بات کرنے سے) بہت بلند ہے۔ اس کی ذات کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ وہ (جہانداری کے) تختِ عزت کا مالک ہے۔"

دوسری جگہ اس کی تشریح ان الفاظ میں فرمائی۔

قُلۡ مَنۡ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبۡعِ وَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِیۡمِ ٥ سَیَقُوۡلُوۡنَ لِلّٰهِ ؕ قُلۡ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ ٥ قُلۡ مَنۡۢ بِیَدِهٖ مَلَكُوۡتُ كُلِّ شَیۡءٍ وَّ هُوَ یُجِیۡرُ وَ لَا یُجَارُ عَلَیۡهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ٥ (۸۶ — ۲۳/۸۸)

" (اے رسولؐ ان منکرین سے) پوچھو کہ وہ کون ہے جو متعدد آسمانی کُرّوں کا پروردگار اور عرشِ عظیم کا مالک ہے۔ وہ فوراً کہہ دیں گے کہ یہ سب کچھ اللہ کے لئے ہے۔ تو کہو کہ پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ (اس کفر کے انجام سے) ڈرتے نہیں ہو۔ ان سے پوچھو کہ اگر تم جانتے ہو تو (بتاؤ کہ)

وہ کون ہے جس کے قبضہ میں تمام چیزوں کی پادشاہی ہے اور وہ سب کو پناہ دیتا ہے اور کوئی نہیں جو اس سے اُوپر پناہ دینے والا ہو۔

حکومتِ کائنات یعنی "رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ" (عظمتوں کے عرش کا مالک) کی تفسیر بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ (ہر شے اسی کے قبضۂ اختیار و قدرت میں ہے) نے کردی. سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا،

قُلْ لَّوْ کَانَ مَعَہٗٓ اٰلِھَۃٌ کَمَا یَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّا بْتَغَوْا اِلٰی ذِی الْعَرْشِ سَبِیْلًا ○ سُبْحٰنَہٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا کَبِیْرًا ○ (۴۲ — ۱۷/۴۳)۔

"(کہہ دو کہ) اگر اللہ کے ساتھ اور بہت سے اِلٰہ ہوتے جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں تو اس صورت میں ضروری تھا کہ وہ صاحبِ تختِ کائنات تک سے (مقابلہ کی) راہ نکال لیتے. وہ ان تمام باتوں سے جو یہ کہتے ہیں، پاک اور بلند ہے، بے حد بلند"

علوِّ مرتبت اسی "علوِّ مرتبت" کو دوسرے مقام پر "رفعتِ مدارج" سے تعبیر کیا. رَفِیْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ ج (۴۰/۱۵) بلند درجوں والا صاحبِ عرش). اپنے "صاحبِ عرش" ہونے کے ساتھ، یہ کہہ کر کہ ہم جو چاہتے ہیں کرتے ہیں، اپنی لاشریک حکومت و قدرت کی طرف اشارہ کر دیا۔

ذُو الْعَرْشِ الْمَجِیْدُ لا فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ○ (۱۵-۱۶/۸۵)۔

"بزرگی کے عرش کا مالک. جو چاہتا ہے کرتا ہے"

اس لئے کہ اگر اس کی حکومت و قدرت اور اس کے ارادہ و اختیار میں کوئی اور بھی شریک ہوتا تو نظمِ کائنات میں فساد برپا ہو جاتا۔

لَوْ کَانَ فِیْھِمَآ اٰلِھَۃٌ اِلَّا اللّٰہُ لَفَسَدَتَا ج فَسُبْحٰنَ اللّٰہِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ○ (۲۱/۲۲)۔

" اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا اور الٰہ بھی ہوتے تو یقیناً وہ بگڑ کر برباد ہو جاتے. سو وہ اللہ جو (جہاں بانیٔ عالم کے) تخت کا مالک ہے، ان باتوں سے بلند ہے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں۔

اس لئے اس کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں جو الٰہ بنائے جانے کے قابل ہو۔ عظمت و سلطنت، شوکت و سطوت سب اسی کے لئے ہے۔ کائنات کا مرکزی کنٹرول اسی کے ہاتھ میں ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ۝ (۲۷/۲۶)

"اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ وہ تمام عظمتوں کے تخت کا (بلاشرکتِ غیرے واحد) مالک ہے"۔

چونکہ کائنات کا تمام سلسلہ اس کے قوانین کے مطابق چلتا ہے (کنٹرول کے یہی معنی ہیں) اس لئے جو شخص (یا گروہ) اس کے قوانین کا اتباع کرتا ہے، اسے کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں رہتی۔

فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ۝ (۹/۱۲۹)۔

'کہدو کہ میرے لئے اللہ کا سہارا کافی ہے۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ میں اس کے قانون پر اعتماد کرتا ہوں۔ تمام کائنات پر مرکزی کنٹرول اسی کا ہے'۔

زمین و آسمان میں اسی کا تمکن و اقتدار ہے۔

سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ (۴۳/۸۲)

"آسمان و زمین کا مالک (پروردگار) عرشِ حکومت کا مالک، ان تمام باتوں سے بلند ہے جو لوگ اس کی نسبت (جہالت کی بنا پر) بیان کرتے ہیں"۔

استوٰی علی العرش

پہلا مرحلہ تخلیقِ کائنات کا تھا، دوسرا نظم و نسقِ عالم کا۔ اس تدبیرِ امور، نظم و نسق، تمکن و تسلط اور جہاں بانی و جہانداری کو قرآنِ کریم نے اِسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ سے تعبیر کیا ہے جس سے مفہوم کائنات کا مرکزی کنٹرول ہے۔

اِستوٰی کے معنی

اِستوٰی کے معنی ہیں محکم اور پائیدار طریقہ پر جم کر بیٹھنا۔ حضرت نوحؑ کے قصہ میں ہے۔

فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَ مَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ

لِلّٰہِ .... (۲۳/۲۸)۔

"سو جس وقت تم اور تمہارے ساتھی کشتی میں بیٹھ جاؤ (اِسْتَوَیْتَ) تو کہو کہ سب حمد و ستائش اللہ کے لئے ہے"۔

اور جب وہ کشتی اُس طوفانِ بلا انگیز کے تھپیڑوں سے بچ کر جُودی پر جا ٹکی تو اس کے متعلق کہا۔ وَاسْتَوَتْ عَلَی الْجُوْدِیِّ (۱۱/۴۴)۔ سواری کے جانوروں کی پیٹھ پر جس طرح جم کر بیٹھا جاتا ہے اس کے لئے بھی یہی لفظ استعمال ہوا ہے۔ لِتَسْتَوٗا عَلٰی ظُهُوْرِهٖ (۴۳/۱۳)۔ (تاکہ تم جم کر ان کی پیٹھ پر بیٹھ جاؤ)۔

انسان عالمِ طفولیت سے آگے بڑھ کر جب جوان ہوتا ہے، اس کے اعضاء و قویٰ درست ہو جاتے ہیں، اُن میں پختگی آجاتی ہے، تو اس کیفیت کو بھی استوٰی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت موسےٰؑ کے متعلق ارشاد ہے وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓی .... (۲۸/۱۴)۔ "جب وہ اپنی بھری جوانی کی عمر کو پہنچا اور (ہر طرح سے) درست ہو گیا" (نیز ۵۳/۶)۔ اسی طرح ایک ننھا سا پودا جب تناور درخت بن جاتا ہے اور اس میں مضبوطی اور پختگی آجاتی ہے تو اس کی اس حالت کو بھی اسی لفظ سے بیان کیا گیا ہے۔ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی (۴۸/۲۹)۔ اس کا تنا موٹا ہو گیا اور پھر سیدھا کھڑا ہو گیا) اور جب یہ لفظ اِلٰی کے ساتھ آئے تو اس کے معنی توجہ مبذول کرنے کے ہوں گے جیسے،

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ .... (۲/۲۹)۔

"اللہ وہ ہے جس نے زمین کی ساری چیزیں تمہارے لیے پیدا کیں۔ پھر وہ آسمان (بلندی) کی طرف متوجہ ہوا اور متعدد کرّے درست کر دیئے"۔

دوسری جگہ ہے کہ اُس نے زمین کو دو "یوم" (مراحل) میں پیدا کیا۔ ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ (۴۱/۱۱) "پھر آسمان کی درستی کی طرف متوجہ ہوا"۔

ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ اِستوٰی کے معنی ہیں محکم طریق پر تمکن و تسلط قائم رکھنا (یا کسی چیز میں درستی و پختگی پیدا کرنے کے لئے اس کی طرف اِلتفات کرنا)۔ اس لئے استوٰی علی العرش کے معنی ہوں گے نظم و نسقِ عالم پر تسلط و اقتدار رکھنا۔ یہی وہ اقتدار و تمکن ہے جس سے نظامِ کائنات میں تدبیر امور ہوتی ہے، یعنی کارگہِ عالم کی ہر شے جو اپنے فرائضِ مفوّضہ کی سرانجام دہی میں یوں سرگرداں نظر آتی ہے، یہ

اسی خدا کے تختِ حکومت سے نافذ شدہ احکامات کی تعمیل ہو رہی ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ (۱۳/۲)۔

"اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں کو، بغیر ان ستونوں کے کھڑا کر دیا جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے اور وہ اپنے تخت (جہانداری) پر متمکن ہوا، پھر سورج اور چاند کو (اپنے اپنے) کام پر لگا دیا، کہ ہر ایک اپنی ٹھہرائی ہوئی میعاد تک (اپنی اپنی) راہ چلا جا رہا ہے۔ وہی (اس کارگہ کائنات) کا انتظام کر رہا ہے"۔

تدبیرِ امور

اسی کا ذکر سورۂ اعراف میں بھی ہے (دیکھئے ۷/۵۴)، سورۂ یونس میں تخلیقِ ارض و سمٰوٰت کے بعد ہے ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ (۱۰/۳)۔ "وہ اپنے تختِ حکومت پر متمکن ہو گیا (تاکہ تدبیرِ امور کرے"۔ اس "تدبیرِ امور" کی تفسیر دوسرے مقام پر یوں کر دی۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا شَفِیْعٍ ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ (۴-۳۲/۵)۔

"اللہ وہ ہے جس نے آسمان و زمین کو "چھ ایام" (معیّن زمانوں) میں پیدا کیا اور وہ اپنے تخت (جہاں بانی) پر متمکن ہو گیا۔ اس کے سوا نہ کوئی تمہارا مددگار ہے، نہ سفارش کرنے والا۔ سو کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟ وہ آسمان سے لے کر زمین تک تدبیرِ امور کرتا ہے۔ پھر (اس کی متعیّن کردہ تدبیر مختلف ارتقائی مراحل طے کر کے) تمہارے اعداد و شمار کے مطابق (ہزار) سال کے زمانہ (یوم) میں اس کی طرف بلند ہوتی ہے"۔

ان امور کی تفسیر و تشریح تو اپنے مقام پر ملے گی، یہاں صرف اتنا دیکھئے کہ "اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ" اُس تدبیرِ امور کے لئے آیا ہے جس سے یہ نظامِ عالم قائم ہے اور اس کے حکم کے ماتحت مظاہرِ فطرت اپنے

اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں منہمک ہیں۔ سورۂ حدید میں فرمایا۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ؕ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَ مَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَ مَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا یَعْرُجُ فِیْهَا ؕ وَ هُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ○ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اِلَی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ○ (۵۷/۵-۴)

"اللہ وہ ہے جس نے زمین و آسمان کو چھ "ایام" (زمانوں) میں پیدا کیا اور وہ اپنے تختِ حکومت پر متمکن ہوگیا۔ جو کچھ زمین کے اندر داخل ہوتا ہے اور جو چیز اس میں سے نکلتی ہے اور جو کچھ آسمان سے نازل ہوتا ہے اور جو چیز اس میں (اس کی طرف) چڑھتی ہے، وہ سب کچھ جانتا ہے۔ تم لوگ جہاں کہیں بھی ہو وہ (ہر وقت) تمہارے ساتھ ہوتا ہے اور اللہ تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔ زمین و آسمان میں اس کی بادشاہت ہے اور تمام امور اس کی طرف گردش کرتے ہیں۔"

نظامِ عالم کی بنا رحمت پر ہے

نظم و نسقِ عالم کی بنیاد رحمت پر ہے، یعنی تمام اشیائے کائنات کو سامانِ نشوونما خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ اس لئے کہا کہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی ○ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَهُمَا وَ مَا تَحْتَ الثَّرٰی ○ (۲۰/۶-۵) کائنات کا مرکزی کنٹرول اس خدا کے ہاتھ میں ہے جو رحمٰن ہے، یعنی ساری کائنات کو سامانِ نشوونما بہم پہنچانے والا۔ زمین و آسمان اور ان دونوں کے درمیان اور جو کچھ "تحت الثریٰ" میں ہے سب اسی کی مِلک ہے۔"

سورۂ ہود میں ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَی الْمَآءِ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ (۱۱/۷)۔

"اللہ وہ ہے جس نے زمین و آسمان کو چھ (طویل المیعاد) ایام میں پیدا کیا اور اس کا عرش پانی پر ہے۔ یہ اس لئے کہ وہ ایسے مواقع بہم پہنچائے جن سے معلوم ہو جائے کہ تم میں سے کون

عمل میں بہتر ہے"۔

عرش الٰہی پانی پر ہے! اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کا تخت پانی پر تیرتا پھرتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، عرش کے معنی قبضہ و تسلّط اور حکومت و سطوت کے ہیں۔ پانی کی تخصیص اس لئے ہے کہ پانی دراصل زندگی کا سرچشمہ ہے۔

وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ (۲۱/۳۰)

"اور ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی سے پیدا کیا۔"

یہ حقیقت ہے (جس کی تائید سائنس کے انکشافات بھی کرتے ہیں) کہ زندگی کی ابتدا بھی پانی سے ہوئی اور اس کی بقا بھی اسی پر ہے۔ اس لئے عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے سرچشمہ پر اسی کا قبضہ و اختیار ہے۔ پھر یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ یہاں عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ کہہ کر ابتلار کی طرف اشارہ کیا ہے۔ دوسرے مقام پر موت و حیات کا مقصد بھی آزمائشِ عمل بتایا گیا ہے۔ فرمایا۔

خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۶۷/۲)۔

"اس نے موت و حیات کو پیدا کیا تاکہ اس بات کی نمود ہو سکے کہ تم میں سے کون اعمال میں بہتر ہے"۔

گویا عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ کی تفسیر "موت و حیات" کے الفاظ میں مضمر ہے اور مطلب اس سے صاف ہے کہ زندگی کے سرچشمہ کا مالک بھی وہی ہے۔ قرآنِ کریم کے متعدد مقامات پر اس کی تشریح موجود ہے کہ موت و حیات اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ مثلاً

كَیْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (۲/۲۸)

"تم اللہ سے کس طرح انکار کر سکتے ہو (جبکہ حالت یہ ہے کہ) تم مُردہ تھے اس نے زندگی بخشی۔ پھر وہی ہے جو زندگی کے بعد موت طاری کرتا ہے اور موت کے بعد دوبارہ زندگی بخشے گا اور بالآخر تم سب کو اسی کی طرف لوٹنا ہے!

اس محیّر العقول اور عظیم الشان کارگۂ عالم کا نظم و نسق کس طرح سرانجام پاتا ہے، اس خدائے کائنات کے

مرکزِ حکومت (عرش) سے احکامات کیسے نازل اور نفوذ پذیر ہوتے ہیں، ان امور کا احاطہ انسان کے فہم و ادراک سے بالا ہے۔ وہ نوامیس الٰہیہ جن کا عمل اس کائنات میں جاری و ساری ہے ان کی کُنہ و حقیقت انسان کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اسے زیادہ سے زیادہ علم الاشیاء (علم الفطرت) دیا گیا ہے۔ علوم طبعی سے آگے اس کی رسائی نہیں۔ اس لئے وہ امور جن کا تعلق مابعد الطبیعیات سے ہے ان سے متعلقہ آیاتِ قرآنی متشابہات میں داخل ہیں، یعنی وہ حقائق جنہیں تشبیہات کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ اسی ضمن میں "حاملینِ عرش" سے متعلقہ آیت ہے۔

حاملینِ عرش

اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَ مَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ (۴۰/۷)

"وہ جو عرش (الٰہی) کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے گرداگرد ہیں وہ اپنے رب کی طرف سے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل میں سرگرداں رہتے ہیں۔"

قیامت میں بھی ملائکہ "عرش" کے گرد ہوں گے۔

وَ تَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّیْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ (۳۹/۷۵)۔

"اور ملائکہ کو دیکھو گے کہ "عرش" کے گرداگرد حلقہ باندھے ہوں گے اور اپنے رب کی طرف سے تفویض کردہ فرائض کی سرانجام دہی میں سرگرمِ عمل ہوں گے۔"

دوسری جگہ ہے۔

وَ یَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ یَوْمَئِذٍ ثَمٰنِیَةٌ ؕ (۶۹/۱۷)۔

"اور تیرے رب کے "عرش" کو اس دن آٹھ فرشتے اٹھائے ہوں گے۔"

جہت اور سمت کا تعین

یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ عرشِ الٰہی کسی مادی چیز کا نام نہیں جو کسی خاص مقام پر رکھا ہے۔ اس کا "اٹھانا" بھی کسی مادی تخت کا اٹھانا نہیں، بلکہ اس سے مفہوم فرمانبرداری یا قوانینِ خداوندی کی تنفیذ ہوگا۔ قرآنِ کریم نے ان امور کو تشبیہاً بیان کیا ہے، ورنہ اللہ تعالےٰ کے لئے کسی مادی تخت کا متعین کرنا، اسے کسی خاص مقام پر نصب کرنا اور اس کے سچ مچ اُٹھانے کے لئے ملائکہ کا مقرر کرنا، ذاتِ خداوندی کے متعلق غلط اندازہ لگانا ہے۔ اس کی ذات جہت، سمت اور مکان کے تعینات سے بلند و بالاتر ہے۔ فرعون نے جب استہزاءً ہامان سے کہا کہ آؤ، میرے لئے ایک بلند سا مینارہ بنا دو تاکہ میں

اُس پر چڑھ کر دیکھوں کہ موسیٰؑ کا رب کہاں بیٹھتا ہے، تو قرآنِ کریم نے کہا کہ وہ صحیح راستہ سے بھٹک گیا۔ اسے کیا معلوم کہ خدا کسے کہتے ہیں! (دیکھئے ۳۶–۴۰/۳۷)۔ لہٰذا ذاتِ خداوندی کے لئے جہت و مکان کا تعین اس کے متعلق غلط نگہی پر مبنی ہے۔ اس کی تو شان یہ ہے کہ ھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ (تم جہاں کہیں بھی ہو، وہ تمہارے ساتھ ہے) اسی طرح اس کے تختِ حکومت کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ارض و سمٰوٰت کی وسعتیں اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔

وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ (۲/۲۵۵)

"اس کا تخت (حکومت) یا علم آسمان و زمین کی وسعتوں پر چھایا ہوا ہے۔"

یہ ہے عرشِ الٰہی کا قرآنی تصور۔ مومنین کی جو جماعت اس دنیا میں حکومتِ خداوندی کے قیام کی ذمہ دار ہوگی، وہ کس طرح عرشِ خداوندی کی حامل (اُٹھانے والی) قرار پائے گی، یہ ایک جداگانہ بحث ہے جس کا تعلق اس مقام سے نہیں۔ اس مقام پر صرف اتنا دیکھئے کہ جس خدا کی قوّت و جبروت، اختیار و ارادہ، قبضہ و تسلّط، حکومت و سطوت کا یہ عالم ہے، جن لوگوں میں اس کی صفات کی جھلک ہوگی، ان کی قوّتیں کیسی حدود فراموش و قیود ناآشنا ہوں گی۔ ضعف و ناتوانی، کمزوری و بے چارگی، بے کسی و بے بسی، ذلّت و مسکنت، محکومی و غلامی ان کے پاس تک نہیں پھٹک سکے گی۔ وہ خود صاحبِ قوّت ہوں گے اور دنیا بھر کے کمزوروں اور ناتوانوں کی حفاظت اور پاسبانی کے کفیل۔ چونکہ وہ اس دنیا میں اپنے صاحبِ اقتدار خدا کی قوّتوں کے زندہ مظہر ہوں گے، اس لئے زندگی کے سرچشموں پر انہی کا کنٹرول ہوگا۔ ان کا تختِ حکومت ہر مقام پر چھا ہوگا اور ان کی کرسئ سطوت ہر جگہ متمکن۔ اللہ کے بندوں کی دنیا میں یہی شان ہوتی ہے اور اسی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اُس کی صفات کس حد تک ان میں منعکس ہیں۔ خاک کے آغوش میں سر بزیری، ربّ العرش العظیم کے بندوں کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ اللہ کے بندوں کی قوّتوں کا کیا ٹھکانہ؟

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُسکے زورِ بازو کا ۔۔۔۔ نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

لیکن ایک نشوونما یافتہ ذات، جلال اور جمال، دونوں کی کیفیات کی مظہر ہوتی ہے۔

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

۲۰

مَلَکُوت

خُدا کے جس قبضہ واختیار اور غلبہ واقتدار کا سابقہ عنوانات میں ذکر ہوا ہے، اسے مَلَکْ کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لفظ کے معنی بھی اقتدار واختیار ہی کے ہیں اور اسی جہت سے اس سے مراد حکومت اور پادشاہت لی جاتی ہے۔ پادشاہت کے معنی کسی فرد کا بادشاہ ہونا نہیں، بلکہ اختیارات کا مالک ہونا ہیں۔ جب کائنات میں قوانین اُسی خدا کے ہیں، تو پھر کہا جائے گا کہ ساری خدائی میں حکومت اُسی کی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ط یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ط
وَ مَا لَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ ○ (۹/۱۱۶)

"بلاشبہ زمین وآسمان کی ساری بادشاہت اللہ ہی کے لئے ہے۔ وہی جِلاتا ہے اور وہی مارتا ہے۔
اس کے سوا تمہارا کوئی کارساز و رفیق نہیں!

مختلف مقامات پر اس کا اعادہ کیا گیا ہے تاکہ یہ حقیقتِ ثابتہ واضح طور پر ذہن نشین ہو جائے۔ ملاحظہ ہو ۲/۱۰۷، ۷/۱۵۸؛ ۵۷/۲)۔ ان مقامات کے سیاق وسباق سے معلوم ہوگا کہ کس طرح انسان کی توجہات ہر طرف سے ہٹا کر اس نقطۂ ماسکہ پر مرکوز کرائی گئی ہیں کہ زمین وآسمان میں حکومت وفرمانروائی صرف اُسی کی ہے، اس لئے کہ وہ کائنات کو وجود میں لایا ہے۔ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ہے اور اس کے بعد اب اپنے قوانینِ مشیت کے مطابق جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ اس لئے تمام مخلوق پر اسی کی حکومت ہے۔ اس میں

اس کے قوانین کارفرما ہیں۔

وَ لِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَہُمَا یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ وَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۵/۱۷؛ ۴۲/۴۹)۔

"آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے اندر ہے، سب کی بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہے۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے"۔

کارگہِ عالم پر حکومت اس کا اقتدار و اختیار، کائنات کی تخلیق تک ہی محدود نہیں۔ اس کے بعد یہ تمام کارگہِ عالم اسی کے حکم سے چل رہا ہے۔ مظاہر فطرت کی ایک ایک شے پر اس کا تصرف ہے اور کوئی چیز اس کے قانون سے سرتابی نہیں کر سکتی۔ اسی کا نام صحیح حکومت و بادشاہت ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُسَبِّحُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ .... اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ (۴۱-۴۴/۲۴؛ ۳۹/۶)

"کیا تجھے معلوم نہیں کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب خدا کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل میں سرگرم عمل ہے۔ (بالخصوص) پرندے جو پر پھیلائے (اڑتے پھرتے) ہیں، ہر ایک کو اپنی "صلوٰۃ" اور "تسبیح" کا علم ہے اور اللہ کو ان کے افعال کا پورا علم ہے اور آسمان و زمین میں اللہ ہی کی حکومت ہے اور اسی کی طرف سب کا قدم اٹھتا ہے۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اللہ ایک (طرف کے) بادل کو (دوسری طرف کے) بادل کی طرف چلاتا ہے۔ پھر ان کو باہم ملا دیتا ہے۔ پھر ان کو تہ بہ تہ کرتا ہے۔ پھر تو بارش کو دیکھتا ہے (گویا) وہ اس بادل کے اندر سے نکلتی ہے اور اس بادل کے بڑے بڑے حصوں سے وہ اولے برساتا ہے اور انہیں اپنے قانونِ مشیت کے مطابق جہاں چاہتا ہے گراتا ہے اور جہاں چاہتا ہے ہٹا دیتا ہے۔ اور بجلی کی چمک کا یہ عالم ہے کہ معلوم ہوتا ہے گویا اس نے ابھی بینائی اچک لی۔ اللہ تعالےٰ دن اور رات کو اُدلتا بدلتا رہتا ہے۔ ان (مظاہر فطرت) میں اہلِ دانش کے لئے (بصائر) و عبر (کے خزانے) ہیں"۔

مظاہر فطرت کا یہی محیر العقول نظم و نسق تھا جس کے مشاہدہ کے بعد حضرت ابراہیمؑ اس نتیجہ پر پہنچے کہ

اس عظیم الشان نظامِ عالم کو چلانے والی ہستی یقیناً ایسی ہے جو کسی کے تابع فرمان نہیں اور تمام کائنات اسی کے زیرِ حکومت ہے۔

وَ كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ○ (۶/۷۵)۔

"اور اس طرح ہم نے ابراہیم کو زمین و آسمان کی بادشاہت کے جلوے دکھلائے تاکہ وہ یقین رکھنے والوں میں سے ہو جائے۔"

حکومتِ کائنات میں کسی اور کا حصہ نہیں

ایسی حکومت جس میں اس کا کوئی شریک وسہیم نہیں۔

اَلَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ○ (۲۵/۲)

"ایسی ذات جس کو آسمان و زمین کی حکومت حاصل ہے۔ اس نے کسی کو اپنی اولاد قرار نہیں دیا اور نہ اس کی حکومت و مملکت میں کوئی اس کا شریک ہے اس نے تمام اشیاء کو پیدا کیا اور پھر ہر شے کا الگ الگ اندازہ رکھا۔"

سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔

وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ كَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا (۱۷/۱۱۱)

"اور کہہ کہ ساری ستائش اللہ کے لئے ہے جو نہ تو اولاد رکھتا ہے، نہ اس کی حکومت میں کوئی اس کا شریک ہے اور نہ کوئی ایسا ہے کہ اس کی درماندگی کی وجہ سے اس کا مددگار ہو (وہ ان تمام باتوں سے بے نیاز ہے) تو اس کی کبریائی کو دنیا میں قائم کر جیسا کہ اس کے قائم کرنے کا حق ہے۔"

اس لئے کہ جس طرح کائنات کی کوئی شے اس کی قدرت سے باہر نہیں، ایسے ہی کوئی ذرّہ اس کے حیطۂ علم سے بھی باہر نہیں۔ ہر شے اس کی "نگاہوں" کے سامنے ہے۔ ہر چیز اس کی نگرانی میں ہے۔

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ؕ (۸۵/۹)۔

"ارض و سما کی سلطنت اسی کی ہے اور اللہ ہر چیز کا نگران ہے"۔

لہٰذا کسی اور کو اس کی حکومت اور فرمانروائی میں دخیل سمجھنا جہالت ہے کیونکہ شریک و دخیل وہ ہو سکتا ہے جسے بجائے خویش کوئی قدرت و اختیار حاصل ہو۔ لیکن جب حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی کسی شے کو کوئی طاقت بالذات حاصل نہیں (سب خدائی عطا فرمودہ ہے) تو اُس کی خدائی اور بادشاہت میں کون سی چیز اس کی شریک و سہیم ہوگی۔ چنانچہ فرمایا۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ؕ قُلْ اَوَ لَوْ كَانُوْا لَا یَمْلِكُوْنَ شَیْـًٔا وَّ لَا یَعْقِلُوْنَ ۝ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِیْعًا ؕ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (۴۳-۴۴/۳۹)۔

"کیا ان لوگوں نے خدا کے سوا دوسروں کو (معبود) بنا رکھا ہے (اس خیال سے کہ یہ ان کی) شفاعت کریں گے؟ کہو کہ خواہ یہ کچھ بھی قدرت نہ رکھتے ہوں اور کچھ بھی علم نہ رکھتے ہوں؟ کہو کہ شفاعت تو تمام خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ تمام زمین و آسمان کی سلطنت اسی کی ہے اور تمہارا ہر قدم اسی کی طرف اُٹھتا ہے"۔

دوسری جگہ ہے۔

وَ تَبٰرَكَ الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَهُمَا ۚ وَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ وَ لَا یَمْلِكُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ (۸۵-۸۶/۴۳)۔

"اور وہ ذات بڑی بابرکت ہے جس کے لئے زمین اور آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کی پادشاہت (ثابت) ہے اور آنے والے انقلاب کا علم اسی کو ہے اور تمہارا ہر قدم اسی کی طرف اُٹھ رہا ہے اور خدا کے سوا جن (معبودوں) کو یہ لوگ پکارتے ہیں انہیں شفاعت کا کوئی اختیار حاصل نہیں۔ ہاں، جن لوگوں نے حق کے ساتھ شہادت دی تھی اور وہ علم

رکھتے تھے[1]۔

لوگ اس مالکُ المُلک کے علاوہ جنھیں معبود قرار دیتے ہیں، انہیں اس وسیع و عریض کائنات میں ذرہ برابر بھی اختیار نہیں ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۭ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ۭ (۳۵/۱۳)۔

"یہ ہے اللہ تمہارا پروردگار، اسی کی (تمام) سلطنت ہے اس کے سوا جن کو تم پکارتے ہو، وہ تو کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے برابر بھی اختیار نہیں رکھتے۔"

حیاتِ اُخروی میں حکومتِ الٰہی

اللہ تعالیٰ کا عرصۂ حکومت اسی دنیا تک محدود نہیں۔ اس کے بعد کی زندگی بھی اسی کے حدودِ مملکت میں ہے۔ اس لئے کہ "اِمروز و فردا" کے یہ امتیازات تو ہماری نگاہوں کے پیدا کردہ ہیں۔ اس کی "نگاہ" میں دیروز، امروز اور فردا میں کوئی فرق نہیں۔ جیسے وہ فرش سے عرش تک، بلاتعینِ حدودِ "مکان" (SPACE) واحد حکمران ہے، ویسے ہی وہ ازازل تا ابد، بلاقیودِ "زمان" (TIME) مالکُ المُلک ہے۔ اس لئے اگر آج حکومت اس کی ہے تو کل بھی اسی کی ہوگی۔ پوچھا کہ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۭ (۴۰/۱۶) [اس دن کس کی حکومت ہوگی؟] فرمایا کہ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ۭ (۶/۷۳) [جس دن صُور پھونک دیا جائے گا اُس دن بھی حکومت اسی کی ہوگی]۔ سورۂ حج میں ہے۔ اَلْمُلْكُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ۭ (۲۲/۵۶) [اس دن بادشاہت اللہ کی ہوگی] (نیز دیکھئے ۲۵/۲۶)۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَىِٕذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ (۴۵/۲۷)۔

"اور زمین و آسمان میں اللہ ہی کی سلطنت ہے اور جس روز قیامت ہوگی، (جب بھی اسی کی حکومت ہوگی) وہ دن جب اہلِ باطل نقصان میں رہیں گے۔"

---

[1] شفاعت کا مفہوم کسی دوسرے مقام پر بیان کیا جائے گا۔

اس لئے عذاب و مغفرت کے فیصلے اسی احکم الحاکمین کے قوانینِ مشیّت کے ماتحت ہوں گے۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ (۵/۴۰)۔

"کیا تجھے معلوم نہیں کہ ارض و سما کی بادشاہت اللہ ہی کے لئے ہے۔ عذاب و مغفرت کے فیصلے اس کے قانونِ مشیّت کے مطابق ہوتے ہیں اور وہ تمام چیزوں پر قادر ہے"۔

(نیز دیکھئے ۳/۱۸۸ ؛ ۵/۱۸ ؛ ۵/۱۲۰ ؛ ۴۸/۱۴)[1]

ملکوتِ ارضی و سماوی

تصریحاتِ بالا سے ظاہر ہے کہ کائنات میں بادشاہی خدا کے لئے ہے۔ زمامِ حکومت اسی کے ہاتھ میں ہے۔ پوچھا کہ مَنْۢ بِیَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ (۲۳/۸۸) "وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں تمام اشیاء کی بادشاہت ہے؟" فرمایا فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ وَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (۳۶/۸۳)۔ "بلند ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں تمام اشیاء کی حکومت ہے اور تمہارا ہر قدم اس کی طرف اُٹھ رہا ہے"۔ نیز ۶۷/۱) اس لئے ذاتِ باری تعالیٰ کے الاسماء الحسنیٰ میں ایک صفت "مَلِكُ الْقُدُّوْسُ" بھی ہے۔ (۵۹/۲۳ ؛ ۶۲/۱) شاہنشاہِ حقیقی، تمام نقائص سے پاکیزہ، تمام کمزوریوں سے بلند و بالاتر۔ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِیْمِ ۝ (۲۳/۱۱۶) "وہ بادشاہِ حقیقی بلند و بالاتر، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں صاحبِ عرشِ کریم"۔ (نیز ۲۰/۱۱۴)

خارجی کائنات میں خدا کی حکومت براہِ راست جاری و ساری ہے۔ لیکن انسانوں کی دنیا میں نظم و نسق انسانوں کے ہاتھوں سے ہوتا ہے۔ اسے حکومت اور اختیار کہا جاتا ہے اور حکومت اور اختیار کے ملنے اور چھننے کے لئے خدا نے قوانین مقرر کر دیئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب یہ کچھ ملتا اور چھنتا اس کے قوانین کے مطابق ہے تو یہ کہنا بالکل درست ہے کہ مَالِكَ الْمُلْكِ تو وہی ہے۔ البتہ وہ اپنے قانونِ مشیّت کے مطابق، انسانی دنیا کا نظم و نسق ان لوگوں کو دے دیتا ہے جن میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے

---

[1] ان مقامات کی تفصیل و تبیین کا یہ موقعہ نہیں۔

اور جب ان میں اس کی صلاحیت نہیں رہتی تو اُسے اُن سے چھین لیتا ہے۔

مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ (۳/۲۵)

"سلطنت کا مالکِ حقیقی تو جسے چاہے اپنے قانونِ مشیّت کے مطابق بادشاہت عطا فرما دے اور جس سے چاہے اس قانون کے مطابق حکومت چھین لے۔"

اس لئے کہ سب کچھ اسی کی ملکیت ہے۔

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ (۲۲/۶۴)

"ارض و سمٰوٰت میں جو کچھ ہے، سب اسی کی ملکیت ہے۔"

اور جب ملکیت اس کی ہے تو بادشاہِ حقیقی بھی وہی ہے۔

یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ لَهُ الْمُلْکُ وَ لَهُ الْحَمْدُ وَ هُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۶۴/۱)۔

"زمین و آسمان میں جو کچھ ہے، سب اس کے پروگرام کی تکمیل میں سرگرداں ہے۔ بادشاہت بھی اسی کی ہے اور (سب) ستائشیں بھی اسی کی ہیں اور وہ ہر ایک چیز پر قادر ہے۔"

شانِ کبریائی تمام کائنات میں حکومت اس کی ہے تو پھر اس سے بڑا کون ہو سکتا ہے۔ لہٰذا کائنات میں کبریائی بھی اسی کی ہے۔ وَ لَهُ الْکِبْرِیَآءُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۴۵/۳۷)۔ یہ ہے وہ خدا جس کی عبودیت کی طرف قرآنِ کریم دعوت دیتا ہے۔

ذٰلِکُمُ اللّٰهُ رَبُّکُمْ لَهُ الْمُلْکُ (۳۵/۱۳)

(اس عنوان کو اللہ تعالیٰ کی عام قدرت و بادشاہت تک محدود رکھا گیا ہے۔ اس کی حکومت اس دنیا میں کس طرح قائم ہوتی ہے، یہ الگ بحث ہے جو اپنے مقام پر آئے گی۔

مکمل ذات کی بنیادی خصوصیت صاحبِ اختیار و ارادہ ہونا ہے۔ لہٰذا انسانی ذات بھی جس قدر نشو و نما یافتہ

ہو گی اسی قدر اس کے اختیارات کی وسعتیں ہوں گی. حقیقت یہ ہے کہ یہ دیکھنے کے لئے کہ ایک ذات کس حد تک نشوونما یافتہ ہے، دیکھنا یہ چاہیئے کہ وہ کس قدر صاحبِ اختیار و ارادہ ہے۔ وہ کس حد تک اپنے فیصلے آپ کرتی ہے. اگر کوئی انسان اپنے لئے آپ فیصلے نہیں کرتا بلکہ دوسروں کے فیصلوں کے پیچھے چلتا ہے (خواہ تقلیداً یا استبداداً) تو سمجھ لیجئے کہ اس کی ذات کی نشوونما نہیں ہو رہی. پابندی صرف قوانینِ الٰہیہ کی ہو سکتی ہے اور وہ بھی بطیبِ خاطر۔ ان قوانین کے حدود کے اندر انسان کو پورا پورا صاحبِ اختیار و ارادہ ہونا چاہیئے. یہی ایک نشوونما یافتہ ذات کی پہچان ہے۔

جس جماعت کے افراد کی ذات کی اس طرح نشوونما ہو گی، وہ جماعت صاحبِ اختیار و ارادہ ہو گی. اسی کو حکومت کا حق ہو گا. لیکن اس کی حکومت دوسرے انسانوں سے اپنے احکام منوانے کے لئے نہیں ہو گی، بلکہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے لئے ہو گی تاکہ اس طرح ان کی ذات کی بھی نشوونما ہو جائے۔

۲۱

اِحیاء و اِماتت

خدا کی قوت واقتدار کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ موت اور حیات بھی اسی کے ہاتھ میں ہے. حیات (LIFE) کا سرچشمہ کیا ہے؟ یہ وہ سوال ہے جو اربابِ فکر و تحقیق کے نزدیک (خواہ وہ عہدِ قدیم کے فلاسفر ہوں یا عصرِ جدید کے سائنسدان) لاینحل چلا آرہا ہے. سائنس کی تحقیقات زیادہ سے زیادہ یہاں تک پہنچ سکی ہیں کہ اس صفحۂ ارض پر زندگی کی نمود کس طرح سے ہوئی. لیکن زندگی آ کہاں سے گئی؟ اس کے متعلق وہ کچھ نہیں بتا سکتے. قرآن ہمیں یہ بتاتا ہے کہ خدا اَلْحَیُّ ہے، یعنی بذاتِ خویش زندہ اور کائنات میں حیات اُس کی پیدا کردہ ہے، یعنی جس طرح مادہ اُس کا پیدا کردہ ہے، اسی طرح حیات بھی اسی کی پیدا کردہ ہے اور یہ وہ چیز ہے جو کسی اور کے اختیار میں نہیں (یعنی زندگی کا پیدا کرنا کسی اور کے لئے ممکن نہیں). البتہ اس نے زندگی کے استحکام (اور ضعف) کے لئے قوانین مقرر کر دیئے ہیں جن کے مطابق اسے قوی بھی بنایا جا سکتا ہے اور تباہ بھی کیا جا سکتا ہے چونکہ اس کی انتہائی تباہی (جسے موت کہتے ہیں) اُس کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ہوتی ہے، اس لئے اُس نے حیات کے ساتھ ممات کے متعلق بھی یہی کہا ہے کہ وہ اس کے اختیار میں ہے. یہ مطلب ہے قرآن کی اُن آیات کا جن میں کہا گیا ہے کہ "وہی جلاتا ہے وہی مارتا ہے." مثلاً

اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ؕ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ۝ (۹/۱۱۶)

"زمین و آسمان کی بادشاہت یقیناً اللہ کی ہے۔ وہی زندگی بخشتا ہے وہی مارتا ہے۔ اس کے سوا تمہارا کوئی چارہ ساز اور کوئی مددگار نہیں۔"

سورۂ حدید میں ہے۔

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (۵۷/۲)

"زمین و آسمان کی بادشاہت اسی کی ہے۔ وہی زندگی عطا کرتا ہے، وہی مارتا ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔"

سورۂ یونس میں ہے

هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (۱۰/۵۶)

وہی زندہ کرتا ہے، وہی مارتا ہے اور تمہارا ہر قدم اسی کی طرف اٹھتا ہے۔"

قرآن میں مختلف مقامات پر اس حقیقت کا اعادہ کیا گیا ہے۔ ان مقامات پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ قرآن کا یہ اسلوبِ بیان کس قدر معجزانہ ہے کہ وہ ایک اصول کو تصریفِ آیات سے متعدد بار سامنے لاتا ہے اور ہر مقام پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات گویا پہلی بار سامنے آئی ہے۔ اس تکرار و اعادہ سے اصولِ پیشِ نظر اپنی پوری درخشندگی و تابناکی سے ذہن میں مرتسم ہو جاتا ہے۔ "هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ" کے لئے حسبِ ذیل آیات کو سامنے رکھیے اور دیکھیے کہ مندرجہ بالا اسلوبِ قرآنی کس درجہ دل نشین واقع ہوا ہے۔ (۱۵/۲۲؛ ۲۳/۸۰؛ ۴۰/۶۸؛ ۴۴/۸؛ ۵۰/۴۳؛ ۵۳/۴۴)۔

فطری دلیل

وہ لوگ جو خدا کی ہستی سے انکار کرتے ہیں، ان کے سامنے موت و حیات کو بطور دلیل پیش کیا گیا ہے۔ فرمایا:۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (۲/۲۸)۔

"تم اللہ سے کس طرح انکار کرسکتے ہو؟ تم مُردہ تھے اُس نے تمہیں زندگی عطا کی پھر وہ تم پر موت طاری کرتا ہے اور پھر حیاتِ نَو عطا کرتا ہے اور تمہارا ہر قدم اُس کی طرف اُٹھتا ہے۔"

سورۂ حج میں ہے۔

وَ هُوَ الَّذِیْٓ اَحْیَاكُمْ ز ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ○ (۲۲/۶۶)۔

"اللہ وہ ہے جس نے تمہیں زندگی عطا فرمائی، پھر وہ تمہیں مارے گا۔ اس کے بعد وہ پھر زندہ کریگا۔ (لیکن) انسان بڑا ناشکر گزار ہے۔"

سلبی پہلو

یہ تو تھا اس موضوع کا ایجابی پہلو، یعنی یہ کہ موت وحیات کا مالک صرف اللہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا سلبی پہلو بھی بیان کر دیا، تاکہ حقیقت اچھی طرح دل نشین ہو جائے۔ فرمایا کہ

وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا یَخْلُقُوْنَ شَیْئًا وَّ هُمْ یُخْلَقُوْنَ وَ لَا یَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا وَّ لَا یَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّ لَا حَیٰوةً وَّ لَا نُشُوْرًا ○ (۲۵/۳)۔

"اور یہ لوگ اللہ سے وَرے ہی اوروں کو اِلٰہ بنا لیتے ہیں جو کوئی شے پیدا نہیں کر سکتے، بلکہ خود مخلوق ہیں اور اپنی ذات کے لئے بھی کسی نفع یا نقصان پر اختیار نہیں رکھتے اور نہ ہی موت و حیات و نشور پر قادر ہیں۔"

مادّہ پرست

یورپ کے سائنسدانوں میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جن کا عقیدہ ہے کہ جب مادّی عناصر میں ایک خاص ترتیب پیدا ہو جاتی ہے، تو ان میں خود بخود محض اتفاقی طور پر زندگی پیدا ہو جاتی ہے اور جب زمانہ کی (طبعی) گردشوں سے یہ ترتیب بگڑ جاتی ہے، تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہ گروہ دورِ حاضر کا پیدا کردہ نہیں۔ حکمائے یونان کے وقت سے ان کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں بھی یہ موجود تھا۔ قرآن نے انہی کی طرف اشارہ کر کے کہا ہے کہ

وَ قَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَ نَحْیَا وَ مَا یُهْلِكُنَآ

اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (۴۵/۲۴)

"اور یہ کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ یہیں جینا ہے اور یہیں مر جانا ہے اسکے بعد اور کوئی زندگی نہیں) اور یہ موت سوائے اس کے اور کیا ہے کہ زمانہ (اپنے قوانینِ امتزاج و انتشار کی رُو سے اجزائے مترتبہ کو پریشان کر کے) ہلاک کر دیتا ہے لیکن یہ (نظریہ) علم پر مبنی نہیں۔ یہ محض ظن و تخمین ہے (قیاس آرائیاں ہیں حقیقت نہیں ہے)"

آپ نے غور کیا کہ دہریت (مادہ پرستی) کے اس نظریہ کا آخری نتیجہ کیا نکلا؟ یہ کہ زندگی اسی طبعی زندگی کا نام ہے جو مرنے کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد کوئی زندگی نہیں۔ قرآن تسلسلِ حیات کا قائل ہے اور قرآن ماننے والوں کا اس پر ایمان ہے۔ اس لئے دہریت کے اس نظریہ کو بیان کرنے کے بعد، قرآن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ حقیقت وہ نہیں جسے یہ لوگ بیان کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ

قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۴۵/۲۶)۔

"کہہ دے کہ وہ اللہ ہے جو تمہیں زندگی عطا فرماتا ہے اور پھر تم پر موت طاری کر دے گا اور پھر قیامت کے دن اکٹھا کریگا۔ وہ دن کہ جس کے وقوع میں کوئی شک و شبہ نہیں (یہ ظنّی اور قیاسی بات نہیں) لیکن (مشکل یہ ہے کہ) بہت سے لوگ اس حقیقت کا علم نہیں رکھتے (اور جس چیز کو وہ علم کہتے ہیں وہ ظن و قیاس سے آگے کچھ نہیں ہوتا)"

مادیئین کا نظریہ موت و حیات کس طرح محض ظنّ و تخمین ہے اور علمِ صحیح کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا، بلکہ کس طرح خود انہی میں ایسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں جو اپنے پیشرو سائنسدانوں کے نظریہ حیات و ممات کا ابطال کر رہے ہیں، اس بحث کا یہ موقع نہیں۔ یہ بحث سلسلہ معارف القرآن کی آخری کڑی (کتاب آخرت[1]) میں آئے گی۔ اس وقت صرف اتنا دیکھئے کہ قرآن کریم نے کس طرح ہر باطل نظریہ کی تکذیب کر کے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ زندگی بھی خدا کی پیدا کردہ ہے اور موت بھی اسی کے قانون کے مطابق واقع ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کے لئے کچھ مشکل نہیں کہ وہ موت کے بعد پھر زندگی عطا کر دے اور یہ دعویٰ علم پر مبنی ہے، ظن و تخمین پر نہیں۔

---

[1] یہ کتاب "جہانِ فردا" کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

اس ایمان کا عملی نتیجہ بھی دیکھئے. انسان کے لئے لغزش کی سب سے بڑی خطرناک گھاٹی موت کا خطرہ ہے. جان بچانے کے لئے انسان سب کچھ کرگزرتا ہے. اس کے لئے وہ ہر صاحبِ قوت واقتدار کے سامنے جبیں سائی کرتا ہے. لیکن ایک عبدِ مومن جب اپنے اندر یقین پیدا کرلیتا ہے کہ موت سے انسان کا خاتمہ نہیں ہوجاتا بلکہ زندگی آگے بھی چلتی ہے، تو حریت دبیباکی اور جرأت وجسارت کی تڑپتی ہوئی بجلیاں اس کے رگ وپے میں دوڑ جاتی ہیں. وہ کسی انسان سے خوف نہیں کھاتا اور صداقت پر کٹ مرنے کے لئے رزمگاہِ حیات میں سربکف وکفن بدوش مستانہ وار بڑھ آتا ہے. دنیا کی کوئی زنجیر اس کی آزادیوں کو مقید نہیں کرسکتی. استبداد کی کوئی قوت اس کے ایمان کے راستہ میں حائل نہیں ہوسکتی. اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے ؏

چو مرگ آید تبسم بر لبِ اُوست

یہی وہ مردانِ خود آگاہ و خدامست ہیں جن کی جرأتوں کے صدقے دنیا میں نظامِ عدل وصداقت کا قیام ہوتا ہے اور جن کا ایمان، روشنی کے بلند مینار کی طرح حوادث کے تھپیڑوں میں مشعلِ ہدایت کا کام دیتا ہے. ایک نشوونما یافتہ ذات اس حقیقت کو محسوس کرلیتی ہے کہ

جانے کہ بخشند دیگر نگیرند
آدم بمیرد از بے یقینی

آپ سوچئے کہ جو نظامِ معاشرہ اس قسم کے افراد کے ہاتھوں متشکل ہوگا، وہ مستقل اقدار کے استحکام کی خاطر کس طرح بطیبِ خاطر جان تک دیدینے کے لئے تیار ہوگا.

۲۲ توکّل

آپ نے کسی ہوا باز کو ہوائی جہاز سے کودتے ہوئے دیکھا ہے؟ ہوائی جہاز پندرہ بیس ہزار فٹ کی بلندی پر تین چار سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اُڑ رہا ہے۔ اس میں سے ایک ہوا باز نہایت اطمینان سے نیچے کود پڑتا ہے اور بڑے آرام اور سکون سے زمین پر آگرتا ہے۔ آپ نے کبھی غور کیا کہ ہوا باز اس قدر اطمینان اور سکون سے کیوں کود پڑتا ہے؟ اس لئے کہ اس کے پاس ایک چھتری ہوتی ہے جو ادنیٰ سے اشارہ سے کھُل پڑتی ہے اور مضبوط اس قدر ہوتی ہے کہ اتنے بوجھ اور اتنی رفتار کے باوجود نہ اس کی رسّی ٹوٹتی ہے، نہ کپڑا پھٹتا ہے۔ ہوا باز اس چھتری کے سہارے نیچے آجاتا ہے۔ یہ محض اس چھتری پر اس قدر محکم بھروسہ ہے جو ہوا باز کو اتنی بلندی سے کوُد پڑنے پر آمادہ کر دیتا ہے۔ اگر اسے اس پر ایسا اعتماد اور بھروسہ نہ ہو تو وہ کوُدنا تو ایک طرف، ہوائی جہاز سے نیچے جھانکنے کی بھی جرأت نہ کرے۔ اس قسم کے اعتماد اور بھروسے کو عربی زبان میں توکّل کہتے ہیں۔

ہم سابقہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں کہ خارجی کائنات اور انسانی دنیا، دونوں میں خدا کے اٹل قوانین کارفرما ہیں۔ خارجی دنیا میں چونکہ ان قوانین کے نتائج محسوس شکل میں سامنے آجاتے ہیں، اسی لئے ان پر یقین اور اعتماد کر لینا آسان ہوتا ہے۔ لیکن جہاں تک انسانی دنیا کا تعلق ہے، ایک تو ان کے نتائج غیر محسوس سے ہوتے ہیں اور دوسرے (کائناتی رفتار سے) بڑے لمبے عرصہ میں جا کر برآمد ہوتے ہیں۔ یہ نتائج

انسانی حساب و شمار سے اس وقت مرتب ہوں گے جب یہ قوانین جماعت مومنین کے ہاتھوں سے نفاذ پذیر ہونگے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب یہ جماعت ان قوانین کو لے کر اُٹھے گی اُس وقت ان کے نتائج اس جماعت کے سامنے نہیں ہوں گے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کونسی قوت ہے جس کی بنا پر یہ جماعت اس قدر جانگسل اور صبر آزما مہم کے لئے تیار ہو جائیگی۔ وہ قوت اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی کہ انہیں قوانینِ خداوندی کی محکمیت پر کامل بھروسہ اور اعتماد ہو۔ اس کے بغیر یہ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکیں گے۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَ اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّ عَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ۚۖ الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ؕ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَھُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَ مَغْفِرَۃٌ وَّ رِزْقٌ کَرِیْمٌ ۚ (۲-۴/۸)

"مومن تو وہ ہیں کہ جب خدا کا ذکر کیا جائے تو اس سے ان کے دل متأثر ہو جاتے ہیں اور جب ان کے سامنے قوانینِ خداوندی کو پیش کیا جائے تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب (کے قوانین) پر پورا پورا بھروسہ رکھتے ہیں۔ یہ لوگ نظامِ صلوٰۃ کو قائم کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے انھیں دے رکھا ہوتا ہے اسے (نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے) کھلا رکھتے ہیں۔ یہ ہیں حقیقی مومن۔"

ان کے لئے ان کے پروردگار کے ہاں بلند مدارج، سامانِ حفاظت اور عزت کی روٹی ہے۔"

جماعتِ مومنین کا توکّل محض ایک نظری عقیدہ نہیں ہوتا۔ انہیں اس امر کا کامل یقین ہوتا ہے کہ مَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ ؕ جو شخص (یا گروہ) قوانینِ خداوندی پر اعتماد کرتا ہے تو اُسے کسی اور سہارے اور آسرے کی احتیاج نہیں رہتی۔ یہ قوانین اس کے حصولِ مقصد کے لئے کافی ہوتے ہیں۔ انہیں اس بات پر بھی پورا پورا یقین ہوتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ بَالِغُ اَمْرِہٖ۔ اللہ کی ہر اسکیم اپنے نقطۂ تکمیل تک پہنچ کر رہتی ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ وہ درمیان میں جا کر ٹوٹ جائے یا آخرالامر ناکام ثابت ہو۔ یہ اس لئے کہ قَدْ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا (۶۵/۳)۔ اللہ نے ہر شے کے لئے قوانین کے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں۔

انبیاء کرامؑ کا توکّل

جب توکّل عام مومنین کی خصوصیاتِ ایمان میں سے ہے تو ظاہر ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ کا توکّل علی اللہ کس قدر محکم اور غیر متزلزل ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ جب حق کا اعلان کرتے تھے تو وہ عام دنیاوی معیار کے مطابق عموماً بےکس و بےبس، بےساز و سامان، بےیار و مددگار ہوتے تھے اور ان کی دعوت کا پہلا ردِ عمل یہ ہوتا تھا کہ ہر سرکش اور مفاد پرست قوت اپنے پورے طمطراق سے ان کی مخالفت کے لئے اُٹھ کھڑی ہوتی تھی۔ حالات کی اس نامساعدت اور مشکلات کے اس ہجوم میں توکّل علی اللہ کی یہی بےپناہ قوت تھی جو ان کے عزم میں تزلزل اور پائے استقلال میں لغزش نہیں آنے دیتی تھی۔ ساری دنیا ان کے خلاف ہوتی لیکن ان کی چمکنے والی آنکھوں میں گھبراہٹ کے آثار اور دمکنے والی پیشانی پر تشویش کی کوئی شکن نظر نہ آتی۔ حضرت نوحؑ سرکشوں کے نرغے میں گھرے ہوئے ہیں۔ مخالف قوتیں ہر قسم کی ایذا رسانی پر تلی ہوئی ہیں لیکن یہ مُتَوَكِّلٌ عَلَى اللهِ پوری بلند آہنگی سے اعلان کرتے ہیں کہ

اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَ تَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَ شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ (۱۰/۷۱)

"اگر تمہیں یہ بات شاق گزرتی ہے کہ میں تم میں (دعوتِ حق کے لئے) کھڑا ہوں اور قوانینِ خداوندی کے ساتھ تمہیں (بھولے ہوئے راستہ) کی یاد دلاتا ہوں، تو میرا بھروسہ صرف اللہ پر ہے۔ تم میرے خلاف جو کچھ کرنا چاہتے ہو اسے ٹھان لو اور اپنے شریکوں کو بھی ساتھ لے لو۔ پھر جو کچھ تمہارا منصوبہ ہو اسے اچھی طرح سے پرکھ (کر دیکھ لو) کہ کوئی پہلو نگاہوں سے اوجھل نہ رہ جائے۔ پھر جو کچھ میرے خلاف کرنا ہو کر گذرو اور مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو۔ (یہ سب کچھ کر گذرو اور پھر دیکھو کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے)۔"

یعنی یہ سب کچھ کر لینے کے بعد انتظار کرو اور دیکھو کہ تمہاری فتنہ سامانیاں، تمہارے شرکائے کار اور رفقائے تدابیر زیادہ قوی ہیں یا اللہ کا وہ قانون جس پر میں نے بھروسہ کیا ہے! کتنا زبردست ہے یہ چیلنج اور اسے کس حزم و یقین کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے؟ اس "کمزور و ناتواں" اللہ کے بندے کا یہ اعلان بھی دنیا نے سُنا اور اس کے بعد اس کا نتیجہ بھی دیکھ لیا کہ تمام سرکش و متمرّد مخالفین کس طرح حباب آسا

فنا ہو گئے۔

ایسے ہی حالات میں حضرت ھودؑ نے اپنی قوم سے کہا۔

..... فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ○ اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَ رَبِّكُمْ ○ (55—56/11)۔

"تم سب مل کر میرے خلاف جتنی تدبیریں کرنی چاہتے ہو کر گذرو اور مجھے (ذرا بھی) مہلت نہ دو (پھر دیکھو کہ تم میرا کچھ بھی بگاڑ سکتے ہو؟ اس لئے کہ) میرا بھروسہ میرے اللہ پر ہے جو میرا بھی پروردگار ہے تمہارا بھی۔"

حضرت شعیبؑ نے بھی ایسا ہی فرمایا۔

.......اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَ مَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ اُنِيْبُ ○ (11/88 ؛ 7/89)۔

"میں تو اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا کہ جہاں تک میرے بس میں ہے اصلاح کی کوشش کروں۔ میرا کام بننا ہے تو قوانینِ خداوندی کے مطابق بننا ہے۔ میں نے اسی پر بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف رجوع ہوں"!

ملّتِ اسلامیہ کے موسّسِ اوّل، پیکرِ خلّت حضرت ابراہیمؑ نے بھی، ایسا ہی کوہ شکن اور لرزہ انگیز چیلنج اپنی قوم کو دیا تھا جب فرمایا کہ

.....اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَ بَدَا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَ الْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ ..... رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَ اِلَيْكَ اَنَبْنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ○ (60/4)۔

"(اے قوم!) ہم تم سے اور ان سے جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر محکومی اختیار کئے ہو (بالکل) بیزار ہیں۔ ہم (تمہارے ساتھ ہر قسم کے تعلقات سے) انکار کرتے ہیں اور تمہارے اور ہمارے درمیان ہمیشہ کے لئے بغض اور عداوت کھلی ہوئی ہے تا آنکہ تم خدائے یگانہ پر ایمان لے آؤ...... (اس نے اپنے ربّ کو پکارا اور کہا کہ) اے ہمارے پروردگار ہم تجھ پر بھروسہ

رکھتے ہیں تیری طرف رجوع ہیں اور تیری ہی طرف پناہ ڈھونڈتے ہیں۔"

ان انفرادی تذکروں کے علاوہ، اجمالی طور پر تمام انبیاء کرامؑ کے متعلق مذکور ہے کہ جب ان کی قوموں نے ان کی تکذیب کی اور ان کی مخالفت پر اُتر آئے تو انہوں نے جواب میں یہی کہا کہ

.....اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ وَ مَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَ قَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَ لَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ○ (۱۱—۱۲/۱۴)

"ہاں! ہم اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمہاری ہی طرح آدمی ہیں۔ لیکن اللہ جس بندہ کو چاہتا ہے اپنے فضل و احسان کے لئے چن لیتا ہے اور یہ بات ہمارے اختیار میں نہیں کہ تمہارے مقابلہ کے لئے کوئی قوت لے آئیں بجز اس کے کہ وہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہو اور اللہ ہی ہے جس پر ایمان رکھنے والوں کا بھروسہ ہے اور ہمیں کیا ہو گیا ہے کہ ہم اللہ پر بھروسہ نہ کریں، حالانکہ اس نے ہماری راہ نمائی کی ہے اور ہم ان ایذاؤں پر صبر (استقامت) کریں گے جو تم ہمیں دے رہے ہو۔ پس اللہ ہی ہے جس پر بھروسہ کرنے والوں کو بھروسہ کرنا چاہیئے۔"

نبی اکرمؐ کی دعوت الی الحق کے اوّلین ایام میں جس طرح شرارِ بولہبی، چراغِ مصطفویؐ سے ستیزہ کار رہا، وہ ایک طرف سرکشی و تمرّد اور دوسری طرف عزم و استقلال کی ایسی نمایاں مثال ہے جس پر زمانہ شاہد ہے۔ اس سیلابِ مخالفت میں آپ کی ذاتِ گرامی سے جس غیر متزلزل توکل علی اللہ کا ظہور ہوا، وہ ہر مدعیٔ ایمان کے لئے بہترین اُسوہ (نمونہ) ہے۔ یکہ و تنہا، چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغے میں گھرے ہوئے ہیں، لیکن ارشاد ہوتا ہے۔

قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖۤ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ؕ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ؕ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ○

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَ يَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۹/۳۸-۴۰﴾

"ان سے کہو۔ کیا تم نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، اگر اللہ مجھے کوئی تکلیف پہنچانا چاہئے تو کیا یہ اس تکلیف کو مجھ سے دُور کر سکتے ہیں؟ اور اگر وہ اپنی رحمت سے مجھے سرفراز کرنا چاہئے تو اس کی رحمت کو کوئی روک سکتا ہے؟ کہو کہ (جب حالت تو یہ ہے تو) میرے لئے (میرا) اللہ کافی ہے۔ بھروسہ کرنے والے اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ (ان سے) کہو اے میری قوم! تم اپنی جگہ پر (جو کچھ میرے خلاف کرنا چاہتے ہو) کرو۔ میں اپنی جگہ (نظامِ خداوندی کی تشکیل کی) کوشش کرتا ہوں۔ عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ کون ہے جس پر ایک رسوا کُن عذاب آئے گا اور ہمیشہ رہنے والے عذاب کا مستحق ہوگا۔"

کیسے نامساعد حالات ہیں لیکن قوانین پر کس قدر محکم یقین ہے۔ یہی توکّل (اعتماد اور بھروسہ) کی شان ہے۔ انسانوں کی بالعموم کوشش یہ ہوتی ہے کہ غیروں سے بگڑتی ہے تو بگڑ جائے لیکن اپنے خویش واقارب سے نہ بگڑنے پائے کیونکہ مصیبت کے وقت بیگانوں کے مقابلہ میں ان یگانوں کی حمایت پر ہی بھروسہ کیا جاتا ہے، لیکن جو حق کی آواز بلند کرنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے اس کے لئے "یگانہ" اور "بیگانہ" کا معیار بالکل مختلف ہوتا ہے۔ یگانہ وہ جو دعوتِ حق پر لبیک کہے، بیگانہ وہ جو اس سے انحراف کرے۔ اس لئے داعیٔ الی الحق کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ اپنے خویش واقارب سے بنی رہتی ہے یا بگڑتی ہے۔ وہ ان کی حمایت و رفاقت پر بھروسہ ہی نہیں رکھتا تو اسے ان سے بگڑ جانے کا ڈر کس طرح ہو سکتا ہے؟ ارشاد ہوا۔

وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۙ وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۚ وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۙ ﴿۲۶/۲۱۴-۲۱۷﴾

"اپنے قریبی رشتہ داروں کو (دعوتِ حق سے انحراف کے نتائج سے) آگاہ کرو اور یہ ایمان والے جو تیرا اتباع کرتے ہیں، ان سے رافت و محبت کا سلوک کرو (کہ یہی تمہارے "اپنے" ہیں)۔ پس اگر (تمہارے اعزا واقارب) سرکشی اختیار کریں تو ان سے کہہ دو کہ میں تمہارے

اعمال سے بری الذمہ ہوں اور (اس کے بعد ان سے بگاڑ پیدا ہونے سے بالکل نہ ڈرو بلکہ) خدائے عزیز و رحیم (کے قوانین) پر پورا پورا بھروسہ رکھو۔"

سورۂ توبہ، تمام منکرینِ قوانینِ الٰہیہ کے خلاف اعلانِ جنگ تھی۔ اس اعلان کے بعد فرمایا:

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴿۹/۱۲۹؛ ۱۳/۳۰؛ ۲۹/۴۰﴾۔

"اگر یہ لوگ (اس کے بعد بھی) سرتابی کریں، تو ان سے کہہ دو" میرے لئے اللہ کا سہارا کافی ہے۔ کوئی اِلٰہ نہیں مگر اس کی ذات۔ میں نے اسی پر بھروسہ کیا۔ وہ (تمام کائنات کی پروردگاری کے) عرشِ عظیم کا خداوند ہے۔"

سرکشی اور سرتابی کرنے والوں میں سے یہود اس مخالفت میں سب سے زیادہ حصہ لیتے تھے۔ فرمایا کہ ان کی

توکل اسی کا صحیح ہے جو حق پر ہو

مخالفت سے مت گھبراؤ۔ اللہ تعالیٰ کا قانونِ مکافات بہت جلد فیصلہ کر دے گا کہ راہِ راست سے انحراف کرنے والوں کا کیا حشر ہوا کرتا ہے۔ تم عزم و استقلال سے دعوت دیتے جاؤ اور اس کے بعد

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۖ إِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِينِ ﴿۲۷/۷۹﴾

"قوانینِ خداوندی پر بھروسہ رکھو۔ تم صاف صاف حق پر ہو۔"

کھلی ہوئی سرکشی کرنے والوں کے علاوہ ایک طبقہ منافقین کا بھی تھا جو خفیہ سرگوشیاں کرتے تھے۔ فرمایا کہ ان کی سازشوں کی بھی کیا پرواہ ہے۔ تمہارا بھروسہ تو اس خدا پر ہے جو حاضر و غیب، ہر بات سے واقف ہے۔

وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ ۖ وَاللَّهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ ۖ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا ﴿۴/۸۱؛ ۱۰/۵۸﴾

"اور (دیکھو!) یہ لوگ تمہارے سامنے تو تمہاری بات مان لیتے ہیں اور) کہتے ہیں کہ آپ کی ہم اطاعت کرتے ہیں، لیکن جب تمہارے پاس سے اٹھ کر باہر جاتے ہیں تو ان میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو راتوں کو مجلس جماتے ہیں اور جو کچھ تم کہتے ہو اس کے خلاف مشورے کرتے ہیں۔

وہ راتوں کی (ان) مجلسوں میں جو کچھ کرتے ہیں، اللہ سے مخفی نہیں۔ اس کا قانونِ مکافات ان تمام امور کو نوٹ کئے جا رہا ہے۔ پس جب (ان لوگوں کا حال یہ ہے تو) ان سے اعراض برتو اور اللہ پر بھروسہ کرو۔ اللہ کی کارسازی کافی ہے۔"

تم، ان کھلی کھلی سرکشی کرنے والے کفار کی عناں تابیوں اور خفیہ سازشیں کرنے والے منافقین کی ریشہ دوانیوں سے خوف نہ کھاؤ۔ قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے جاؤ۔ اللہ کی نصرت و رحمت ہر مقام پر سایہ فگن ہوگی۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَ لَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ وَّ اتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۙ وَّ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝ (۳۳/۱-۳ ؛ ۳۳/۴۸)

"اے رسول! قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور کفار اور منافقین کی (کوئی) بات نہ مانو۔ بے شک اللہ علیم و حکیم ہے اور تیرے رب کی طرف سے جو تجھ پر وحی کی جاتی ہے اس کا اتباع کرو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سب سے واقف ہے اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ یہ اعتماد اور بھروسہ تمہارے لئے کافی ہے۔

وَکِیل توکّل کے معنی اعتماد اور بھروسہ ہیں۔ اس لئے وَکِیلٌ کے معنی ہیں وہ جس پر اعتماد اور بھروسہ کیا جائے، جس کے سپرد اپنے معاملات کر دیئے جائیں۔ یہ اعتماد اور بھروسہ کا عملی مظاہرہ ہے۔ جو چیز اس شخص کے سپرد کی جائے جس پر اعتماد اور بھروسہ ہو، وہ اس شے کی پوری پوری نگہداشت اور حفاظت کرتا ہے۔ لہٰذا، وَکِیلٌ میں یہ سب خصوصیات آجاتی ہیں۔ اسی بنا پر اللہ کو وَکِیلٌ کہا گیا ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝ (۶/۱۰۳ ؛ ۳۹/۶۲ ؛ ۱۱/۱۲)۔

"یہی تمہارا خدا پروردگار ہے۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا۔ (سو دیکھو) اسی کی عبودیت اختیار کرو اور وہ ہر شے کا نگہبان و محافظ ہے!

کائنات کا خالق، ہر شئے کا پروردگار، ہر چیز کا نگہبان، تو پھر اس سے بڑھ کر اور کس کی حفاظت اور نگہبانی، کارسازی اور چارہ فرمائی ہوگی۔

وَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا ﴿۴/۱۳۲﴾

"جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، سب اللہ ہی کے لئے ہے (اسی کی ملک ہے) اور اس کی نگہبانی (اور کارسازی بالکل) کافی ہے (جسے اس کی نگہبانی میسر آجائے اسے کسی اور کی حفاظت کی ضرورت نہیں رہتی)۔"

اسی لئے فرمایا کہ سفرِ زندگی میں حفاظت طلب کرو تو اسی کی۔ رفاقت اور کارسازی کے لئے آنکھ اٹھاؤ تو اسی کی بارگاہ کی طرف۔ بھروسہ اور اعتماد کرو تو اسی کے قوانین پر۔

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ فَاتَّخِذْہُ وَکِیْلًا ﴿۷۳/۹﴾

"مشرق و مغرب کا رب، اس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں۔ پس اسی کو اپنا نگہبان بناؤ، (اسی کی حفاظت پر بھروسہ رکھو)۔"

اس کے سوا کسی اور کو نگہبان نہ سمجھو۔ کسی کی حفاظت پر اعتماد نہ رکھو۔ یہی حکم بنی اسرائیل کو توریت میں دیا گیا تھا۔

وَ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَ جَعَلْنٰہُ ہُدًی لِّبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَکِیْلًا ؕ ﴿۱۷/۲﴾۔

"اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اسے بنی اسرائیل کے لئے ہدایت کا (ذریعہ) ٹھہرایا۔ (اور حکم دیا) کہ (دیکھو) میرے سوا کسی اور کو اپنا نگہبان (و کارساز) نہ بناؤ!"

اور جو اپنے دل کے تذبذب، ایمان کی کمزوری اور ابلیسانہ وساوس کی بنا پر کسی اور پر بھروسہ کرلے، تو وہ انجامِ کار دیکھ لے گا کہ اس کے تمام آسرے کمزور، سب سہارے بودے اور جملہ محافظ بے بس و ناتواں نکلے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اگر قوانینِ خداوندی کو چھوڑ کر دوسرے آئین و ضوابط پر بھروسہ کرلے تو وہ آئین قطعاً اس کی محافظت نہیں کرسکتے۔ بالفاظِ دیگر جو خدا کے قوانین کو اپنا وکیل نہیں بناتا اس کا دنیا میں کوئی وکیل نہیں ہوسکتا۔ یا یہ کہ قوانینِ خداوندی کے خلاف کوئی قوت، نگہبانی اور محافظت نہیں کرسکتی۔ چنانچہ خود نبیٔ اکرمؐ سے کہا گیا کہ

وَ لَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ۙ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ﴿۸۷-۸۶/۱۷﴾

"(اے پیغمبر!) جو کچھ ہم نے تم پر وحی کیا ہے اگر ہم چاہیں تو اسے سلب کر لیں۔ پھر تجھے کوئی نہ ملے جو اس کے لئے ہم پر وکالت چلائے۔ لیکن یہ محض تیرے پروردگار کی رحمت ہے (کہ وہ ایسا نہیں کرتا) اس میں شک نہیں کہ اس کا تجھ پر بڑا ہی فضل ہے!"

عجمی اور قرآنی توکل

یہ ہے توکل کا قرآنی مفہوم۔ اس کے برعکس یہ دیکھئے کہ ہمارے ہاں اس کا کیا مفہوم لیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں حالت یہ ہے کہ جب ایک شخص کوئی کام نہ کرے، ایک جگہ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے، تمام اسباب و ذرائع ترک کر دے، کسی چیز کے حصول کے لئے کسی قسم کی جدّوجہد نہ کرے، دوسروں کی کمائی پر تکیہ لگائے بیٹھا رہے تو اس کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ "توکّل علی اللہ" بیٹھا ہے، بڑا متوکل ہے اور یہ چیز خوبی اور بزرگی، "زہد و تقویٰ" میں شمار کی جاتی ہے۔ وہ جس قدر اس قسم کے "توکل" میں آگے بڑھتا جائے، اسی قدر زیادہ واجب التکریم سمجھا جاتا ہے۔ لیکن آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ یہ اسلام کی تعلیم ہو سکتی ہے؟ وہ اسلام جو پیہم جدّوجہد، مسلسل تگ و دو، غیر منقطع سعی و کاوش، عمل اور یکسر عمل، جہاد اور ہمہ تن جہاد کا ضابطۂ حیات ہے۔ کیا اس کی تعلیم ایسی ہو سکتی ہے جس سے انسان کی تمام عملی قوتیں مفلوج اور زندہ طاقتیں شل ہو کر رہ جائیں؟ کیا اسلام میں توکل کا یہی مفہوم ہو گا کہ

لب بہ بند و گوش بند و چشم بند

ہاتھ پر ہاتھ دھرے ساکت و صامت، لاش کی طرح انسانیت کے کندھوں پر بوجھ بنا رہے؟ اسلامی تعلیم ایسا کبھی نہیں سکھا سکتی۔ یہ یکسر غیر اسلامی نظریہ اور عجمی تصوّراتِ زندگی کا نتیجہ ہے، یعنی وہ تصورات جو ترکِ علائق، ترکِ آرزو اور ترکِ اسباب میں ہی کمالِ انسانیت بتاتے ہیں۔ یہی وہ غیر قرآنی تصورات ہیں جنہوں نے "مسلمان" کے پیکرِ برق کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا اور وہی توکل جو کبھی اللہ کے جانبازوں کے ہاتھ میں شمشیرِ جگر دار کی شکل میں جلوہ ریز ہوتا تھا، اس کے پاؤں میں زنجیر بن کر لپٹ گیا۔ قرآنی توکل ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ جب کوئی معاملہ سامنے آئے تو سب سے پہلے یہ دیکھو کہ اصولی طور پر اس پر کون سے قانونِ خداوندی کا

اطلاق ہوگا۔ اس کے بعد اپنے رفقائے کار کی مشاورت سے اس کی جزئیات و تضمنات پر غور کرو۔ اس طرح جب ایک پختہ فیصلہ پر پہنچ جاؤ، تو پھر عزم راسخ سے اس پر چل نکلو اور اس قانونِ خداوندی پر، جس کے مطابق تم اس پر عمل پیرا ہوئے ہو، پورا اعتماد اور بھروسہ رکھو۔ یہی وہ تعلیم ہے جو نبی اکرمؐ (اور حضورؐ کی وساطت سے اُمّتِ مسلمہ) کو دی گئی۔ چنانچہ آپ سے ارشاد ہوا کہ

وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ○ (۳/۱۵۸)۔

"اور لوگوں سے معاملہ میں مشورہ کرو۔ پھر جب ایسا ہو کہ تو نے کسی بات کا عزم کر لیا تو چاہیئے کہ خدا پر بھروسہ کرو (اور جو کچھ ٹھان لیا ہے اس پر کاربند ہو جاؤ) یقیناً اللہ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اس پر اس طرح بھروسہ رکھتے ہیں"۔

داستانِ بنی اسرائیل میں توکل کا صحیح مفہوم نہایت واضح انداز میں سامنے لایا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا۔

يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَ لَا تَرْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خٰسِرِينَ ○ (۵/۲۱)۔

" لوگو! (اُٹھو اور) اس مقدس سرزمین میں، جسے خدا نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے، داخل ہو جاؤ اور اُلٹے پاؤں پیچھے کی طرف نہ ہٹو کہ (اس طرح) نقصان اور تباہی میں پڑ جاؤ گے"۔

غور کیجئے! یہاں کہا گیا ہے کہ "یہ وہ سرزمین ہے جسے اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے، مقدر کر دیا ہے۔ خدائی تقسیم کے مطابق یہ تمہارے حصہ میں آ چکی ہے۔ اُٹھو اور اس پر قبضہ کر لو۔ مگر

قَالُوا يٰمُوسٰى إِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَبَّارِينَ ۖ وَ إِنَّا لَنْ نَدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوا مِنْهَا ۚ فَإِنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنَّا دٰخِلُونَ ○ (۵/۲۲)۔

"انہوں نے کہا اے موسیٰ! اس سرزمین میں تو ایسے لوگ آباد ہیں جو بڑے زبردست ہیں۔ جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں، ہم کبھی اس سرزمین میں قدم نہیں رکھیں گے۔ ہاں اگر وہ لوگ وہاں سے نکل گئے، تو پھر ہم ضرور داخل ہو جائیں گے"۔

یہ وہ قوم تھی جس کے قوائے عملیہ مضمحل ہو چکے تھے، جس کی ہمتیں پست اور حوصلے افسردہ ہو چکے تھے۔ وہ

خود اُٹھنا نہیں چاہتی تھی، بلکہ چاہتی یہ تھی کہ سب کام خود بخود ہو جائیں اور ان کے نتائج بیٹھے بٹھائے ان کی جھولی میں آ پڑیں۔ یہ اسی قسم کا "توکّل" تھا جو آجکل ہمارے ہاں رائج ہے۔ لیکن اسی قوم میں جن لوگوں نے توکّل کا صحیح مفہوم سمجھ لیا تھا انہوں نے کہا۔

قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَ عَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ (۵/۲۳)۔

"(اس پر) دو آدمیوں نے کہ اللہ سے ڈرنے والوں میں سے تھے اور خدا نے انہیں (ایمان و بصیرت کی) نعمت سے نوازا تھا، لوگوں سے کہا (کہ اس قدر بزدل کیوں بن رہے ہو) ہمت کر کے ان لوگوں پر جا پڑو اور (شہر کے) دروازے میں داخل ہو جاؤ اگر تم (ایک مرتبہ) داخل ہو گئے تو پھر غلبہ تمہارے ہی لئے ہے اور اگر تم ایمان رکھنے والے ہو تو چاہیئے کہ اللہ پر بھروسہ کرو۔"

اس سے واضح ہو گیا کہ توکّل کا صحیح مفہوم کیا ہے، یعنی حصولِ مقصد کے لئے عزمِ راسخ سے اُٹھ کھڑے ہو۔ پھر قانونِ خداوندی کی تائید تمہارے شاملِ حال ہو گی۔ لیکن بنی اسرائیل توکّل کے اس صحیح مفہوم کو کب مانتے تھے۔ وہ اُس مفہوم کے قائل تھے جو ہمارے ہاں آج مروّج ہے۔ انہوں نے کہا کہ جب وہ سرزمین ہمارے لئے مقدّر کر دی گئی ہے تو ہمیں جدّ و جُہد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ قسمت کا لکھا خود بخود مل کر رہیگا۔ وہ اسی غلط عقیدہ سے ذلّت و ناکامی کی امن پسند غلامانہ زندگی بسر کرنے پر قانع ہو چکے تھے۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ○ (۵/۲۴)۔

"کہنے لگے "اے موسیٰ! جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں، ہم کبھی اس میں داخل نہ ہونگے (اور اگر اس کے لئے جدّ و جہد کرنا ایسا ہی ضروری ہے) تو تم خود جاؤ اور تمہارا خدا (یا تمہارا بھائی) بھی تمہارے ساتھ چلا جائے۔ ہم یہاں بیٹھے رہیں گے تم دونوں وہاں (ان لوگوں سے) لڑتے رہنا۔"

کیا یہ وہی جواب نہیں جو "عجمی توکّل" کا علمبردار آج بھی کشمکشِ حیات کے ہر مرحلہ میں اپنے ہاں اپنے عمل سے دیتا ہے؟ سوال یہ ہے کہ کیا اس قسم کے "توکّل" سے وہ سرزمین جو بنی اسرائیل کے لئے مقدّر ہو چکی تھی انہیں مل گئی؟ کیسے مل سکتی تھی۔ چنانچہ حکم ہوا کہ جب ان کا یہ حال ہے تو

فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ○ (۵/۲۶)۔

"اب چالیس برس تک وہ سرزمین ان پر حرام کردی گئی ہے۔ یہ اسی بیابان میں سرگرداں رہیں گے۔ سو اے موسٰے، تو نافرمان لوگوں کی حالت پر غمگین نہ ہو کہ وہ اپنی بدعملیوں سے اسی کے مستحق ہیں!"

چالیس برس کی صحرانوردیوں اور دشت پیمائیوں سے پچھلی نسل، سینا کے میدانوں میں ختم ہوگئی اور ایک نئی نسل پیدا ہوئی جس نے بیابان کی آزاد آب و ہوا میں، وحیِ خداوندی کے مطابق نشوونما پائی۔ وہ اُٹھی، بڑھی اور پوری پوری جدوجہد سے اس زمین پر قابض ہوگئی جو بنی اسرائیل کے لئے مقدر کردی گئی تھی۔

اس سے معلوم ہوگیا کہ صحیح توکل کے کیا معنی ہیں اور اس کا غلط مفہوم کیا ہے۔ اسی لئے حضرت موسٰیؑ نے اپنی قوم کو تاکید کی تھی کہ اللہ پر صحیح بھروسہ کرنا سیکھو کہ اسی سے غلامی و محکومی کے اس عذابِ الیم سے نجات پاسکو گے۔

وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ○ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ○

(۸۴ — ۱۰/۸۶)

"اور موسٰی نے اپنی قوم سے کہا۔ "لوگو! اگر تم فی الحقیقت اللہ پر ایمان لائے ہو اور اس کی فرمانبرداری کرنا چاہتے ہو تو اس پر بھروسہ رکھو۔ انہوں نے کہا۔ ہم اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں (اور دعا کرتے ہیں کہ) پروردگار! ہمیں اس ظالم گروہ کے لئے آزمائشوں کا موجب (ان کا تختۂ مشق) نہ بنائیو اور اپنی رحمت سے ایسا کیجئو کہ اس سرکش گروہ سے ہم نجات پائیں۔"

یہی دعا حضرت موسٰےؑ اور ہارونؑ نے بھی مانگی تو اس کے جواب میں ارشاد ہوا۔

قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (۱۰/۸۹)۔

"اللہ نے فرمایا! اور میں نے تم دونوں کی دعا قبول کی۔ تو اب تم (اس جہاد میں) جم کر کھڑے ہو جاؤ اور ان لوگوں کی راہ اختیار نہ کرو (جو حق کی راہ نہیں جانتے)۔"

توکل اور قبولیتِ دعا کے معنی یہ ہوئے کہ جس مہم کا عزم کر لیا ہے اس پر جم کر کھڑے ہو جاؤ اور وہ طریق کار اختیار کرو جو قانونِ خداوندی کے مطابق ہو. کامیابی یقینی ہو گی.

حضرت نوحؑ نے جب اپنی قوم سے کہا کہ تم جو جی میں آئے کر گزرو، میرا توکل میرے خدا پر ہے تو کیا اس کے بعد وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گئے؟ نہیں! انہوں نے پوری محنت اور کوشش سے وحیٔ الٰہی کی راہ میں کشتی بنائی اور جب سیلاب اُمنڈ کر آ گیا تو اس کشتی کو بلا انگیز طغیانیوں میں یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ اے پروردگار! اس طوفان کی ہلاکت سامانیوں سے بچنے کے لئے جو تدبیر مجھ سے ہو سکتی تھی تیرے حکم سے میں نے کر لی. اب یہ کشتی تیرے حوالے ہے. تیرے قانون کی تائید شاملِ حال ہوئی تو یہ ساحل تک جا پہنچے گی. چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ اس طوفان میں، جس نے تمرّد و سرکشی کے کسی آثار کو باقی نہ رہنے دیا، اگر کچھ بچا تو وہی کشتی تھی جو اللہ کے اس مخلص بندے کے ناتواں ہاتھوں نے بنائی تھی اور جسے قانونِ خداوندی کے بھروسے پر موجوں کے حوالے کر دیا گیا تھا.

صدرِ اوّل کے مسلمان اور توکل

اُمم سابقہ کے تذکار کے بعد اُس دور کی طرف آئیے جس میں اللہ کے مخلص بندوں کے اعمالِ حیات، قرآنی نظریاتِ زندگی کی عملی تفسیریں تھے. دیکھئے کہ اُس دور میں توکل کا قرآنی مفہوم کیا تھا. سورۂ انفال میں ہے.

وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ...... يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۝

(۸/۶۴—۶۰)

"(مسلمانو)، جہاں تک تمہارے بس میں ہے، قوت پیدا کر کے اور گھوڑے تیار رکھ کر دشمنوں کے مقابلہ کے لئے اپنا ساز و سامان مہیا کئے رہو کہ اس طرح مستعد رہ کر تم اللہ (کے کلمۂ حق) کے، اور اپنے، دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے. نیز ان (سامنے کے لوگوں کے علاوہ) اوروں پر بھی جن کی تمہیں خبر نہیں (لیکن) اللہ انہیں جانتا ہے. (اور یاد رکھو) اللہ کی راہ (یعنی جہاد کی تیاری) میں جو کچھ تم صرف کرو گے، وہ تمہیں پورا پورا مل جائے گا. ایسا نہ ہو گا کہ تمہاری حق تلفی

ہو اور (دیکھو) اگر (دشمن) صلح کی طرف جھکیں، تو چاہیئے کہ تم بھی اس کی طرف جھک جاؤ اور (ہر حال میں) قوانینِ خداوندی پر اعتماد رکھو۔ بلاشبہ وہی ہے جو سب کی سنتا اور سب کچھ جانتا ہے اور (اے رسول) اگر ان (صلح کی طرف جھکنے والوں) کا ارادہ ہو کہ تجھے دھوکہ دیں، تو (کوئی اندیشہ کی بات نہیں) قوانینِ خداوندی کی تائید و نصرت تیرے لئے کافی ہے۔ وہی ہے جس نے اپنی مددگاری سے اور مومنوں (کی جماعت) سے تیری تائید کی اور وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں باھمی اُلفت پیدا کر دی۔ اگر تو وہ سب کچھ صرف کر ڈالتا جو روئے زمین میں ہے، جب بھی ان کے دلوں کو باہمی الفت سے نہ جوڑ سکتا۔ لیکن یہ اللہ ہے جس نے باہمی اُلفت پیدا کر دی۔ بلاشبہ وہ (اپنے کاموں میں) غالب اور حکمت والا ہے"۔

"اے رسول! اللہ تیرے لئے کفایت کرتا ہے اور ان مومنوں کو بھی جو تیرا اتباع کرتے ہیں"۔

ان آیاتِ جلیلہ پر غور فرمایئے اور دیکھئے کہ توکل علی اللہ، نصرتِ الٰہی، کامیابی و کامرانی، حفاظتِ خداوندی، کفایتِ ایزدی کے لئے قرآنِ کریم نے کیا نظام مقرر کیا ہے۔ (دیکھئے کہ اس سلسلہ کی مختلف کڑیاں کیا ہیں۔ نظام خود بخود واضح ہو جائیگا۔

(۱) رسولؐ (اور رسولؐ کے بعد جانشینِ رسولؐ یعنی زندہ مرکزِ ملت) کی موجودگی۔

(۲) مرکزِ حقہ کی اطاعت کرنے والی جماعتِ مومنین۔

(۳) وہ جماعت جس کے افراد کے دلوں میں باہمی اُلفت اور مودّت سے یک جہتی اور باہمدگر پیوستگی پیدا ہو چکی ہو۔

(۴) اس جماعت میں ایسی مادّی قوّت موجود رہے جو حاضر و غائب، تمام دشمنوں کے مقابلہ کے لئے کافی ہو اور دشمنوں کے دلوں پر اس سے دھاک بیٹھ جائے۔

(۵) وقت پڑنے پر اس مقصدِ عظیمہ کی خاطر سب کچھ قربان کر دیا جائے۔

(۶) اس جلال کے ساتھ جمال کی یہ کیفیت کہ جونہی دشمن صلح کے لئے جھکے، یہ بھی فوراً جھک جائیں۔

(۷) دشمن دھوکہ دے تو دے، یہ کبھی دھوکا نہ دیں۔ معاملہ کے صاف ہوں۔

(۸) اس تمام ساز و سامان، اور اس بلند کیرکٹر (تقویٰ) کی متاع کے ساتھ اللہ پر توکل رکھیں اور اس کی

نصرت ورفاقت کے متمنّی رہیں۔

جب یہ نظام پیدا ہوجائیگا تو پھر توکل علی اللہ کا یہ نتیجہ ہوگا کہ

اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ○ (۸/۶۵)۔

"اگر تم میں ثابت قدم رہنے والے بیس مجاہد بھی ہوئے تو وہ دو سو دشمنوں پر غالب ہو کر رہیں گے۔ اور تم میں ایسے آدمی سو ہو گئے تو سمجھ لو کہ ہزار دشمنوں کو مغلوب کر کے رہیں گے اور یہ اس لئے کہ یہ کفار کی جماعت (قوانینِ خداوندی کی متابعت کے نتائج کی) سمجھ بوجھ نہیں رکھتی!"

اسی نظام کی لڑی میں پروئے ہوئے مجاہدین تھے جن کی قلبی کیفیات کا یہ عالم تھا کہ جب ان سے کہا جاتا کہ دشمن بہت بڑی جمعیت اور ساز و سامان کے ساتھ آمادۂ پیکار ہے، تو وہ خوف زدہ ہونے کے بجائے اور دلیر ہوجاتے اور دل کی پوری طمانیت سے کہہ دیتے کہ "ہُوا کیا؟ دشمن اگر قوی ہے تو جس پر ہمارا بھروسہ ہے، وہ قوی تر ہے۔"

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ○ (۳/۱۷۲)

"یہ وہ لوگ ہیں جن سے جب لوگوں نے کہا کہ "تم سے جنگ کرنے کے لئے دشمنوں نے بہت بڑا گروہ جمع کر لیا ہے پس چاہیئے کہ ان سے ڈرتے رہو"، تو (اس سے خوف زدہ ہونے کی بجائے) ان کا ایمان اور زیادہ مضبوط ہوگیا اور وہ (بے خوف و خطر) بول اٹھے "ہمارے لئے اللہ کا سہارا کافی ہے" اور جس کا کارساز (محافظ) اللہ ہو تو وہ کیا ہی اچھا کارساز ہے۔

اس غیر متزلزل اور کوہ آسا توکّل کا نتیجہ کیا نکلا؟

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ○ (۳/۱۷۴)

"یہ لوگ اللہ کی نعمت اور فضل سے شاد کام واپس آئے۔ کوئی گزند انہیں چھو نہ سکا اور

انہوں نے قوانینِ خداوندی کی پوری پوری متابعت کی۔ (یہ نعمتیں اس کا نتیجہ تھیں) اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے۔"

یہی وہ نتائج تھے جن کی یاد دلا کر تقویٰ اور توکل کی تاکید کی جاتی تھی۔ فرمایا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ یَّبْسُطُوْۤا اِلَیْكُمْ اَیْدِیَهُمْ فَكَفَّ اَیْدِیَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۵/۱۱﴾۔

"اے ایمان والو! اپنے اوپر اللہ کے اس احسان (نعمت) کو یاد کرو کہ جب ایک گروہ نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ تم پر (ہلاکت کا) ہاتھ بڑھائے، تو خدا نے اس کے ہاتھ تمہارے خلاف بڑھنے سے روک دیئے (سو جب اللہ کی حفاظت کا یہ عالم ہے تو) ہمیشہ قوانینِ الٰہیہ کی نگہداشت کرو اور اللہ ہی ہے جس پر مومنوں کو توکل کرنا چاہیئے۔"

یہ تقویٰ اور توکل کی بے پناہ قوت تھی جس نے باوجود تھوڑی تعداد اور نسبتاً کم ساز و سامان کے مسلمانوں کو اس قدر عزم و ثبات اور بلند حوصلگی عطا کر رکھی تھی کہ وہ بڑے سے بڑے معرکہ میں بھی گھبراتے نہ تھے۔ مخالفین اس راز کو سمجھ نہیں سکتے تھے۔ وہ اس کی تاویل میں عجیب عجیب باتیں بنایا کرتے تھے۔ اور ایک ان ہی پر کیا موقوف ہے، یورپ کا مؤرخ، جو ایمان و تقویٰ کی قوتوں سے ناواقف ہے، آج تک نہیں سمجھ سکا کہ مسلمانوں کی ان عدیم النظیر قوتوں کا راز کیا تھا اور جب اپنی بے بصری کی وجہ سے حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا تو پھر افسانہ طرازیاں شروع کر دیتا ہے۔ یہی حالت منافقین کی تھی۔ ہر چند اُن کی زبان، تقویٰ و توکل کے الفاظ سے آشنا تھی لیکن دل، ان الفاظ کی روح سے بیگانہ تھے۔ اس لئے وہ طنزاً کہا کرتے تھے کہ دیکھئے! انہیں ان کے دین کے نشہ نے کس قدر مغرور کر دیا ہے کہ مٹھی بھر جماعت ہے اور ارادے زمین و آسمان کی تسخیر کے کر رہی ہے۔

اِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰۤؤُلَآءِ دِیْنُهُمْ ؕ وَ مَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۸/۴۹﴾۔

"اور جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں (ایمان کی کمزوری کا) روگ تھا، کہنے لگے "ان مسلمانوں کو تو اُن کے دین نے مغرور کر دیا ہے (وہ نہیں جانتے تھے کہ مسلمانوں کا اللہ پر بھروسہ ہے)۔

اور جس کسی نے اللہ پر بھروسہ کیا تو وہ غالب اور حکمت والا ہے۔"

لیکن اس کے ساتھ ہی مسلمانوں پر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ اللہ کی نصرت اس پر موقوف ہے کہ تم ہمت نہ ہارو، بزدلی نہ دکھاؤ۔ توکل کا عملی ثبوت یہ ہے کہ تم ثابت قدم رہو۔ چنانچہ اس کی مثال جنگِ اُحد میں سامنے آگئی۔ وہی مسلمان تھے، اُسی حق و صداقت کی خاطر میدان میں نکلے تھے۔ لیکن شروع میں ہی دو قبیلے منافقین کے بہکانے میں آکر بد دل ہو گئے اور یوں صبر (ثباتِ دل) اور توکل (قانونِ الٰہی پر غیر متزلزل بھروسہ) کی روح کمزور پڑ گئی۔ نتیجہ یہ کہ جن دشمنوں کو ابھی کل، بدر کے میدان میں، ۳۱۲ کی قلیل ترین جماعت نے شکست دی تھی، میدانِ اُحد میں انہی سے شکست کھا گئے۔

إِذْ هَمَّت طَّائِفَتَانِ مِنكُمْ أَن تَفْشَلَا وَاللَّهُ وَلِيُّهُمَا ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿۳/۱۲۱﴾۔

"اور جب تم میں سے دو جماعتوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ ہمت ہار دیں (اور واپس لوٹ چلیں) حالانکہ ان کا مددگار اللہ تھا اور جو ایمان رکھنے والے ہیں، انھیں تو چاہیئے کہ (ہر حال میں) اللہ پر بھروسہ رکھیں۔"

ہجرت اور توکل مومن کے لئے وہی فضا سازگار ہو سکتی ہے جس میں قوانینِ الٰہیہ کے مطابق زندگی بسر ہو سکے۔ اس کے علاوہ ہر فضا اس کے لئے ناسا عد ہے۔ اگر کہیں فضا ناسازگار ہو تو اس پر فریضہ عائد ہو جاتا ہے کہ اسے سازگار بنائے۔ لیکن اگر اس کی کوششوں کے باوجود سازگار نہ بن سکے تو دوسری شکل یہ ہے کہ اس زہر آلود فضا میں سانس لینے کے بجائے کسی ایسے مقام کی طرف نکل جائے جہاں یا تو سازگار فضا پہلے سے موجود ہو یا اسے سازگار بنانے کے امکانات زیادہ ہوں۔ اسی کا نام ہجرت ہے (تفصیل اس کی معراجِ انسانیت میں ملے گی)۔ یہ مقام بڑا ہمت طلب ہوتا ہے۔ انسان کو اپنے گرد و پیش سے اُنس ہوتا ہے۔ کششِ علائق الگ دامنگیر ہوتی ہے۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ معاش کے ذرائع لگے بندھے اور اس کی شکلیں متعین ہوتی ہیں۔ ان سب کو چھوڑ کر ایک "نئی دنیا" کی طرف چل دینا، یہ بہت بڑا صبر (استقامت) اور عظیم الشان توکل (خدا پر بھروسہ) چاہتا ہے۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جنہیں گراں قدر جوہر قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا:۔

وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا فِی اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً ؕ وَ لَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ۙ اَلَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَ عَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ۝ (۴۱ — ۱۶/۴۲)۔

"جن لوگوں نے اللہ کے لئے ہجرت کی' بعد اس کے کہ ان پر ظلم ہوا تھا' تو ہم انہیں ضرور اس دنیا میں اچھا ٹھکانہ دیں گے اور آخرت کا بدلہ تو کہیں بڑھ کر ہے۔ اے کاش! (یہ منکرین بھی اس حقیقت کو) جانتے (مہاجرین) وہ لوگ ہیں جو ثابت قدم رہے اور اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں"۔

اس اجمال کی تفصیل سورۂ عنکبوت میں ان الفاظ میں فرما دی۔

یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ ۝ ...... وَ كَاَیِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖۗ اَللّٰهُ یَرْزُقُهَا وَ اِیَّاكُمْ ۖ ۗ وَ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝ (۵۶ — ۲۹/۶۰)۔

"اے میرے بندو! جو ایمان کے مدعی ہو، یقیناً میری زمین بڑی وسیع ہے (اس لئے کسی خاص خطۂ زمین میں شکستہ پا بیٹھے رہنے کی کوئی وجہ نہیں) تمہیں چاہیئے کہ صرف میری ہی محکومیت اختیار کرو (ایک جگہ ناسازگار ہے تو دوسری جگہ سہی۔ اگر موت کا ڈر مانع ہو تو یاد رکھو) ہر جاندار کو موت کا ذائقہ چکھنا ہوگا۔ پھر تم (سب) ہماری طرف لائے جاؤ گے۔ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالح کئے تو ہم انہیں یقیناً ان باغات (جنت) میں بلند مقام پر جگہ دیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی (کہ ان کی شادابی میں کبھی فرق نہیں آئیگا) وہ اس میں رہیں گے۔ کام کرنے والوں کے لئے کتنا اچھا اجر ہے۔ (یعنی) وہ لوگ جو ثابت قدم رہتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ (توکل) رکھتے ہیں اور (غور کرو کہ) کس قدر ایسے ذی حیات ہیں جو اپنی پشت پر اپنا رزق لادے لادے نہیں پھرتے اللہ انہیں (بھی) رزق دیتا ہے اور وہ سننے والا جاننے والا ہے"۔

متوکلین اور مہاجرین کو یہ رزق کس طرح سے ملتا ہے اور اس کے حصول کی کیا شرائط ہیں، یہ چیزیں رزاقیت اور فضل کے عنوانات میں بیان کی جا چکی ہیں۔ اس مقام پر صرف اس قدر دیکھنا ہے کہ صبر اور توکل' وہ قوتیں

ہیں جن کی بنا پر ایک عبدِ مومن اُن تمام خاردار جھاڑیوں سے دامن بچا کر آگے بڑھ جاتا ہے جو اس کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ یہی وہ علائق تھے جو کفار کو قبولیتِ حق سے روکتے تھے۔

وَ قَالُوْۤا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ؕ ...... فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ؕ وَ كُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ○ (۲۸/۵۷ — ۵۸)

" اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم (اے رسول! تیرے ساتھ ہدایت کا اتباع کرتے ہیں (تو ہمیں خطرہ ہے کہ مخالف قوتیں) ہمیں اس سرزمین سے اُچک کر لے جائیں گی (ان سے کہو کہ) کیا ہم نے انہیں امن کے مقام (حرم) میں متمکن نہیں کیا، جس کی طرف ہر قسم کے پھل کھنچے چلے آتے ہیں جو ہمارے ہاں سے (بطور) رزق دیئے جاتے ہیں، لیکن ان میں سے اکثر (اس حقیقت کو نہیں جانتے)۔

اور پھر دوسری طرف اس پر بھی غور کرو کہ ہم نے کتنی بستیاں ایسی برباد کر دیں جو اپنی معیشت (کی فراوانی) پر اتراتی تھیں۔ یہ (دیکھو ان کے (اُجڑے ہوئے) کاشانے ہیں جو ان کے بعد بہت کم آباد ہوتے اور ان کے وارث ہم ہی ہوئے۔

اس لئے کہ انہوں نے اپنی ہنرمندی اور کاریگری ہی کو کافی سمجھ لیا اور قوانینِ خداوندی سے سرکشی اختیار کر لی۔ انہوں نے ان تدابیر پر بھروسہ کیا جو پائیدار نہ تھیں۔ انہوں نے ان کا آسرا پکڑا جو ایک دن خود بخود ختم ہو جانے والے تھے۔ انسان اعتماد کرے تو اس پر جو زندہ ہو اور ہمیشہ زندہ رہے۔ اس زندہ و پائندہ خدا کا قانون ہی اس قابل ہے کہ انسان اس پر اعتماد کرے۔

وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ (۲۵/۵۸)

" اس (خدائے) زندہ پر بھروسہ کرو جسے کبھی موت نہیں آسکتی!"

یہی ہستی بھروسہ کے قابل ہے۔ اسی پر کامل اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَ اِلَيْهِ اُنِيْبُ ○ (۴۲/۱۰)

" یہ ہے تمہارا اللہ، میرا پروردگار۔ میں اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی کی طرف (تمام مشکلات میں) رجوع کرتا ہوں۔

یہ ہے ایک عبدِ مومن کا ایمان اور اس کا مسلکِ حیات، یعنی قوانینِ الٰہیہ کی محکمیت پر پورا پورا الیقین اور اعتماد۔ اس

سے یہ بھی واضح ہے کہ جس فرد کی ذات نشوونما یافتہ ہو اور اس طرح اس میں صفاتِ خداوندی منعکس ہوں، وہ فرد اور ایسے افراد پر مشتمل جماعت اور ان کا متشکّل کردہ نظام، اس خصوصیتِ کبریٰ کا حامل ہوگا کہ اس کی ہر بات پر پورا پورا بھروسہ اور اعتماد کیا جا سکے۔ وہ کسی کو دھوکا نہیں دیں گے، کسی سے دغا اور فریب نہیں کرینگے۔ ان کا ہر وعدہ اور ہر معاہدہ محکم ہوگا۔ وہ جب جس سے، جو کچھ کہہ دیں گے، اسے یقین ہوگا کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ وہ جس حزم و یقین کے ساتھ قوانینِ خداوندی کی محکمیّت پر بھروسہ کریں گے، اسی حزم و یقین کے ساتھ دنیا اُن پر اعتماد کرے گی۔ سوچئے کہ دنیا میں اس قسم کی جماعت اور اس نوعیت کے نظام کی موجودگی کس قدر سکون و اطمینان کا موجب ہوگی۔ قرآن اسی قسم کے افراد اور اسی انداز کا نظام پیدا کرنا چاہتا ہے۔

۲۳

ولایت

اَلوَلِیُّ

اَلوَلِیُّ کے بنیادی معنی ہیں کسی کے قریب اور نزدیک ہونا. ہم سابقہ ابواب میں دیکھ چکے ہیں کہ خدا اور بندے کا تعلق باہمی رفاقت کا ہوتا ہے. اس اعتبار سے یہ ایک دوسرے کے ولی قرار پاتے ہیں لیکن، اس رفاقت کے لئے ضروری ہے کہ انسان، قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرے. اس اعتبار سے جب انسان کے متعلق کہا جائے کہ وہ "اللہ کا ولی" ہے، تو اس سے مراد ہوگی قوانینِ خداوندی کا مطیع ہونے کی حیثیت سے خدا کے تخلیقی پروگرام میں رفیق اور جب اللہ کے متعلق کہا جائے گا کہ وہ انسان کا ولی ہے تو اس سے مقصود یہ ہوگا کہ جو اس کے قوانین کی اطاعت کرتا ہے وہ اس کا رفیق بن جاتا ہے. اس جہت سے (کہ خدا کے قوانین کی اطاعت کی جاتی ہے) ولایت کے معنی غلبہ واقتدار، حکومت وسطوت اور محافظت و سرپرستی بھی ہوتے ہیں لیکن جب دو انسانوں کے متعلق کہا جائے گا کہ وہ ایک دوسرے کے ولی ہیں، تو اس سے مفہوم برابر کی رفاقت اور دوستداری کے ہوں گے. مثلاً وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (۹/۷۱) "مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست اور مددگار ہیں"۔

سورۂ کہف میں دو باغ والوں کی مثال بیان ہوئی ہے. اُن میں سے ایک اپنی خوشحالی کے نشہ میں ایسا بدمست ہُوا کہ اس نے خدا کی سرپرستی اور کارسازی سے ہی انکار کر دیا اور سمجھ بیٹھا کہ سب کچھ اس کی اپنی

کاریگری اور ہنرمندی کی بدولت حاصل ہو رہا ہے۔ اس میں قوانینِ خداوندی کا کوئی عمل دخل نہیں۔ نتیجہ یہ کہ وہ ساری خوشحالی خاک میں مل گئی۔ یہ مثال بیان کرنے کے بعد کہا۔

هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ؕ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ عُقْبًا ع (۱۸/۴۴)۔

"یہاں سے معلوم ہو گیا کہ فی الحقیقت، ساری سرپرستی اللہ ہی کے لئے ہے۔ وہی ہے جو بہتر حصّہ دینے والا ہے اور اسی کے ہاتھ بہتر انجام ہے"!

یہاں ولایت کے معنی سرپرستی اور کارسازی کے ہیں اور یہ مختص ہے ذاتِ باری تعالیٰ کے لئے جس کے قوانین کی اطاعت ضروری ہے۔ سورۂ انفال میں مومنین و مہاجرین کے تذکرہ کے ضمن میں کہا گیا ہے۔

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ (۸/۷۲)

"اور جو لوگ ایمان تو لائے لیکن انہوں نے ہجرت نہ کی تو تمہارے لئے ان کی رفاقت و اعانت میں سے کچھ نہیں۔"

یہاں ولایت کے معنی رفاقت اور دوستداری کے ہیں اور یہ وہ تعلّق ہے جو اخوتِ اسلامی اور مودّتِ ملّی کا خاصہ ہے۔

ولی صرف اللہ ہی ہے

ایک مومن جس کا محکم یقین ہو کہ مراحلِ زندگی میں حقیقی نصرت و حمایت صرف قوانینِ خداوندی کے اتباع سے مل سکتی ہے جو دل کی گہرائیوں سے اس حقیقتِ عظمیٰ پر ایمان رکھتا ہو کہ اعتماد اور بھروسہ صرف اسی کے قوانین پر کیا جا سکتا ہے، وہ یقیناً تمام "غیر اللہ" قوتوں سے منہ موڑ کر صرف اللہ کی حفاظت اور سرپرستی میں حقیقی امن و عافیت تلاش کریگا۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۚ لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۬ؕ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى

الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ؏ (۲/۲۵۷ - ۲۵۶)

"جو کوئی طاغوت سے انکار کرے (یعنی غیر اللہ سے مُنہ موڑ لے) اور اللہ پر ایمان لے آئے، تو یقیناً اس نے ایک ایسے آسرے کو پکڑ لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں اور یاد رکھو! اللہ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔ اللہ ان لوگوں کا رفیق اور سرپرست ہے جو ایمان کی راہ اختیار کرتے ہیں، وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے، مگر جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی تو ان کی رفیق اور سرپرست سرکش و مفسد قوتیں ہیں، وہ انہیں روشنی سے نکال کر تاریکی کی طرف لے جاتی ہیں۔ سو یہی لوگ ہیں جن کا گروہ جہنمی ہے، ہمیشہ عذاب میں رہنے والا"!

اللہ کی رفاقت اور سرپرستی کا آسرا ایسا مضبوط ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ اس کے سوا جتنے آسرے ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو کشمکشِ حیات میں انسان کی محافظت کر سکے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ؕ وَ اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۲۹/۴۱)۔

"جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر اوروں کو سرپرست و کارساز بنا لیتے ہیں، ان کی مثال مکڑی کی سی ہے کہ وہ اپنے لئے (بزعمِ خویش آفات و مصائب سے حفاظت کی غرض سے) گھر بناتی ہے۔ لیکن تمام گھروں میں سب سے زیادہ کمزور گھر (اسی) مکڑی کا ہوتا ہے۔ اے کاش (یہ) لوگ (اس حقیقت کو) سمجھ لیتے"۔

اس لئے کہ تمام قوتوں کا سرچشمہ اسی کی ذات ہے، موت و حیات کا مالک، ہر شے پر قادر۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۚ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَ هُوَ يُحْيِ الْمَوْتٰى ۫ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ؏ (۴۲/۹)۔

"کیا ان لوگوں نے اللہ کے سوا اوروں کو سرپرست بنا رکھا ہے؟ حالانکہ اللہ ہی ہے جو حقیقی سرپرست و کارساز ہے۔ وہ مُردوں (تک) کو زندگی عطا کر دیتا ہے وہ ہر شے پر قادر ہے"۔

ایسی قوتوں کی مالک ذات کے سوا اور کون اس قابل ہو سکتا ہے کہ اسے آقا اور مالک، سرپرست و کارساز بنایا جائے اور اس کے قوانین و احکام کی اطاعت کی جائے؟

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ هُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ؕ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ (۶/۱۴)۔

"(اے رسول ان لوگوں سے کہو کہ کیا (تم چاہتے ہو کہ) میں خدا کو چھوڑ کر اور کسی کو اپنا کارساز بنالوں۔ حالانکہ وہ زمین وآسمان کو پیدا کرنے والا ہے۔ وہ سب کو روزی دیتا ہے لیکن وہ کسی سے روزی کا محتاج نہیں۔ کہو کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں خدا کے آگے جھکنے والوں میں سب سے پہلا جھکنے والا ہوں اور مجھ سے کہا گیا کہ ایسا نہ کرو کہ اوروں کے قوانین کی اطاعت سے مشرکوں میں سے ہو جاؤ۔"

یہاں سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ خدا کو ولی بنانے سے مطلب یہ ہے کہ اطاعت صرف اسی کے قوانین کی کی جائے۔ یہی اسلام ہے۔ یہی ایک ولی اللہ کا شعار ہے۔

دوسری جگہ فرمایا۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا ؕ (۱۳/۱۶)

"(اے رسول۔ ان لوگوں سے) پوچھو کہ "آسمانوں اور زمین کا پروردگار کون ہے؟" تم کہو اللہ ہی ہے۔ پھر ان سے پوچھو کہ (جب پروردگار وہی ہے تو) پھر یہ کیا ہے کہ تم نے اس کے سوا دوسروں کو اپنا کارساز و سرپرست بنا رکھا ہے جو اپنے آپ کا نفع و نقصان بھی اپنے اختیار میں نہیں رکھتے۔"

جو اپنے نفع اور نقصان کا بھی اختیار نہ رکھتا ہو، اسے کارساز اور رفیق بنانے سے کیا حاصل؟ (واضح رہے کہ نفع اور نقصان ــــــ یعنی انسانی اعمال کا نتیجہ ــــــ صرف قوانینِ خداوندی کے مطابق برآمد ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا حقیقت کا اظہار ہے کہ کوئی شخص اپنے نفع اور نقصان کے لئے صاحبِ اختیار نہیں ہوتا) اس لئے کارسازی اور رفاقت صرف خدا کی ہو سکتی ہے جس کے قوانین کے مطابق تمام کارگہِ حیات سرگرمِ عمل ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ؕ وَمَا لَكُمْ

مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيۡرٍ ۝ (۹/۱۱۶ نیز ۲/۱۰۷ ؛ ۳۲/۴)

"بلاشبہ زمین و آسمان میں غلبہ و اقتدار اللہ ہی کے لئے ہے وہی جلاتا ہے، وہی مارتا ہے (سب کچھ اسی کے قبضہ میں ہے) تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی کارساز اور مددگار نہیں"

ایسا کارساز جسے کسی دوسرے کی کارسازی کی احتیاج نہیں، جو کسی کی مدد کا محتاج نہیں۔

وَقُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡ لَمۡ يَتَّخِذۡ وَلَدًا وَّلَمۡ يَكُنۡ لَّهٗ شَرِيۡكٌ فِى الۡمُلۡكِ وَلَمۡ يَكُنۡ لَّهٗ وَلِىٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرۡهُ تَكۡبِيۡرًا ۝ (۱۷/۱۱۱)

"اور (اے رسول) کہہ "تمام ستائش اللہ کے لئے ہے جو نہ تو اولاد رکھتا ہے نہ اس کی مملکت میں کوئی اس کا شریک ہے۔ نہ کوئی ایسا ہے کہ اس کی درماندگی کی وجہ سے اس کا مددگار ہو (وہ ان سب باتوں سے بے نیاز ہے") اس کی بڑائی کی پکار بلند کر جیسا کہ اس کا حق ہے"!

انسان کسی آسرے کی تلاش اور سرپرست کی جستجو اس وقت کرتا ہے جب اسے مایوسیوں اور ناامیدیوں کا طوفان چاروں طرف سے گھیر لے اور یہ ظاہر ہے کہ یاس و ناامیدی کی ظلمت ناک گھٹاؤں میں سچی امید کی کرن قوانین خداوندی ہی کے تجلی زار سے نمودار ہو سکتی ہے۔ وہی ہے جو خشک کھیتوں کو لہلہاتا ہے، جو افسردگی اور پژمردگی کے بعد شگفتگی و بشاشت کی تبسم ریز بہار پیدا کر دیتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِىۡ يُنَزِّلُ الۡغَيۡثَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا قَنَطُوۡا وَيَنۡشُرُ رَحۡمَتَهٗ ؕ وَهُوَ الۡوَلِىُّ الۡحَمِيۡدُ ۝ (۴۲/۲۸)۔

"(اللہ) وہ ہے جو لوگوں کے ناامید ہو جانے کے بعد ابر (گہربار) سے مینہہ برساتا ہے اور (یوں) اپنی رحمت (کی گھٹائیں) پھیلا دیتا ہے اور وہی (سب کا) کارساز اور صاحب حمد (و توصیف) ہے"۔

جو اللہ کو چھوڑ کر اوروں کو اپنا آقا اور کارساز بنائیں، یعنی انسانوں کے خود ساختہ قوانین کا اتباع کرنے لگ جائیں، انہیں تھوڑے ہی عرصہ کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ ان کے ان "موم کے خداؤں" کی حیثیت کیا تھی اور ان پر بھروسہ کرنا کس قدر پُرفریب تھا!

يَدۡعُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنۡفَعُهٗ ؕ ذٰلِكَ

هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ۚ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ؕ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَ لَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ۝ (۱۲ — ۲۲/۱۳)۔

" وہ اللہ کو چھوڑ کر ان کو (اپنی کارسازی کے لئے) پکارتے ہیں جو نہ تو انھیں نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔ یہی گمراہی ہے جسے سب سے بڑی گمراہی سمجھنا چاہیئے۔ وہ اللہ کو چھوڑ کر ایسی ہستی کو پکارتے ہیں جس کے نفع سے زیادہ اس کا نقصان قریب تر ہے۔ سو کیا ہی بُرا (ایسا) کارساز ہے اور کیا ہی بُرا ساتھی۔"

اس لئے کہ جو شخص اپنی حفاظت کے قلعے کی بنیاد ریت پر رکھے اس کا انجام ظاہر ہے۔ یہی وہ انجام و عواقب ہیں جن کی طرف تاریخی شواہد سے توجہ دلائی گئی ہے۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۫ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ۧ

(۱۰ — ۴۷/۱۱)

" کیا ان لوگوں نے زمین میں چل پھر کر دیکھا نہیں کہ ان سے پیشتر (انکار کرنے والوں کا) کیا انجام ہوا؟ اللہ (کا قانونِ مکافات) ان پر ہلاکت و بربادی (کے طوفان) لے آیا اور ایسا ہی انجام ہر زمانے کے منکرین کا ہوگا یہ اس لئے کہ اللہ ان لوگوں کا مولیٰ ہے جو ایمان لائے اور کفار کا کوئی (حقیقی مولیٰ ہوتا ہی نہیں۔"

کفار و ظالمین کا کوئی ولی نہیں

خدا سے مُنہ موڑنے والے، جن ہستیوں کو اپنا آقا اور نگران، سرپرست اور محافظ بناتے ہیں، وہ خود دوسروں کی نگرانی و اعانت کی محتاج ہوتی ہیں۔ اس لئے وقت آنے پر فریبِ نگاہ کے تمام پردے اُٹھ جاتے ہیں اور ان پر یہ حقیقت بے نقاب ہوجاتی ہے کہ

وَ الظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ۝ (۴۲/۸)

" ظالمین کا کوئی سرپرست اور کوئی مددگار نہیں ہوتا۔"

ایسے لوگوں کا انجام سوائے ہلاکت اور بربادی کے اور کیا ہو سکتا ہے؟

اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِیْنَ وَ اَعَدَّ لَهُمْ سَعِیْرًا ۙ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ۚ لَا یَجِدُوْنَ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیْرًا ۚ (۳۳/۶۴ نیز ۱۰/۲۵)۔

"یقیناً قوانینِ خداوندی سے انکار کرنے والے اس کی رحمتوں سے دُور رہتے ہیں اور ان کے لئے شعلہ فگن (جہنم) تیار کر رکھا ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ نہ ان کا کوئی ولی ہوگا نہ مددگار۔"

انجام کار یہی کھلی ہوئی ناکامی اور بربادی تھی جس کی طرف حق سے اعراض برتنے والوں کو توجہ دلائی گئی اور انہیں ان کی غلط روش کے عواقب سے آگاہ کیا گیا کہ یاد رکھو۔

وَ مَنْ یَّتَّخِذِ الشَّیْطٰنَ وَلِیًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِیْنًا ؕ یَعِدُهُمْ وَ یُمَنِّیْهِمْ ؕ وَ مَا یَعِدُهُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ (۴/۱۲۰ - ۱۱۹)

"اور جو کوئی اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا ولی (کارساز) بناتا ہے تو یقیناً وہ بڑی تباہی میں پڑ گیا، ایسی تباہی میں جو کھلی ہوئی تباہی ہے۔ شیطان ان سے وعدے کرتا ہے اور (باطل) آرزوؤں میں ڈالتا ہے اور شیطان ان سے جو کچھ وعدے کرتا ہے وہ فریب کے سوا کچھ نہیں!"

شیاطین کی ولایت

جیسا کہ (میری کتاب) "ابلیس و آدم" میں بصراحت بیان کیا جا چکا ہے، شیطان سے مُراد (۱) خود انسان کے ایسے جذبات ہیں جو اسے قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے سرکشی پر ابھارتے ہیں، نیز (۲) وہ سرکش قوتیں جو لوگوں سے قوانینِ خداوندی کی جگہ اپنی اطاعت کراتی ہیں۔ باطل کی ہر قوت کا شیوہ یہ ہے کہ وہ اپنے وابستگانِ دامن اور حلقہ بگوشوں کو کھلونوں سے بہلانے کی کوشش کرتی ہے اور غلط وعدوں سے ان کی اُمیدوں کے رشتہ کو استوار رکھتی ہے اس لئے ایسی قوتوں کا اتباع اور ان کی رفاقت پر بھروسہ، انجام کار ہلاکت و بربادی کے گڑھے میں جا گراتا ہے حضرت ابراہیمؑ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا جب اپنے باپ سے کہا کہ

یٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّیْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِیًّا ۝ یٰۤاَبَتِ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّیْطٰنِ وَلِیًّا ۝ (۱۹/۴۵ — ۴۴)۔

" اے میرے باپ! شیطان کی عبودیت اختیار نہ کرنا۔ شیطان تو خدائے رحمان سے سرکشی اختیار کر چکا۔
اے میرے باپ! میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ خدائے رحمان کی طرف سے کوئی عذاب تجھے آ لگے
اور تو شیطان کا ساتھی ہو جائے"!

خدا سے سرکشی اختیار کرنے والوں کی رفاقت و اطاعت، انسان کو انہی کے زمرہ میں لے جاتی ہے۔ اسی سے ذریتِ آدم کو متنبّہ کیا تھا لیکن باطل اور فریب میں کچھ ایسی مُلمّع کاری کی سی چمک اور کشش ہوتی ہے کہ حق سے ذرا نگاہ چُوکی اور انسان باطل کے دامِ تزویر میں پھنس گیا۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَ هُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝ (۱۸/۵۰)۔

" اور جب ایسا ہوا کہ ہم نے ملائکہ کو حکم دیا "آدم کے آگے جُھک جاؤ" اور سب جُھک گئے مگر ابلیس نہیں جُھکا، وہ جن میں سے تھا۔ پس وہ اپنے پروردگار کے حکم سے باہر ہو گیا۔ پھر اے ذریتِ آدم! کیا تم مجھے چھوڑ کر اُسے اور اُس کی ذریت کو کارساز بناتے ہو، حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں! (دیکھو) ظلم کرنے والوں کے لئے کیا ہی بُری تبدیلی ہوئی۔ (ان کے انجام پر نگاہ ڈالو۔ آغاز و انجام کی کیفیات کی تبدیلی واضح ہو جائے گی!)"۔

ابلیسانہ قوتیں، شیطان کے کارندے، ہمیشہ اسی کوشش میں رہتے ہیں کہ حق کی آواز دبی رہے۔ اس لئے وہ اپنے متبعین کو چپکے چپکے تلقین کرتے رہتے ہیں کہ جہاں حق و صداقت کی دعوت نظر آئے اس کی مخالفت شروع کر دو۔

وَ اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ (۶/۱۲۲)۔

" اور یقیناً شیاطین اپنے متبعین اور رفقاء کے دلوں میں وسوسے ڈالتے رہتے ہیں کہ وہ تم سے جدل (و فساد) کرتے رہیں"!

ان شیاطین کے دامِ فریب میں وہ پھنستے ہیں جو درحقیقت صحیح راستہ پر نہیں ہوتے لیکن بزعمِ خویش سمجھتے یہ ہیں کہ وہ ہدایت کی راہ پر ہیں۔

فَرِيقًا هَدٰى وَ فَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ۚ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ○ (۷/۳۰)۔

"(تمہارے دو گروہ ہو گئے) ایک گروہ کو (ان کے ایمان کی بدولت) سیدھی راہ دکھائی۔ دوسرے پر (ان کے انکار کی وجہ سے) گمراہی ثابت ہو گئی۔ ان لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا رفیق (یا مطاع) بنا لیا اور (بزعمِ خویش) یہ سمجھتے رہے کہ راہِ راست پر ہیں"!

یہ شیاطین ان لوگوں کی غلط رَوِشِ زندگی کو ان کی نگاہوں میں خوشنما بناتے رہتے ہیں تاکہ وہ صحیح راستہ کی طرف آ ہی نہ سکیں۔ ایسے لوگوں کا انجام ظاہر ہے۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ (۱۶/۶۳)۔

"(اے رسول!) اس بات کی سچائی پر ہم شاہد ہیں کہ ہم نے تجھ سے پہلے کتنی ہی اُمتوں کی طرف رسول بھیجے پھر ایسا ہوا کہ شیطان نے لوگوں کو ان کے اعمال (بد) مزیّن بنا کر دکھائے۔ سو وہی حال آج بھی ہو رہا ہے۔ وہی شیطان آج بھی ان کا ولی (رفیق اور مطاع) ہے اور (بالآخر) ان کے لئے عذابِ دردناک ہے"۔

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی آرزوؤں اور نظر فریب تمناؤں کو حقائق سمجھتے ہیں اور حقائق کو کھلونے سمجھ کر ان پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کرتے اور اپنی خواہشات کی طوفان انگیزیوں کو خدائی احکام کے ساحلوں میں مقید کر کے جوئبارِ زندگی کو صحیح راستے پر نہیں لے جاتے۔ انہی کے متعلق فرمایا۔

وَ ذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّ لَهْوًا وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ ذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّ لَا شَفِيْعٌ ۚ (۶/۷۰)۔

"(اے رسول) جن لوگوں نے اپنے دین (کے حقائق) کو کھیل اور تماشہ سمجھ رکھا ہے اور دنیا کی زندگی نے ان کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے، ایسے لوگوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دو اور قرآن کے ذریعے انہیں (ان کی روش کے انجام سے) آگاہ کرتے رہو۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ کوئی انسان اپنی بدعملی

کی وجہ سے ہلاکت میں چھوڑ دیا جائے. کیونکہ (ایسے میں) اللہ کے سوا کوئی نہیں جو اسکا محافظ ہوگا یا اس کی شفاعت کرے گا۔"

جس نے اپنے آپ کو خدا کی محافظت سے نکال دیا اسے ہلاکت سے کون بچا سکتا ہے؟

ولایت اور اطاعت

جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے، اللہ کی ولایت پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ اس کے قوانین کے سوا کسی اور کی اطاعت نہ کی جائے. کسی اور کو مطاع قرار نہ دیا جائے. جھکا جائے تو اسی کے احکام کے آگے، عبودیت اختیار کی جائے تو اسی معبودِ حقیقی کی. خدا کی ولایت پر ایمان کے عملی مظہر کا یہ نمایاں پہلو ہے. سورۂ کہف میں ارشاد ہے.

لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ اَبْصِرْ بِهٖ وَ اَسْمِعْ ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ز وَّ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا (۱۸/۲۶)۔

"وہ زمین و آسمان کی غیب کی باتیں جاننے والا ہے. بڑا ہی دیکھنے والا، بڑا ہی سننے والا. اس کے سوا لوگوں کا کوئی ولی نہیں اور وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔"

اس کی ولایت ایسی ہے جس میں کسی دوسرے کا حکم نہیں چل سکتا. اس کی بادشاہت میں کسی اور کا سکہ رواں نہیں ہو سکتا. اطاعت خالص اسی کے لئے ہے.

اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ وَ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ؕ۬ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ۝ (۳۹/۳)۔

"یاد رکھو! اطاعت خالص اللہ کے لئے ہے جو لوگ اس کے سوا اوروں کو اولیاء (مطاع) بنا لیتے ہیں (وہ کہتے ہیں کہ) ہم تو ان کی عبودیت صرف اس لئے اختیار کئے ہیں کہ یہ ہمیں خدا کا مقرب بنا دیں. یقیناً اللہ ان امور میں فیصلہ کر دیگا جن میں یہ اختلاف کرتے ہیں. اللہ کسی جھوٹے ناسپاس گزار کو کبھی ہدایت کی راہ نہیں دکھاتا۔"

اتباع صرف قوانینِ الٰہیہ کی ہو سکتی ہے. ان کے سوا کسی اور کی اتباع جائز نہیں. اسی کا نام ہدایتِ خداوندی

ہے جس کے علاوہ اور کوئی ہدایت، ہدایت کہلانے کی مستحق نہیں، خواہ وہ کسی شکل میں متشکل، کسی لباس میں ملبوس، کسی پیکر میں مستور اور کسی نام سے موسوم ہو۔ حضورؐ سے ارشاد ہوا۔

وَ لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ ۝ (۲/۱۲۰)۔

"(اور اے رسول) یہود و نصاریٰ تم سے کبھی خوش نہ ہوں گے جب تک تم ان کی (خود ساختہ) ملتوں کی پیروی نہ کرو۔ ان سے کہہ دو کہ حقیقت یہ ہے کہ صرف خدا کی (طرف سے نازل شدہ) ہدایت ہی ایسی ہے جو (سچے معنوں میں) ہدایت (کہلانے کی مستحق) ہے اور (اے رسول) یاد رکھو! اگر تم نے ان کی خواہشوں کا اتباع کر لیا، باوجودیکہ تمہارے پاس علم و یقین کی روشنی آچکی ہے (تو یہ ہدایتِ الٰہی سے انحراف ہوگا اور پھر) اللہ کی ولایت اور نصرت سے تم محروم ہو جاؤ گے"!

یہ ہدایتِ الٰہی قرآن کے اندر ہے اور اسی کا اتباع خدا کا اتباع ہے اور اسی سے خدا کی ولایت حاصل ہو سکتی ہے۔

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِیًّا ؕ وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا وَاقٍ ۠ (۱۳/۳۷)۔

"اور اس طرح ہم نے (قرآن) کو ایک واضح ضابطہ قانون بنا کر نازل کیا اور (اے رسول) اگر تم نے اس (سر تاپا) علم آچکنے کے بعد ان لوگوں کے خیالات کی پیروی کی، تو تم خدا کی ولایت و نصرت سے محروم ہو جاؤ گے"!

معاملاتِ زندگی میں یہی ضابطۂ قوانین سچی راہِ ہدایت ہے۔ اسی کا نام شریعتِ خداوندی ہے اسی کے اتباع سے خدا انسانوں کا ولی بنتا ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِیْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّهُمْ لَنْ یُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا ؕ

وَ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَ اللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ○ هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ○ (۱۸-۲۰/۴۵)

"پھر (اے رسول) ہم نے تمہیں معاملات (امر) میں ایک خاص مسلک (شریعت) پر لگا دیا۔ پس اسی مسلک کا اتباع کئے جاؤ اور ان کے لوگوں کے خیالات کی پیروی نہ کرو جنہیں (اس حقیقت کا) علم نہیں (اگر تم ان کی پیروی کرو گے تو) یہ لوگ اللہ کے مقابلہ میں تمہارے کسی کام نہ آسکیں گے۔ یقیناً ظالمین ایک دوسرے کے اولیاء ہیں اور اللہ متقیوں کا ولی ہے۔ یہ (قرآن) نوعِ انسانی کے لئے بصیرتوں (کا سرچشمہ) اور (ایمان و) یقین رکھنے والوں کے لئے ہدایت و رحمت ہے"!

قرآنِ کریم کو خداوندی ضابطۂ حیات ماننے والوں سے فرمایا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ○ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ○ (۱۴۸-۳/۱۴۹ نیز ۱۱/۱۱۳)۔

"اے ایمان والو! اگر تم نے ان لوگوں کی اطاعت کی جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے، تو (یاد رکھو) وہ تمہیں راہِ حق سے اُلٹے پاؤں پھرا دیں گے اور (نتیجہ یہ نکلے گا) کہ تم (سیدھی راہ چل کر) پھر تباہی و نامرادی میں جا گرو گے۔ یہ لوگ تمہارے کارساز نہیں ہو سکتے، نہ مطاع۔ تمہارا کارساز اور آقا تو اللہ ہے جو بہترین مدد کرنے والا ہے"!

اتباع صرف قرآنِ کریم کا جائز ہے اس کے سوا اور کسی کا اتباع ہدایت نہیں کہلا سکتی۔

اِتَّبِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ۗ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ○ (۷/۳)۔

"جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے اس کا اِتباع کرو۔ اس کے علاوہ اور اولیاء (اپنے ٹھہرائے ہوئے مطاعوں) کا اِتباع مت کرو (لیکن) بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تم (اس اصول کو) یاد رکھو"۔

جو قرآنِ کریم کو چھوڑ کر دوسرے نظریاتِ زندگی کا اِتباع شروع کر دے اس کا اللہ کی ولایت اور ہدایت میں کوئی حصہ نہیں ہو سکتا۔

...... مَنۡ یَّہۡدِ اللّٰہُ فَہُوَ الۡمُہۡتَدِ ۚ وَ مَنۡ یُّضۡلِلۡ فَلَنۡ تَجِدَ لَہٗ وَلِیًّا مُّرۡشِدًا ﴿۱۸/۱۷ نیز ۱۷/۹۷ نیز ۴۲/۴۴﴾۔

"جسے اللہ (اپنے قانون کے مطابق) سیدھی راہ دکھا دے، وہی ہدایت پہ ہے اور جس پر وہ (اپنے قانون کے مطابق) راہ گم کر دے تو تم کسی کو اس کا ولی اور مرشد (راہ دکھلانے والا) نہیں پاؤ گے۔"

اولیاء اللہ خالص اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبودیت، یعنی قرآنِ کریم کا اتباع اور اس کے سوا کسی اور کو اطاعت اور اتباع کے قابل نہ سمجھنا، یہ ہیں اولیاء اللہ (خدا کے فرمانبردار بندوں) کی خصوصیات۔ اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہو سکتا۔ اَلَاۤ اِنَّ اَوۡلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۱۰/۶۲﴾۔ "یاد رکھو اولیاء اللہ (اللہ کے مطیع و فرمانبردار بندوں) کے لئے کسی قسم کا خوف اور غمگینی نہیں ہے" اس لئے کہ یہ "وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور انہوں نے متقیوں کی زندگی بسر کی۔ ان کے لئے دنیا کی زندگی میں (کامیابیوں اور سرفرازیوں کی) بشارت ہے اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ یہ اللہ کے قوانین اٹل ہیں، کبھی بدلنے والے نہیں اور یہ سب سے بڑی فیروزمندی ہے" (۱۰/۶۳)۔ قلبِ انسانی کا نشیمن امن و سکون بن جانا بہت بڑی نعمت ہے۔ لیکن وہ سراب آسا امن و سکون نہیں جو ترکِ آرزو اور قطعِ علائق کی رہبانیت سے حاصل ہوتا ہے، بلکہ وہ امن و سکون جو دنیا کی کامرانیوں اور آخرت کی سرفرازیوں کا فطری نتیجہ ہے اور یہ حاصل ہوتا ہے صحیح ایمان و اعمال سے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَ لَا تَحۡزَنُوۡا وَ اَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ ﴿۳۰﴾ نَحۡنُ اَوۡلِیٰٓؤُکُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ ۚ وَ لَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَشۡتَہِیۡۤ اَنۡفُسُکُمۡ وَ لَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَدَّعُوۡنَ ﴿۴۱/۳۰-۳۱﴾

"یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کہہ دیا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے اور پھر اس ایمان پر جم کر کھڑے ہو گئے، ان پر (سکون و طمانیت کے حامل) ملائکہ نازل ہوتے ہیں (جو کہتے ہیں) مت خوف کھاؤ اور غمگین نہ ہو اور اس جنت کی بشارت سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ہم تمہارے اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اولیاء (رفیق) ہیں اور تمہارے لئے اس (جنت) میں وہ سب کچھ

ہوگا جس کی تمہیں آرزو ہوگی اور جو کچھ تم مانگو گے۔"

ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کو سامنے لے آئیے کہ اولیاء اللہ (خدا کے مطیع بندوں) کی یہ کیفیت کہ انہیں کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوتا، قوانینِ خداوندی کے اتباع کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس لئے جو شخص قوانینِ خداوندی کا متبع ہوگا، اولیاء اللہ کے زمرہ میں شامل ہو جائے گا۔ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ کا کوئی الگ گروہ نہیں، کوئی جداگانہ جماعت نہیں۔ ان کے پہچاننے کی کوئی خاص علامات نہیں۔ تمام مسلمان اولیاء اللہ ہیں بشرطیکہ وہ اتباعِ قرآنی میں اپنی زندگی بسر کریں اور اس اتباع کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہے۔ لہٰذا، اولیاء اللہ ملّتِ اسلامیہ ہی کا دوسرا نام ہے جو دنیا میں احکامِ خداوندی کی نشر و ترویج اور قوانینِ الٰہیہ کی تنفیذ کی ذمہ دار ہے۔ ان کے ہاں کوئی چیز رازکی نہیں، کوئی علم باطنی نہیں، کوئی مسلک مخفی نہیں۔ قرآنِ کریم کی کھلی کھلی تعلیم، اس تعلیم کے نکھرے ہوئے نتائج، واضح نصب العین اور اس نصب العین کے حصول کے بیّن طریقے، یہ ہے قرآنِ کریم کی صراطِ مستقیم۔ اولیاء اللہ کی نمایاں خصوصیت یہی بیان ہوئی ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ (انہیں کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا)۔ ہبوطِ آدم" کے وقت نوعِ انسانی کو مخاطب کر کے کہا گیا کہ تم ایسی دنیا میں زندگی بسر کرو گے جہاں قدم قدم پر سرکشی و عُدوان کی طاغوتی قوتیں اپنا جال بچھائے ہوں گی۔ اس کش مکش اور تصادم سے وہی محفوظ رہے گا جو ہدایتِ خداوندی کا اتباع کرتا رہے گا۔

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ (۲/۳۸)

"جب کبھی تمہارے پاس ہماری طرف سے ہدایت آئے گی تو جو کوئی ہدایت کی پیروی کریگا اس کے لئے کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا۔"

یہاں واضح طور پر بتا دیا کہ خوف و حزن سے محفوظ رہنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہدایتِ خداوندی کا اتباع کیا جائے۔ اور چونکہ اولیاء اللہ کے متعلق فرمایا کہ انہیں کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا، تو اس سے بدیہی طور پر معلوم ہو گیا کہ اولیاء اللہ ان کا نام ہے جو ہدایتِ خداوندی کا اتباع کرتے ہیں، یعنی تمام مومنین اولیاء اللہ ہیں۔ ہمارے ہاں جو یہ عقیدہ یا تصور رائج ہے کہ "اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ" کا ایک خاص گروہ ہے جو "روحانیت" کے مالک ہیں، تو یہ تصور قرآنی نہیں۔ قرآن کی رُو سے جب ملّتِ اسلامیہ قوانینِ خداوندی کے مطابق اپنا نظام قائم کرے تو

یہی ملّت، اولیاء اللہ کہلائے گی، یعنی وہ قوم جو قوانینِ الٰہیہ کے اتباع سے، خدا کے تخلیقی پروگرام اور اس کے نظامِ ربوبیت کے عالمگیر بننے میں اُس کی رفیق ہو گی۔

اولیاءُ الرّحمٰن اور اولیاءُ الشّیاطین

قرآنی تقسیم کے اعتبار سے دو متمیّز گروہ ہمارے سامنے آ گئے۔ ایک وہ جو اللہ تعالیٰ کے قوانین کا اتباع کرتے ہیں اور اس کے علاوہ کسی اور کے سامنے نہیں جھکتے۔ یہ گروہ اولیاء اللہ کا ہے۔ اُسے حزبُ المؤمنین یا ملّتِ اسلامیہ کہا جائے گا۔ اس کے خلاف، دوسرا گروہ وہ ہے جو وحی اور ہدایتِ خداوندی کے اتباع کے بجائے انسانوں کی وضع کردہ روشِ زندگی کو منہاج و مسلک قرار دے لیتا ہے۔ یہ گروہ اولیاء الشّیطان ہے، منکرین کی جماعت ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ان دونوں گروہوں میں کسی قسم کا قلبی رشتہ،

غیروں سے دوستداری کے تعلقات

کوئی وجہِ جامعیت، کوئی یگانگت، کوئی ہم آہنگی، کوئی توافق، کوئی تطابق نہیں ہو سکے گا۔ دونوں کے نظریاتِ زندگی جُدا، دونوں کے کعبۂ مقصود الگ، ان سے قلبی تعلق کیسا؟ اسی لئے اول الذّکر (جماعتِ مؤمنین، ملّتِ اسلامیہ) کو واضح اور بیّن الفاظ میں بتا دیا کہ ؏

تمہیں بھلا اُن سے واسطہ کیا جو ہم سے ناآشنا رہے ہیں!

یعنی

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ؕ وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ (۳/۲۷)۔

"جو لوگ ایمان والے ہیں ان کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ جماعتِ مؤمنین کو چھوڑ کر کفار کو اپنا دوست بنائیں۔ جس کسی نے ایسا کیا تو وہ یاد رکھے کہ اس کا اللہ کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں رہا۔ (دوستی تو کُجا) تمہیں تو بلکہ یہ چاہیئے کہ ان سے اپنی حفاظت کا پورا پورا سامان کرو (ان سے مرعوب ہو کر دوستی کے تعلقات پیدا کرنے کی کیا ضرورت جبکہ) اللہ تمہیں (صرف) اپنے آپ سے ڈراتا ہے (یعنی اس کے قوانین کی خلاف ورزی کے نتائج سے ڈرنا) اور آخر الامر پناہ اسی سے مل سکتی ہے۔

سورۂ نساء میں ہے :۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝ (۴/۱۴۴)۔

"اے ایمان والو! ایسا نہ کرو کہ مسلمانوں کو چھوڑ کر کفار کو اپنا دوست بنالو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ خدا کا صریح الزام اپنے سر دھر لو (جو تمہیں صاف طور پر اس سے روک رہا ہے)!"

اس لئے کہ، جیسا کہ اُوپر لکھا جا چکا ہے، مومنین ایک دوسرے کے رفیق و مددگار ہیں اور کفار ایک دوسرے کے دوست۔ کفر و اسلام میں شرکت کی گنجائش کہاں؟

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ ...... وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ (۸/۷۲ – ۸/۷۳)

"جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مال و جان سے جہاد کیا اور جن لوگوں نے (ایسے مہاجرین کو) پناہ دی اور ان کی مدد کی، تو یہی لوگ ہیں کہ ان میں سے ایک دوسرے کا کارساز و رفیق ...... اور کفار (اسی طرح) ایک دوسرے کے باہمی دوست ہیں۔"

سورۂ توبہ میں ہے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (۹/۷۱)۔

"اور مومن مرد اور مومن عورتیں سب ایک دوسرے کے دوست (اور رفیق) ہیں۔ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔ نظامِ صلوٰۃ قائم کرتے ہیں۔ زکوٰۃ کا انتظام کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ سو یہی لوگ ہیں جن پر بہت جلد اللہ اپنی رحمت فرمائے گا۔ یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکمت والا ہے!"

یہود و نصاریٰ کے متعلق فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ ۘ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ○ (۵/۵۱)

"مسلمانو! یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست (اور رفیق) مت بناؤ۔ وہ تو (تمہاری دشمنی میں) ایک دوسرے کے دوست ہیں اور (دیکھو) تم میں سے جو کوئی ان کو دوست بنائے گا تو وہ بھی انہی میں سے ہو جائے گا۔ اللہ ظلم کرنے والوں پر ہدایت کی راہ نہیں کھولتا!"

غور فرمایئے! یہ حقیقت کیسے واضح الفاظ میں بے نقاب کردی کہ جو کسی گروہ سے دوستی رکھے گا وہ انہی میں سے سمجھا جائے گا۔ اس لئے کہ دوستی قلبی تعلقات کا نام ہے۔ جدھر کسی کا دل ہوگا اُدھر ہی اس کا شمار ہوگا۔ بالخصوص وہ لوگ جو تمہارے دین سے تمسخر کریں، ان حقائقِ ابدی کو بنظرِ تحقیر دیکھیں، ان کی تذلیل و تنقیص کریں، ان کی طرف تو دل کا ذرا سا جھکاؤ بھی جہنم کے گڑھے کی طرف لیجانے کے لئے کافی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُزُوًا وَلَعِبًا مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ أَوْلِيَاءَ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ○ (۵/۵۷)

"مسلمانو! یہود و نصاریٰ اور کفار میں سے جن لوگوں نے تمہارے دین کو ہنسی کھیل بنا رکھا ہے، تم انہیں اپنا دوست (بالکل) نہ بناؤ اور تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو، اگر فی الحقیقت تم ایمان والے ہو تو؟"

اس لئے کہ

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ ○ (۵/۵۵)

"تمہارا رفیق و مددگار تو بس اللہ ہے اور اس کا رسول اور جماعتِ مومنین جو نظامِ صلوٰۃ قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ کا انتظام کرتے ہیں اور (قوانینِ الٰہیہ کے آگے) جھکے ہوئے ہیں!"

منافقین سے دوستداری

سطورِ بالا میں ان لوگوں سے عدم دوستی کا ذکر آیا ہے جو ایمان سے کھلا کھلا انکار کرتے ہیں، جو جماعتِ مومنین سے واضح طور پر الگ ہیں جو جُداگانہ مسلک رکھتے ہیں. لیکن ایک گروہ ایسا بھی ہوتا ہے جو دعویٰ ایمان کے باوجود ایمان والوں کے گروہ میں سے نہیں ہوتا. ان کا ایمان حلق سے نیچے نہیں اُترتا. وہ اپنے مصالح و مقاصد کی خاطر ملّتِ اسلامیہ سے اپنا تعلق ظاہر کرتے ہیں. لیکن فی الحقیقت ان کا تعلق صرف اپنے منافع و مقاصد سے ہوتا ہے. منافقین کی اس نقاب پوش خنجر در آستین جماعت کے متعلق فرمایا.

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَ لَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ۙ (۴/۸۹)۔

"ان منافقین کی دلی تمنا یہ ہے کہ جس طرح انہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے، تم بھی کرلو اور تم سب ایک ہی طرح کے ہو جاؤ. پس (دیکھو) جب تک یہ لوگ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں (اور دشمنوں کا ساتھ چھوڑ کر تمہارے ساتھ نہ آملیں) تمہیں چاہیئے کہ ان میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ."

منافقین کی تفصیل تو اپنے مقام پر آئے گی، یہاں اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ کفار کی طرح منافقین کا کوئی الگ گروہ نہیں. یہ اسلام کا دعویٰ کرنے والوں ہی کی ایک جماعت کا نام ہے. ان کا اسلام صرف زبانی اقرار تک محدود ہوتا ہے، عمل سے اس کی شہادت نہیں ملتی. یہ لوگ بظاہر اپنوں کے ساتھ لیکن دل سے دوسروں کے ساتھ ہوتے ہیں. ملّت کے منافع میں برابر کے حصہ دار لیکن اس کی مشکلات میں کبھی ساتھ نہ دینے والے. جھوٹی عزت کی تلاش ان کا مسلک اور غلط وجاہت کی جستجو ان کا نصب العین. عزت کہیں ملے کسی طریق سے ملے یہ بلا تامل لے لیں گے. انہی کے متعلق فرمایا.

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ۙ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۭ (۴/۱۳۸)۔

"(اے رسول) منافقین سے کہہ دو کہ ان کے لئے دردناک عذاب ہے یعنی ان لوگوں کو جو مسلمانوں کو چھوڑ کر کفار کو اپنا دوست بناتے ہیں. کیا یہ لوگ اُن (دشمنانِ حق) کے ہاں عزت ڈھونڈنے جاتے ہیں؟ (اگر ان کا یہی خیال ہے) تو (یاد رکھیں) عزت جتنی بھی ہے، سب کی سب اللہ ہی کے لئے ہے (جو اس کے قوانین کی اطاعت سے حاصل ہوتی ہے)۔"

"اپنے" کون ہیں

اور آگے بڑھئے اور دیکھئے کہ قرآن کریم کفر اور ایمان میں کس قدر واضح تمیز اور کھلا کھلا فرق رکھنا چاہتا ہے. سورۃ توبہ میں ہے.

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآئَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ ---- وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (۹/۲۴-۲۵)۔

"مسلمانو! اگر تمہارے باپ اور تمہارے بھائی ایمان کے مقابلہ میں کفر کو عزیز رکھیں تو انہیں اپنا رفیق و ساز گار نہ بناؤ اور جو کوئی انہیں اپنا دوست بنائے گا تو ایسے ہی لوگ ہیں جو اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں (اے پیغمبر! مسلمانوں سے کہہ دو "اگر ایسا ہے کہ تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہاری برادری، تمہارا مال جو تم نے کمایا ہے، تمہاری تجارت جس کے خسارے سے تم ڈرتے ہو، تمہارے رہنے کے مکانات جو تمہیں اس قدر پسند ہیں، اگر ان میں سے کوئی چیز تمہیں اللہ اور اس کے رسول سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہے (تو خدا کا قانون تمہارا محتاج نہیں) انتظار کرو. یہاں تک کہ جو کچھ خدا کرتا ہے وہ (تمہارے) سامنے لے آئے اور اللہ (کا مقررہ قانون ہے کہ وہ) فاسقوں کی جماعت پر ہدایت کی راہ نہیں کھولتا!"

جو خدا کے نظام کا دشمن ہو، اُس جماعت کا بدخواہ ہو جو اس نظام کی تشکیل کے لئے اُٹھے، اس کے ساتھ اُن کا کیا علاقہ جو اس مقصدِ عظمیٰ کے لئے جئیں اور اسی کی خاطر مریں. ان دونوں میں دوستداری کے تعلقات کبھی نہیں پیدا ہو سکتے.

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّىْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ ---- وَ مَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝ (۶۰/۱)

"اے ایمان والو! میرے (نظام کے) دشمن اور اپنے دشمن کو اپنا دوست نہ بناؤ. کیا تم ان لوگوں سے

دوستی کے تعلقات قائم کرو گے جو اس (پیغامِ خداوندی) سے انکار کرتے ہیں جو حق کے ساتھ تمہارے پاس آیا ہے. جنہوں نے تمہیں اور رسول کو (گھروں سے) نکال دیا (اس جرم کی بناء پر کہ) تم اپنے پروردگار اللہ پر ایمان رکھتے تھے، اگر تم (ایک طرف) میری راہ میں جہاد اور میری رضا جوئی کی تلاش میں نکلو (تو کیا ساتھ ہی یہ بھی ہو سکے گا کہ (دوسری طرف) ان (دشمنوں) کے ساتھ مودّت کے تعلقات استوار کرو؟ اور جو کچھ تم چھپاؤ اور جو کچھ تم ظاہر کرو، میں سب (کچھ) جانتا ہوں اور تم میں سے جو کوئی ایسا کرے گا تو (وہ سمجھ لے کہ) وہ سیدھے راستے سے بالکل بھٹک گیا۔"

اس سے دو ہی آیات آگے چل کر فرمایا کہ اس باب میں تمہارے لئے تمہاری ملت کے مؤسّسِ اول حضرت ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کا طرزِ عمل ایک بہترین نمونہ ہے "جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور اللہ کو چھوڑ کر جن کی تم عبودیت اختیار کئے ہو، ان سب سے بیزار ہیں. ہم (تمہارے ساتھ ہر قسم کے قلبی تعلقات سے) انکار کرتے ہیں. تمہارے اور ہمارے درمیان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھلی کھلی عداوت اور بغض ظاہر ہے تا آنکہ تم ایک اللہ پر ایمان نہ لے آؤ" (۶۰/۴). حقیقت یہ ہے کہ اسلام، تعلقات، یگانگت، اخوت، مودّت کا معیار ساری دنیا سے الگ قائم کرتا ہے. جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لا کر اس کے ضابطۂ قوانین کے ماتحت زندگی بسر کریں، وہ سب ایک برادری کے فرد اور ایک ملت کے رکن اور جو اس نظام سے باہر ہوں وہ ایک دوسری جماعت کے فرد، خواہ ان میں قریب سے قریب تر رشتہ دار اور عزیز سے عزیز دوست بھی موجود کیوں نہ ہوں. باپ اور بیٹے کا رشتہ (حضرت نوحؑ اور ان کا بیٹا) بیٹے اور باپ کا رشتہ (حضرت ابراہیمؑ اور ان کے باپ) میاں اور بیوی کا رشتہ (حضرت لوطؑ اور ان کی بیوی) قرابت اور عزیزداری کے تمام رشتے (نبی اکرمؐ اور قریش و بنی ہاشم) سب ٹوٹ جاتے ہیں اگر ان میں اسلام کا رشتہ مشترک نہ ہو اور جو اس رشتہ میں منسلک ہو جائیں وہ ایک برادری کے فرد بن جاتے ہیں خواہ اس سے پیشتر ان میں دنیاوی معیار کے مطابق نسلی، لسانی، قومی، وطنی، قرابت داری، غرضیکہ کسی قسم کی کوئی وجہ اشتراک موجود نہ ہو. اس لئے کہ ان کی باہمی ولایت و رفاقت کی بنیاد اس حقیقتِ کبریٰ پر ہے کہ ان سب کا ولی اور مولیٰ ایک ہے. یہود کے متعلق فرمایا۔

وَ لَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ النَّبِيِّ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ

مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ○ (۵/۸۱)۔

"اگر یہ لوگ اللہ پر، اس کے نبی پر اور جو کتاب اس پر نازل ہوئی ہے اس پر ایمان لے آتے، تو پھر ان کفار سے کبھی دوستی کے تعلقات قائم نہ رکھتے۔ لیکن ان میں زیادہ تر ایسے ہی ہیں جو فاسق ہیں۔"

اس لئے کہ ایمان لانے کے بعد یہ لوگ اس نئی برادری کے فرد ہو جاتے۔ یہ اللہ کو اپنا ولیؔ اور مولیٰؔ تسلیم کر لیتے اور پھر کفار سے ان کا کوئی تعلق نہ رہتا۔ کیونکہ کفار کے مولیٰ اور ولی تو شیاطین ہوتے ہیں۔

اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ (۷/۲۷)

"اور ہم نے یہ بات ٹھہرا دی ہے کہ جو لوگ ایمان نہیں رکھتے ان کے رفیق و مددگار شیاطین ہوتے ہیں۔"

مومن اور کافر میں فرق ہی یہ ہے کہ مومن اللہ ہی کی محکومیت تسلیم کرتا ہے، اسی کی اطاعت و عبودیت اختیار کرتا ہے، لیکن کافر، انسانوں کے وضع کردہ نظام کے ماتحت زندگی بسر کرتا ہے۔ اللہ کو چھوڑ کر بندوں کی اطاعت کرتا ہے اور یوں انہیں آقا تسلیم کر کے ان کی سرپرستی و رفاقت پر بھروسہ رکھتا ہے۔ اس کا انجام جہنم کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ○ (۱۸/۱۰۲)۔

"جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہے، کیا انہوں نے یہ خیال کیا ہے کہ ہمیں چھوڑ کر ہمارے بندوں کو اپنا اولیاء بنا لیں گے۔ (انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ) ہم نے کافروں کی مہمانی کے لئے دوزخ تیار کر رکھی ہے۔"

انہی کو ظالمین بھی کہا گیا ہے کیونکہ یہ لوگ ولایت و معبودیت کو اس کے اصلی مقام پر نہیں رکھتے۔ یہ تمام ایک برادری کے فرد ہو جاتے ہیں، خواہ کسی نام سے موسوم ہوں اور حق کے مقابلہ میں ایک دوسرے کے رفیق و مددگار، خواہ ان میں ذاتی اختلافات کتنے ہی کیوں نہ ہوں۔

اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ○ (۴۵/۱۹)

"یقیناً ظالمین ایک دوسرے کے دوست ہیں اور اللہ ان کا ولی ہے جو اس کے قوانین کی

نگہداشت کرتے ہیں"۔

ولایتِ خداوندی کے مواقع جب یہ دو گروہ ایسے ٹھہرے جن کے مقاصدِ حیات باہمد گر متضاد اور مسالکِ زندگی متخالف ہیں تو ظاہر ہے کہ ان میں کش مکش و تصادم ناگزیر ہے۔ باطل کی قوتیں ہمیشہ اس فکر میں رہیں گی کہ حق کی آواز بلند نہ ہونے پائے اور اس کے لئے وہ اپنا ہر استبدادی حربہ استعمال کریں گی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اللہ کی ولایت حفاظتِ حق کی حمایت کرنے والی جماعت کے لئے سپر بن جاتی ہے۔ مسلمانوں کی ابتدائی زندگی میں جہاں انہیں جنگ کی اجازت دی گئی تھی، فرمایا۔

وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ...... نَصِيْرًا ۝ (۴/۷۵)۔

"اور (مسلمانوں) تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ نہیں کرتے۔ حالانکہ کتنے ہی بے بس مرد اور عورتیں اور بچے ہیں جو (ظالموں کے ظلم سے تنگ آکر) فریاد کرتے ہیں "خدایا ہمیں اس بستی سے جہاں کے باشندوں نے ظلم پر کمر باندھ رکھی ہے نجات دلا اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا کارساز (و محافظ) بنا اور اپنی طرف سے کسی کو ہماری مددگاری کے لئے کھڑا کر دے"۔

چنانچہ ادھر یہ دعائیں مظلوموں اور بے کسوں کے سینے سے سراپا نیاز بن کر نکلیں اور ادھر سے ولایتِ خداوندی اولیاء اللہ کے جیوش و عساکر کی شکل میں ابھر کر باہر آگئی۔ حکم ہوا

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۝ (۴/۷۶)

"جو لوگ ایمان رکھتے ہیں، اُن کا لڑنا اللہ کی راہ میں ہوتا ہے اور جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے، وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں۔ سو اگر تم ایمان رکھتے ہو تو چاہیئے کہ اولیاء الشیطن سے لڑو اور ان کی قوت سے مت ڈرو کہ) شیطان کا مکر (و فریب) بڑا کمزور ہوتا ہے!"

یعنی سرکش قوتیں بظاہر بہت خوفناک اور لرزہ انگیز دکھائی دیں گی لیکن حقیقت میں بڑی کمزور اور ناپائیدار ہوں گی۔ اس لئے کہ ان کا بھروسہ سرتاپا باطل اور فریب کی ولایت (رفاقت، حمایت، حفاظت، دوستی، سرپرستی، اطاعت) پر ہوگا اور جماعتِ مومنین کا بھروسہ اللہ کی ولایت پر۔ سو جس کا ولی (سازگار و سرپرست، محافظ و نگہبان) قوی ہوگا وہی جماعت انجامِ کار کامیاب و کامران ہوگی۔ فرمایا۔

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ اغْلُظْ عَلَیْهِمْ...یُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِیْمًا فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ مَا لَهُمْ فِی الْاَرْضِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ ○ (۹/۷۳-۷۴)۔

"اے رسول! کافروں اور منافقوں، دونوں سے جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ۔۔۔۔

۔۔۔۔ اللہ انہیں (ان کے اعمال کی بنا پر) دنیا اور آخرت میں عذابِ دردناک دیگا اور تم دیکھو گے کہ روئے زمین پر ان کا کوئی کارساز اور حمایتی نہ ہوگا۔"

ان کفار و منافقین یعنی حق سے سرکشی و اعراض برتنے والوں سے کہا کہ تم کس زعمِ باطل پر اترا رہے ہو؟ تم مکافاتِ عمل کی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔ کوئی مددگار اور محافظ تمہیں اس کے شکنجہ سے نجات نہیں دلا سکتا۔

وَ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ٘ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ ○ (۲۹/۲۲ نیز ۲/۱۰۷؛ ۱۱/۲۰؛ ۴۲/۳۱)۔

"تم آسمان و زمین میں کہیں بھی بچ نہیں سکتے اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی محافظ و (سرپرست) اور رفیق (و مددگار) نہیں ہو سکتا۔"

قانونِ خداوندی کی گرفت ایسی نہیں کہ تم اسے کہیں بھی عاجز کر سکو یا اس کے مقابلہ میں کوئی ایسا محافظ و سرپرست تلاش کر لو جو تمہیں پاداشِ عمل سے بچا سکے۔ اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ تم اس کی دعوت پر لبیک کہہ کر اس کے قوانین کی اطاعت کرو اور اس طرح اس کی حفاظت کے سایہ میں آ جاؤ پھر تمہیں کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا۔ اگر اس کی دعوت کو قبول نہ کرو گے تو پھر تمہارا کوئی مددگار نہیں ہو سکتا۔

وَ مَنْ لَّا یُجِبْ دَاعِیَ اللّٰهِ فَلَیْسَ بِمُعْجِزٍ فِی الْاَرْضِ وَ لَیْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءُ ؕ اُولٰٓىِٕكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ○ (۴۶/۳۲)

"اور جو شخص اللہ کی طرف بلانے والے کی آواز پر لبیک نہیں کہتا تو وہ روئے زمین پر کہیں بھاگ کر

نہیں جاسکتا اور اللہ کے سوا اس کا کوئی مددگار (اور سرپرست) نہیں ہوسکتا۔ یہ لوگ ایک کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں"!

فطرت کا اٹل قانون اور یہ کوئی نئی چیز یا اتفاقی امر نہیں کہ کفار کے مقابلہ میں حق پرستوں کو فتح و کامرانی حاصل ہوگی۔ بلکہ یہ تو فطرت کے اٹل قوانین میں سے ایک قانون اور اس کے ناقابلِ تغیر و تبدل قواعد میں سے ایک قاعدہ ہے۔ جس طرح فطرت کا یہ اٹل قانون ہے کہ روشنی آجانے پر اندھیرا باقی نہیں رہ سکتا اسی طرح یہ بھی ناقابلِ تغیر قانون ہے کہ حق کے مقابلہ میں باطل، مومنین کے مقابلہ میں کفار کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔

وَلَوْ قَاتَلَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوَلَّوُا الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُونَ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ۝ سُنَّةَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۖ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۝ (۴۸/۲۳-۲۲)

"اگر کفار تمہارے ساتھ نبرد آزمائی کریں گے، تو یقیناً وہ پیٹھ دکھا کر بھاگ جائیں گے اور انہیں کوئی محافظ اور مددگار نہ مل سکے گا۔ یہ اللہ کا وہ اٹل قانون ہے جو شروع سے چلا آرہا ہے اور تم اللہ کے قوانین میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے"۔

اس لئے ان لوگوں سے ڈرنے اور خوف کھانے کی کوئی وجہ نہیں۔

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ ۚ ...... وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ ۖ فَنِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ ۝ (۲۲/۷۸)۔

"اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے...... اور اللہ کا سہارا مضبوطی سے پکڑلو۔ وہی تمہارا آقا ہے اور جس کا آقا اللہ ہو تو کیا ہی اچھا ایسا آقا ہے اور کیا ہی اچھا ایسا مددگار!"

سورۂ انفال میں ارشاد ہے۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ ۚ فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَوْلَاكُمْ ۚ نِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ ۝ (۸/۴۰-۳۹)

اور (ان حق کے منکرین) سے لڑتے رہو۔ یہاں تک کہ ظلم و فساد (غیر اللہ کا نظام) باقی نہ رہے اور

اطاعت تمام کی تمام خالص اللہ کے لیئے ہو جائے۔ پھر اگر ایسا ہو کہ یہ لوگ (اس مخالفت سے)
باز آجائیں تو جو کچھ وہ کرتے ہیں، اللہ اس سے واقف ہے۔ اور اگر یہ روگردانی کریں، تو (ان سے
مت ڈرو) اللہ تمہارا مولی ہے اور جس کا مولی اللہ ہو تو وہ کیا ہی اچھا آقا اور کیا ہی اچھا مددگار ہے!

جب حقیقت یہ ہو تو حق و باطل کی کش مکش میں حق پرستوں کا ہمت ہار جانا اس امر کی دلیل ہوگا کہ (ہنگامی اور وقتی طور پر ہی سہی) انہوں نے خدا کے اس اٹل قانون کو نظر انداز کر دیا ہے۔ چنانچہ جنگِ اُحد میں جب دو قبائل کی طرف سے تھوڑی سی کمزوری کی علامت دکھائی دی تو اس سلسلہ میں فرمایا۔

اِذْ ھَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَ اللّٰهُ وَلِیُّهُمَا ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ (۳/۱۲۱)

"جب ایسا ہوا تھا کہ تم میں سے دو جماعتوں نے ارادہ کیا تھا کہ ہمت ہار دیں (تو انھیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا کیونکہ ان کا تو ولی اللہ تھا اور ایمان رکھنے والوں کا یہ شیوہ ہونا چاہیئے کہ وہ اللہ پر (کامل) بھروسہ رکھیں۔

باطل کی طاغوتی قوتیں اس قسم کے وساوس پیدا کرتی ہیں کہ حق پرستوں کے دل میں ان کی طاقت کا رعب بیٹھ جائے لیکن اللہ کی ولایت پر کامل بھروسہ رکھنے والوں کے لیئے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّیْطٰنُ یُخَوِّفُ اَوْلِیَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَ خَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ (۳/۱۷۴)۔

"یہ تو صرف ایسا ہوتا ہے کہ شیطان تمہیں اپنے ساتھیوں سے ڈراتا ہے۔ اگر تم ایمان والے ہو تو شیطان کے ساتھیوں سے کیوں ڈرو۔ تمہیں تو فقط ہم سے ڈرنا چاہیئے (اور بس!)"

ولی اللہ کی پہچان

مومن کی تو شان یہ ہے کہ وہ غیر اللہ کی کسی قوت سے نہ ڈرے اور سر بکف باطل کے مقابلہ کے لیئے میدان میں آجائے۔ موت اس کے نزدیک کھیل ہے۔ موت سے تو وہ ڈرتا ہے جو اسی دنیا کی زندگی کو زندگی سمجھتا ہے جس کے نزدیک، زندگی کا سلسلہ موت کے بعد بھی بدستور رہتا ہے، بلکہ اُس دور میں زندگی اپنے مزید ارتقائی منازل طے کرتی ہے، تو اس کے لیئے موت سے ڈرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ اس کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

چو مرگ آید تبسّم بر لبِ اُوست

اس لئے فرمایا،

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ○ (۶۲/۶-۷)

"(ان) یہودیوں سے کہو کہ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ اولیاء اللہ تمہیں ہو، دوسرے لوگ نہیں ہیں، تو (اس کی پہچان ابھی ہوئی ہو جاتی ہے) تم موت کی تمنا کرو، اگر تم (اپنے دعویٰ میں) سچے ہو تو یہ لوگ اعمال کے پیشِ نظر کبھی موت کی تمنا نہ کریں گے اور اللہ ظالمین سے بخوبی واقف ہے۔"

اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اس وقت زبان سے کتنے ہی دعوے کیوں نہ کر لئے جائیں ظہورِ نتائج کے وقت اللہ کے سوا کوئی محافظ و مددگار نہ ہوگا (۶/۵۱ ؛ ۴۲/۴۶)۔ اُس وقت کفار کا مولیٰ جہنم ہوگا (۵۷/۱۵) اور کوئی دوست (مولیٰ) کسی دوسرے دوست (مولیٰ) کے کام نہ آسکے گا (۴۴/۴۱)۔ جو لوگ اللہ کے سوا اوروں کو اپنا مولیٰ اور کارساز بنا لیتے ہیں، اللہ ان کے اعمال پر محافظ ہے (۴۲/۶)۔ وہاں خیر اور شر کا ایک ایک ذرہ سامنے آجائیگا۔

مولیٰ

ایک عبدِ مومن کا یہ ایمان ہے کہ اس کا ولی (سرپرست و کارساز) اللہ ہے۔ خدا اور انسان کا یہی صحیح تعلق ہے۔

چنانچہ حضورؐ سے فرمایا کہ وَ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ (۶۶/۲) "تمہارا آقا صرف اللہ ہے" اور مومنین کو یہ دعائیں سکھائیں کہ

اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ○ (۲/۲۸۶)

"تو ہی ہمارا آقا ہے۔ سو ہمیں کفار کی قوم پر غلبہ عطا فرما۔"

خدا کس کا ولی بنتا ہے

لیکن سوال یہ ہے کہ اللہ کی یہ ولایت کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟ اللہ کس کا ولی بنتا ہے اور کس طرح بنتا ہے؟ اس کے متعلق قرآنِ کریم نے بالکل واضح الفاظ میں فرما دیا کہ یاد رکھو! جو لوگ فائز المرام ہوتے ہیں۔

هُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (۶/۱۲۸)

"اللہ، بوجہ ان کے اعمال کے، ان کا ولی ہوتا ہے۔"

اللہ اعمال کے نتیجہ میں ولی بنتا ہے۔ اس کی ولایت صالحین کے لئے ہوتی ہے۔

اِنَّ وَلِیِّۦَ اللّٰهُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ یَتَوَلَّى الصّٰلِحِیْنَ ○ (۷/۱۹۶)

"(کہو کہ) میرا ولی تو اللہ ہے جس نے یہ کتاب نازل فرمائی ہے اور وہ صالحین کا ولی ہے"!

اللہ کو اپنا ولی بنانے اور اس کا ولی بننے کا ایک اور صرف ایک ذریعہ ہے۔ یعنی اس کی نازل فرمودہ کتاب کے مطابق اعمالِ صالحہ ہوں۔ اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ سود مند نہیں۔ کسی کی آرزو اور تمنا نتیجہ خیز نہیں۔ خدا کا واضح فیصلہ ہے کہ

لَیْسَ بِاَمَانِیِّكُمْ وَ لَاۤ اَمَانِیِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ ۙ وَ لَا یَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیْرًا ○ (۴/۱۲۳ نیز ۴/۱۲۴)

"(مسلمانو! یہ چیز) نہ تو تمہاری آرزوؤں پر موقوف ہے اور نہ اہلِ کتاب کی آرزوؤں پر جو کوئی برا کام کرے گا ضروری ہے کہ اس کا بدلہ پائے اور (اس صورت میں) اللہ کے سوا اس کا کوئی ولی (اور کوئی مددگار نہ ہوگا"۔

قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے (جو قرآن کے اندر محفوظ ہیں) انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان (بہ حدِ بشریت) صفاتِ خداوندی کا مظہر بنتا جاتا ہے۔ اس طرح خدا، بندے کا ولی اور بندہ خدا کا ولی بن جاتا ہے اور یہی خدا اور بندے کا صحیح تعلق ہے۔

اس قسم کے افراد کے مجموعہ سے جو امت متشکل ہوتی ہے، وہ اولیاء اللہ کی جماعت کہلاتی ہے۔ وہ دنیا میں جس کی سرپرست و محافظ بن جاتی ہے، وہ ہر قسم کے خطرات سے محفوظ و مصئون ہو جاتا ہے۔ یہ حفاظت و صیانت اس نظامِ خداوندی کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے جو اس جماعتِ مومنین کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے۔

متفرق صفاتِ خداوندی

گذشتہ اوراق میں اللہ تعالےٰ کی جن صفات کا ذکر سامنے آیا ہے، قرآن میں ان کے علاوہ اور بھی متعدد صفات کا ذکر ہے۔ اگر ان تمام صفات کا تفصیلی تذکرہ کیا جائے تو اس کے لئے کئی مجلدات کی ضرورت ہوگی۔ اس لئے ہم باقی صفات کے صرف اجمالی تعارف پر اکتفا کرتے ہیں۔ اگر آپ ان اجمالی اشارات کی روشنی میں قرآنِ کریم کا مطالعہ کریں گے تو تفاصیل خود آپ کے سامنے آجائیں گی۔ اگر آپ ان کا وسیع تر مفہوم سمجھنا چاہیں تو اس کے لئے میری تصنیف (لغات القرآن) دیکھئے۔

اَلْحَکِیْمُ

اَلْحَکَمَۃُ۔ گھوڑے کی لگام کو کہتے ہیں۔ لگام کا کام یہ ہے کہ وہ جانور کو منہ زور اور سرکش نہ ہونے دے بلکہ ٹھیک رفتار سے صحیح راستے پر چلائے جائے۔ لہٰذا اَلْحِکْمَۃُ کے معنی ہیں معاملات کو صحیح حدود میں محدود رکھنا اور کسی کو اُن سے اِدھر اُدھر نہ ہونے دینا۔ حَکِیْمٌ اس شخص کو کہتے ہیں جو ہر چیز کو صحیح تناسب و توازن کے ساتھ اس کے ہر تقاضے کو ملحوظ رکھتے ہوئے، نہایت حُسن و خوبی کے ساتھ بنائے نیز تمام معاملات کو اسی طرح سرانجام دے۔

ان معانی کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ جب خدا کو اَلْحَکِیْمُ کہا جائے گا تو اس سے کیا مفہوم ہوگا۔ چونکہ یہ صفتِ خداوندی بڑی بنیادی اور اہم ہے اس لیے قرآنِ کریم میں اس کا ذکر بیشمار مقامات میں آیا ہے، حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ (۱۱/۱)، حَکِیْمٌ عَلِیْمٌ (۶/۱۴۰) وغیرہ۔

اس سے ظاہر ہے کہ جو معاشرہ ان افراد پر مشتمل ہوگا جن کی ذات صفاتِ خداوندی کا مظہر ہوگی، اس میں کس طرح ہر معاملہ مبنی بر حکمت ہوگا۔

اَلْحَلِیْمُ

جس شخص کے اعصاب کمزور ہوں، وہ ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہو جاتا ہے۔ اس کے جذبات چھوٹی چھوٹی تنقیدوں سے بھڑک اٹھتے ہیں۔ اس کے برعکس، جس شخص کی توانائی قائم ہو، مزاج میں اعتدال ہو، اعصاب اور قویٰ مضبوط ہوں، تربیت صحیح ہو، وہ ثقہ، بھاری بھرکم، متین اور سنجیدہ ہوتا ہے۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر بھڑک نہیں اٹھتا۔ معاملات پر سنجیدگی سے غور کرتا، حُسنِ تدبّر اور احتیاط سے فیصلہ تک پہنچتا اور پھر اس فیصلہ پر عزمِ راسخ سے جم کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص کو حَلِیْمٌ کہتے ہیں۔ خدا کے حَلِیْمٌ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کا قانونِ مکافات یونہی نعل بر آتش نہیں ہو جاتا بلکہ اصول اور آئین کے مطابق اعمال کو ان کے نتائج تک پہنچاتا ہے اور اگر اس دوران میں ان اعمال میں اصلاح کر لی جائے، تو وہ ان کے مضر اثرات سے سامانِ حفاظت بہم پہنچا دیتا ہے۔ دیکھئے اس حقیقت کو قرآن نے کس انداز میں بیان کیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔

لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ بِاللَّغْوِ فِیْٓ اَیْمَانِکُمْ وَ لٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ بِمَا کَسَبَتْ قُلُوْبُکُمْ ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ○ (۲/۲۲۵)۔

"تمہاری قسموں میں جو لغو اور بے معنی قسمیں ہوں، اُن پر اللہ مواخذہ نہیں کرے گا۔ تم پر جو کچھ مواخذہ ہوگا، وہ تو اسی بات پر ہوگا (جو سچ مچ کو تم نے سمجھ بوجھ کر کی ہے اور اس لئے) تمہارے دلوں نے (اپنے عمل سے) کمائی ہے (یعنی بالارادہ ایسا کیا ہے) اور اللہ غفور اور حلیم ہے"۔ (نیز دیکھئے ۲/۲۳۵)۔

جنگِ اُحد میں بعض مجاہدین سے تھوڑی سی چوک ہو گئی تھی جس کی وجہ سے فتح عارضی شکست میں بدل گئی۔ اس واقعہ کے ضمن میں فرمایا:

اِنَّ الَّذِیۡنَ تَوَلَّوۡا مِنۡکُمۡ یَوۡمَ الۡتَقَی الۡجَمۡعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسۡتَزَلَّہُمُ الشَّیۡطٰنُ بِبَعۡضِ مَا کَسَبُوۡا ۚ وَ لَقَدۡ عَفَا اللّٰہُ عَنۡہُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ حَلِیۡمٌ ﴿۳/۱۵۴﴾

"تم میں سے جن لوگوں نے اس دن لڑائی سے منہ موڑ لیا تھا جس دن دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے تو ان کی لغزش کا باعث صرف یہ تھا کہ بعض کمزوریوں کی وجہ سے جو اُن میں پیدا ہو گئی تھیں، شیطان نے ان کے قدم ڈگمگا دیئے (یہ بات نہ تھی کہ ان کے ایمان میں فتور آ گیا ہو) بہرحال یہ واقعہ ہے کہ خدا نے ان کی لغزش کو معاف کر دیا۔ یقیناً وہ غفور اور حلیم ہے۔"

حَلِیۡم کا قرآنی مفہوم سمجھنے کے لئے یہی دو مقامات کافی ہیں۔ ان کے علاوہ سات آٹھ دیگر مقامات پر بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ غَفُوۡرٌ حَلِیۡمٌ ﴿۵/۱۰۱﴾ غَنِیٌّ حَلِیۡمٌ ﴿۲/۲۶۳﴾ عَلِیۡمٌ حَلِیۡمٌ (۲۲/۵۹) (۴/۱۲) شَکُوۡرٌ حَلِیۡمٌ ﴿۶۴/۱۷﴾ حَلِیۡمًا غَفُوۡرًا (۱۷/۴۴؛ ۳۵/۴۱) عَلِیۡمًا حَلِیۡمًا ﴿۳۳/۵۱﴾۔

۳۔ اَلۡغَفُوۡرُ

۴۔ اَلۡغَفَّارُ

۵۔ اَلۡعَفُوُّ

جب کسی شہر میں وبائی مرض کا حملہ ہو تو اکثر و بیشتر آبادی اس کا شکار ہو جاتی ہے لیکن اس کے باوجود بعض لوگ اس کے حملہ سے محفوظ رہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن میں قوّتِ مدافعت زیادہ ہوتی ہے۔ ان کی یہ قوّت، مرض کے مضر اثرات کا مقابلہ کر کے، انسان کو اُن سے محفوظ رکھتی ہے۔ اسے مغفرت کہتے ہیں خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے ہر عمل اپنا نتیجہ مرتّب کرتا ہے۔ اگر کسی فرد یا قوم کے تعمیری نتائج پیدا کرنے والے

اعمال کا وزن زیادہ ہو تو وہ ان اعمال کے تخریبی نتائج (مضر اثرات) سے محفوظ رہتی ہے جو اس سے سہو و خطا کے طور پر سرزد ہو جائیں، اسے صفتِ غفّاری اور غفوری کہتے ہیں۔ وَ اللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۲/۲۸۱)۔ اس صفت کا ذکر بھی بے شمار مقامات پر آیا ہے۔ چند ایک مقامات پر عَفُوٌّ غَفُوْرٌ (۲۲/۶۰) بھی آیا ہے، یعنی مؤاخذہ کرنے کے بجائے آگے بڑھ جانے (درگذر کرنے) والا۔ مطلب اس سے بھی وہی ہے جو مغفرت کا ہے۔ مغفرت کے معنی یوں ہی "بخشش" دینے کے نہیں۔

اَلتَّوَّابُ

آپ کسی جگہ جا رہے ہیں۔ راستے میں ایک دوراہے سے آپ غلط سمت کی طرف مڑ جاتے ہیں۔ کچھ دُور جا کر آپ کو اس کا احساس ہوتا ہے (یا کوئی اور آپ کو بتاتا ہے) کہ آپ غلط راستے پر پڑ گئے۔ یہاں سے صحیح راستے پر جانے کے لئے ضروری ہے کہ آپ پھر اُس مقام پر واپس آ جائیں جہاں سے آپ کا قدم غلط سمت کی طرف اُٹھا تھا۔ اس طرح "واپسی" کو توبہ کہتے ہیں۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے، عمل اور اس کے نتیجہ میں نمودار ہونے میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ اگر اس دوران میں انسان اس غلط رَوش سے باز آ کر صحیح روش اختیار کر لے اور پھر ایسے تعمیری کام کرے جن سے سابقہ تخریب کے مُضر اثرات سے حفاظت مل جائے، تو وہ شخص تباہی اور بربادی سے بچ جاتا ہے۔ اس صفتِ خداوندی کا نام تَوَّابِیَّتْ ہے۔ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا (۱۱۰/۳)۔ انسان اَلتَّائِبُ (لوٹنے والا) خدا اَلتَّوَّابُ (اور تیزی سے اس بندے کی طرف لوٹنے والا)۔

رَءُوْفٌ

رحمت اور رافت قریب قریب مرادف الفاظ ہیں اس فرق کے ساتھ کہ رحمت کے معنی ہیں سامانِ نشوونما کا عطا کرنا اور رافت کے معنی ہیں اُن موانع کو دور کرنا جو کسی کی نشوونما کے راستے میں حائل ہوں۔ اس لئے قرآن میں رَءُوْفٌ اور رَحِیْمٌ کی صفات بالعموم یکجا آتی ہے۔

وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ وَ رَحْمَتُہٗ وَ اَنَّ اللّٰہَ رَءُوْفٌ الرَّحِیْمٌ ۠ (۲۴/۲۰)۔

"اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور رحمت نہ ہوتی (تو تم ان مُفسدہ پردازوں کے شر سے محفوظ نہ رہتے) اور یاد رکھو کہ اللہ رؤف و رحیم ہے"!

سورۂ توبہ میں ہے۔

ثُمَّ تَابَ عَلَیْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۙ (۹/۱۱۷)

"پھر اللہ ان کی طرف لوٹ آیا۔ یقیناً وہ ان کے لئے رؤف و رحیم تھا"۔

دیگر مقامات کے لئے دیکھئے ۲/۱۴۳ ؛ ۷ - ۱۶/۴۷ ؛ ۲۲/۶۵ ؛ ۵۷/۹ ؛ ۵۹/۱۰)

سورۂ توبہ میں ایک جگہ نبیؐ اکرم (صلعم) کی صفت بھی رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ آئی ہے (۹/۱۸۷)۔ یہی صورت حضورؐ کے ان متبعین کی ہو گی جن کی ذات میں صفاتِ خداوندی منعکس ہوں گی۔

۸- اَلوَدُوْدُ

مودّت اور رحمت بھی ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں۔ سورۂ روم میں ہے۔

وَ مِنْ اٰیٰتِہٖۤ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْۤا اِلَیْهَا وَ جَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ۝ (۳۰/۲۱)۔

"اور اس کی آیات میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہم جنس بیویاں بنائیں تاکہ ان سے تمہیں تسکین حاصل ہو اور تمہارے درمیان اس نے مودّت (محبت) اور رحمت (کے جذبات) پیدا کر دیئے۔ یقیناً غور و فکر کرنے والوں کے لئے اس میں نشانیاں ہیں"!

اسی لئے قرآنِ کریم میں ایک مقام پر وَدُوْدٌ، رَحِیْمٌ کے ساتھ آیا ہے اور دوسری جگہ غفور کے ساتھ۔ حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم سے فرمایا۔

وَ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ۝ (۱۱/۹۰)

"(اے قوم!) اپنے رب سے مغفرت مانگو اور اس کی طرف لوٹو یقیناً میرا رب رحیم (رحمت والا) اور ودود (محبت کرنے والا) ہے۔"

سورۂ بروج میں جزا و سزا کے تذکرہ کے بعد فرمایا۔ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ۝ (۸۵/۱۴) "اور وہ (اللہ) بخشنے والا، محبت کرنے والا ہے۔"

واضح رہے کہ خدا کی رحمت، مغفرت، محبت وغیرہ کا ابرِ نیساں اس کے خاص قوانین کے ماتحت گہربار ہوتا ہے اور اس گہرباری سے بہرہ اندوز ہونے کے لئے اپنے آپ کو اہل بھی بنانا پڑتا ہے۔ زمینِ شور اس سے کیا متمتع ہوگی؟ خدا کی محبت کے متعلق فرمایا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ؗ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ (۵/۵۴)۔

"مسلمانو! جو تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو (وہ یہ نہ سمجھے کہ اس کے پھر جانے سے دینِ حق کو کوئی نقصان پہنچے گا) قریب ہے کہ اللہ ایک ایسا گروہ (سچے مومنین کا) پیدا کر دے جنہیں خدا دوست رکھتا ہوگا اور وہ خدا کو دوست رکھنے والے ہوں گے۔ مومنوں کے مقابلہ میں نہایت نرم اور جھکے ہوئے لیکن کفار کے مقابلہ میں نہایت سخت۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اور کسی ملامت گر کی ملامت سے نہ ڈرنے والے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے وہ اپنی مشیت کے مطابق اسے عطا کرتا ہے جو اسے لینا چاہے۔ وہ (اپنے فضل میں) بڑی ہی وسعت رکھنے والا اور (سب کچھ) جاننے والا ہے۔"

یہ ہیں خدا کی محبت و مودّت کی شرائط جن کے پورا کرنے سے اپنے آپ کو اس کا اہل بنایا جا سکتا ہے!

۹- اَلْکَرِیْمُ

عربوں کے ہاں کَرِیْم کا لفظ بڑا وسیع المعنی تھا۔ یوں سمجھئے کہ جس کے متعلق وہ یہ کہنا چاہتے کہ اس میں انسانیت کی تمام بلند خصلتیں اور عمدہ صفتیں موجود ہیں؛ اسے وہ اَلْکَرِیْمُ کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے۔ ہر قسم کے شرف و مجد کا مالک، ہر نوع کی عزت و تکریم کا مستحق، بے بہا جود و سخا، بخشش و عنایات بذل و کرم کا حامل، ایک نشوونما یافتہ ذات، ان تمام صفاتِ حسنیٰ کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب خدا کے متعلق یہ لفظ بولا جائے گا تو اس سے کیا مقصود و مفہوم ہوگا۔ سورۃ النمل میں ہے۔

وَ مَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا یَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّیْ غَنِیٌّ كَرِیْمٌ ۝ (۲۷/۴۰)

"جو سپاس گذار ہوگا اس کے شکر کا فائدہ اس کی ذات کو پہنچے گا اور جو ناسپاس ہوگا تو (اس کا نقصان بھی اسی کو ہوگا) میرا رب (انسانوں کے شکر و کفر سے) بے نیاز اور کریم ہے۔"

یعنی اسے کسی کے شکر کی احتیاج نہیں نہ کسی کا کفر اس کا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔ البتہ جو شکر گذار ہوگا اس پر اس کے فضل و کرم کی بارشیں ہوں گی۔ سورۃ انفطار میں ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ ۝ الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝ (۸۲/۶-۷)

"اے انسان! وہ کون سی چیز ہے جس نے تجھے تیرے رب کریم کی طرف سے فریب دے دیا۔ وہ رب جس نے تجھے پیدا کیا، پھر (مختلف مدارج طے کرانے کے بعد) تجھے سنوارا اور (تیرے اعضاء و جوارح میں) تناسب پیدا کر دیا۔"

یعنی انسان کی تخلیق اور پھر تقویم احسن سب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کو کریم کہا گیا ہے لیکن دوسرے مقام پر اسے اکرم کہا ہے۔

اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝ (۹۶/۳-۵)۔

"پڑھو اور تمہارا رب اکرم (بہت بڑا کریم) ہے۔ وہ جس نے تمہیں قلم (سے لکھنے) کا علم

سکھایا، جس نے انسان کو وہ کچھ سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا!"

تخلیق و تسویۂ انسانی کے وقت ربِ کریم اور تعلیمِ انسانی کے وقت ربِ اکرم۔ کریم اور اکرم میں وہی فرق ہے جو تخلیق و تعلیم میں ہے۔ تخلیق و تسویہ بھی اسی کے کرم سے ہے اور تعلیم بھی اس کے کرم سے۔ لیکن تخلیق کی نسبت تعلیم بہت بڑا کرم ہے، اس لئے اس کے لئے اکرم (بہت زیادہ کرم کرنے والا) کا لفظ آیا ہے۔

اَلْبَرُّ

اَلْبَرُّ کے معنی ہیں حدود فراموش وسعتوں کا مالک، زندگی کی راہ میں کشادہ راہیں پیدا کرنے والا۔ یہ صفت بھی رحیم کے ساتھ آئی ہے۔ اہلِ جنت کے متعلق فرمایا کہ وہ کہیں گے۔

فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ وَقٰنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ۝ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ۝ (۲۷ — ۵۲/۲۸)

"سو اللہ نے ہم پر احسان فرمایا اور ہمیں عذابِ سموم سے بچایا۔ ہم یقیناً اس سے پیشتر بھی اللہ کو پکارتے تھے یقیناً وہ بہت بڑی وسعتوں کا مالک اور رحمت والا ہے"!

۱۱- اَلْحَفِیظُ

(حفاظت کرنے والا)

اَلرَّقِیبُ

(نگران)

اَلْمُهَيْمِنُ

(محافظ)

اَلْحَيُّ

(زندہ اور زندگی بخش)

اَلْقَيُّوْمُ

(قائم)

اَلْمُقِيْتُ

(محافظ۔ نگران)

اللہ تعالیٰ جب تمام کائنات کا خالق، رازق، پروردگار ہے، وہ ہر شے کا علم رکھتا ہے، خبیر و علیم ہے، تو ظاہر ہے کہ ہر شے کا نگران بھی وہی ہے۔ وَ رَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ؀ (۳۴/۲۱؛ ۱۱/۵۷) اور تیرا رب ہر شے کا نگران ہے۔ دوسری جگہ ہے کہ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا ؀ (۳۳/۵۲؛ ۴/۱) اور اللہ ہر شے پر نگاہ رکھتا ہے۔ جب حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں نے آپ سے کہا کہ حضرت یوسفؑ کا چھوٹا بھائی ان کے ساتھ کر دیا جائے اور وعدہ کیا کہ وہ اس کی حفاظت کریں تو آپ نے فرمایا کہ تم کیا حفاظت کرو گے۔ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا۔ ص (۱۲/۶۴)۔ (اللہ بہترین حفاظت کرنیوالا

ہے)۔ حضرت سلیمانؑ کے عہدِ حکومت میں جو "جنات[1]" کام پر لگے رہتے تھے ان کے متعلق فرمایا کُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ۝ (۲۱/۸۲) ہم ان پر محافظ تھے)۔ سورۂ حشر میں اَلْمُهَيْمِنُ (۵۹/۲۳) بھی انہی معنوں میں آیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے کہ کائنات کی نگرانی و حفاظت خدا کو تھکا نہیں دیتی۔ لَا يَئُودُهٗ حِفْظُهُمَا (۲/۲۵۵) اس لئے کہ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ (۲/۲۵۵) نہ اس کی آنکھوں کے لئے نیند ہے نہ دماغ کے لئے اونگھ) وہ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝ ہے (۲/۲۵۵؛ ۳/۱؛ ۲۰/۱۱۱؛ ۴۰/۶۵) ایسا زندہ جس کی زندگی کے لئے فنا و زوال نہیں۔ ہر شے اس کے حکم سے قائم ہے اور وہ اپنے قیام کے لئے کسی کا محتاج نہیں۔ وہ ہر شے پر محافظ ہے۔ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ۝ (۴/۸۵)۔

اَلْحَيُّ خدا کی عظیم صفت ہے۔ کائنات میں سب سے اہم شے زندگی ہے، اہم کے علاوہ محیر العقول بھی۔ اس لئے کہ (جیسا کہ "حیات و ممات" سے متعلق عنوان میں بتایا جا چکا ہے) انسانی تحقیقات ابھی تک اس راز کو پا نہیں سکیں کہ زندگی کا سرچشمہ کیا ہے۔ قرآن نے بتایا کہ خدا کی ذات اَلْحَيُّ ہے، یعنی وہ از خود زندہ ہے اور دوسروں کو زندگی عطا کرنے والا۔ ظاہر ہے کہ جب یہی صفت انسانی ذات میں منعکس ہو جائے تو خود اس کی اپنی کیفیت کیا ہو جائے گی اور اس کے نتائج کس قدر نفع بخش ہوں گے۔ اس کی اپنی کیفیت تو یہ ہوگی کہ وہ موت سے بھی مر نہیں سکے گی، وہ حیاتِ جاوید کی حامل ہو جائے گی اور اس کے فیوض کا یہ عالم کہ وہ دوسروں کو سامانِ حیات عطا کرے گی۔ جو معاشرہ ایسے افراد پر مشتمل ہوگا اور جو نظام اُن کے ہاتھوں سے متشکل، اس میں تمام افرادِ انسانیہ کے لئے زندگی کا سامان فراوانی سے موجود ہوگا۔ نہ صرف طبعی زندگی کا، بلکہ انسانی زندگی کا بھی، یعنی اس میں تمام افراد کی ذات کی نشو و نما کا بھی سامان موجود ہوگا۔

۱۲۔ اَوّلُ و آخِرُ

اللہ تعالیٰ جہتِ زمان و مکان سے بلند و بالا ہے۔ جب کچھ نہ تھا تو وہ موجود تھا۔ جب کچھ نہ ہوگا تو وہ موجود رہے گا۔ هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ (۵۷/۳)۔ (وہ ازلی اور ابدی ہے، ظاہر و باطن ہر جگہ موجود ہے۔ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ (۵۷/۳) ہر مقام پر حاضر و ناظر ہے۔

---

[1] وحشی قبائل کے افراد۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ۔ (۲۲/۱۷)

(اللہ حاضر و ناظر ہے) اس سے کوئی شے پوشیدہ نہیں۔

یہ وہ صفات ہیں جو ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ مختص ہیں۔ ان میں کوئی اور شریک نہیں ہو سکتا۔

۱۳۔ قَرِيْبٌ

جب وہ ہر مقام پر موجود ہے تو یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ وہ کسی خاص مقام پر مقیم ہے۔ فرمایا۔

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ (۲/۱۸۶)

"اور (اے رسول) جب میرا کوئی بندہ میری نسبت تم سے دریافت کرے (تو تم اسے بتلادو کہ) میں اس کے قریب ہوں۔ وہ جب پکارتا ہے تو اس کی پکار سنتا اور قبول کرتا ہوں۔"

سورۂ ہود میں ہے کہ

اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ۝ (۱۱/۶۱)۔

"یقیناً میرا رب قریب ہے اور پکار کا جواب دیتا ہے۔"

سورۂ سبا میں ہے

اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ (۳۴/۵۰)

"وہ سب کچھ سننے والا قریب ہے۔"

رگِ جاں سے بھی قریب

وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝ (۵۰/۱۶؛ ۵۶/۸۶)

"ہم انسان کی رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہیں۔"

اللہ تعالیٰ کی ذات کس طرح ہر جگہ موجود ہے اور ہماری رگِ جاں سے بھی قریب ہے، اس کے متعلق ہم کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ہمارا اور خدا کا تعلق اس کے قوانین کی رُو سے وابستہ ہے۔ اس

لئے ہمیں یہ سمجھنا چاہیئے کہ اس کا قانونِ مکافات اس طرح محیط ہے کہ ہم کہیں بھی ہوں اور کسی حالت میں بھی ہوں، ہم اس کے (قانون) کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو سکتے۔ حتّٰی کہ ہمارے دل میں گذرنے والے خیالات اور نگاہوں کی خیانت بھی اس کے حیطہ سے باہر نہیں رہ سکتی۔ بالفاظِ دیگر، ہمارا ہر عمل، خیال اور ارادہ خدا کے قانون کے مطابق نتیجہ مرتب کر کے رہتا ہے۔

یہی کیفیت اس معاشرہ کی ہوگی جو قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل ہوگا۔ اس میں بھی ہر عمل نتیجہ خیز ہو کر رہے گا۔ نہ کسی کی محنت ضائع ہوگی نہ مجرم پاداشِ عمل سے بچ سکے گا۔

۱۴۔ اَللَّطِیۡفُ

لیکن اتنا قریب ہونے کے باوجود اتنا لطیف کہ نظر نہ آ سکے۔

لَا تُدۡرِکُهُ الۡاَبۡصَارُ ۫ وَ هُوَ یُدۡرِکُ الۡاَبۡصَارَ ۚ وَ هُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ ﴿۶/۱۰۴﴾۔

"اُسے نگاہیں نہیں پا سکتیں، لیکن وہ تمام نگاہوں کو پا رہا ہے۔ وہ بڑا ہی باریک بین آگاہ ہے"!

لَطِیۡفٌ خَبِیۡرٌ کے لئے دیکھئے (۳۱/۱۶ ؛ ۲۲/۶۳ ؛ ۶۷/۱۴ ؛ ۳۳/۳۴)۔

لَطِیۡف کے معنی نرمی کا برتاؤ کرنے والا بھی ہیں۔ اَللّٰهُ لَطِیۡفٌۢ بِعِبَادِهٖ (۴۲/۱۹) اللہ اپنے بندوں پر (راہ نمائی دینے میں) نرمی کا برتاؤ کرتا ہے۔ اِنَّ رَبِّیۡ لَطِیۡفٌ لِّمَا یَشَآءُ (۱۲/۱۰۰)۔ یقیناً میرا رب اپنی مشیّت کے مطابق نرمی کا برتاؤ کرنے والا ہے۔

اَلشَّهِیۡدُ

(حاضر و ناظر)

لطیف ایسا کہ نگاہوں سے اوجھل لیکن قریب ایسا کہ ہر جگہ حاضر و ناظر اور ہر شے پر شاہد۔

وَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ ۵ (۵۸/۶ نیز ۴/۳۳ ؛ ۵/۱۱۷ ؛ ۲۲/۱۷ ؛ ۳۴/۴۷ ؛ ۳۳/۵۶)۔ کوئی عمل بظاہر کیسا ہی پوشیدہ کیوں نہ ہو، اللہ کے علم سے نہیں چھُپ سکتا کیونکہ وہ ہر عمل پر شاہد ہے۔

وَ اللّٰہُ شَہِیۡدٌ عَلٰی مَا تَعۡمَلُوۡنَ ۵ (۳/۹۷ ؛ ۱۱/۴۶)۔ جب کوئی ایسا معاملہ سامنے آجائے جس کے لئے کوئی گواہ نہ ملے تو اللہ اس پر بھی شاہد ہوتا ہے۔ ایک مقدمہ میں حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کے فیصلہ کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا وَ کُنَّا لِحُکۡمِہِمۡ شٰہِدِیۡنَ (۲۱/۷۸) اور ہم ان کے فیصلے پر شاہد تھے اور صرف اسی ایک فیصلہ پر شاہد نہیں، حق جہاں بھی ہو، اللہ اس پر شاہد ہوتا ہے۔ غور کیجئے! ایک رسول آتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ یہ ایک پیغام ہے جو تمہارے خدا کی طرف سے تمہاری طرف نازل ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بہت بڑا دعویٰ ہے جس کی صداقت کی شہادت کے لئے ایک بہت بڑے گواہ کی ضرورت ہے۔ یہ گواہ کون ہے؟ فرمایا۔

لٰکِنِ اللّٰہُ یَشۡہَدُ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اِلَیۡکَ اَنۡزَلَہٗ بِعِلۡمِہٖ ۚ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ یَشۡہَدُوۡنَ ؕ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیۡدًا ۵ (۴/۱۶۶ نیز ۳/۱۷)۔

"(اے پیغمبر! اگر یہ لوگ تمہاری سچائی سے انکار کرتے ہیں تو کریں) لیکن اللہ نے جو کچھ تم پر نازل کیا ہے وہ اسے نازل کرکے (تمہاری سچائی کی) گواہی دیتا ہے اور اس نے اسے اپنے علم کے ساتھ نازل کیا ہے اور ملائکہ بھی اس کی گواہی دیتے ہیں اور (جس بات پر اللہ گواہی دے تو) اللہ کی گواہی کفایت کرتی ہے۔"

حضورؐ کی رسالت پر گواہی۔

وَ اَرۡسَلۡنٰکَ لِلنَّاسِ رَسُوۡلًا ؕ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیۡدًا ۵ (۴/۷۹)۔

"(اے پیغمبر) ہم نے تمہیں تمام نوعِ انسانی کے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اس پر اللہ کی شہادت کفایت کرتی ہے۔"

ایسا پیغامبر جس کا پیغامِ رُشد و ہدایت دنیا کے ہر آئین و مسلک پر غالب آنے والا ہو۔

ہُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ ؕ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیۡدًا ۵ (۴۸/۲۸)۔

"وہ ذات جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا تاکہ اسے تمام ادیان (عالم) پر

غالب کرے اور (اس حقیقت پر) اللہ کی شہادت کافی ہے"۔

سلسلۂ رُشد و ہدایت کی مختلف کڑیوں پر نگاہ ڈالئے)، داعیِ الی الحق کی پہلی صدا، بظاہر ایک بے یار و مددگار کی صدا ہوتی ہے۔ لوگ عناد و شرارت کی بنا پر اس کی تکذیب کرتے ہیں اور یوں حق و باطل میں مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ظاہری اسباب کی تمام قوتیں باطل کے ساتھ نظر آتی ہیں اور حق، بے کسی و بے بسی کے عالم میں دکھائی دیتا ہے۔ اس وقت محض دنیاوی اسباب و علل پر نگاہ رکھنے والوں میں سے کوئی شخص اس کی گواہی نہیں دیتا کہ اس معرکہ میں حق کامیاب ہوگا۔ لیکن وہیں ایک ایسا شاہد بھی ہوتا ہے جو علی الرغم شہادت دیتا ہے کہ انجامِ کار فتح حق کی ہی ہوگی اور پھر نتائج بتا دیتے ہیں کہ یہ شہادت کتنی بڑی صداقت پر مبنی تھی۔ فرمایا۔

قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً ۖ قُلِ اللّٰهُ ۚ شَهِیْدٌۢ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ۚ وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ ؕ اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى ؕ قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝

(۶/۱۹ نیز ۲۹/۱۰، ۱۷/۹۶، ۲۹/۵۲، ۴۶/۸)

" (اے رسول! ان معاندین سے پوچھو کہ) کون سی چیز ہے جس کی گواہی سب سے بڑی گواہی ہے؟ تم کہدو کہ (اللہ کی گواہی ہے) اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے۔ اس نے مجھ پر اس قرآن کی وحی کی ہے تاکہ اس کے ذریعہ تمہیں اور اُنہیں جن تک اس کی تعلیم پہنچ جائے (باطل پرستی کے انجام سے) آگاہ کروں (اب کہو تمہارا کہنا کیا ہے؟) کیا تم گواہی دیتے ہو کہ خدا کے ساتھ دوسرے معبود بھی شریک ہیں؟ (اے پیغمبر) تم کہو (اگر تمہاری گواہی یہی ہے تو سُن رکھو کہ) میں اس کی گواہی نہیں دیتا۔ میری گواہی یہی ہے کہ وہی معبودِ یگانہ ہے، اس کے سواہ کوئی نہیں۔ اور جو کچھ تم اس کے شریک ٹھہراتے ہو میں اس سے بیزار ہوں۔ (بس اب ایک گواہی تمہاری ہوئی اور ایک میری اور فیصلہ خدا کے ہاتھ ہے۔ تم دیکھو گے کہ فیصلہ کس کے حق میں ہوتا ہے!)"۔

ان معاملات میں خدا کی شہادت کے معنی یہ ہیں کہ جب قرآن پر علم و بصیرت کی روشنی میں غور و فکر کیا جائیگا، تو وہ اپنے من جانب اللہ ہونے کی شہادت آپ بن جائے گا اور جب تم نظامِ کائنات پر غور و فکر کرو گے تو وہاں سے بھی یہ حقیقت تمہارے سامنے آجائے گی کہ خدا کے قوانین کس محکمیت سے کارفرما رہتے ہیں اور ان

کے نتائج کیسے تعمیری ہوتے ہیں۔ یہ ملائکہ کی شہادت ہوگی۔ (قرآن نے مظاہرِ فطرت کو بھی ملائکہ کہہ کر پکارا ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے کتاب "ابلیس و آدم")۔ اسی طرح جب قرآنی نظام کے نتائج سامنے آئیں گے تو ان سے بھی قرآن کے برحق ہونے کی شہادت مل جائے گی۔ اس سے آگے بڑھئے تو مومن کی زندگی اور جماعتِ مومنین کا کردار خود اس امر کی شہادت ہوگا کہ یہ لوگ حق کے علمبردار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر نشو و نما یافتہ ذات، حق کی شاہد ہوتی ہے۔

اَلْحَسِیْبُ

جب وہ ہر عمل پر شاہد ہے، تو ظاہر ہے کہ تمام اعمال و افعال پر محاسبہ بھی اسی کا ہے۔ ایک ذرّہ بھی اس کے قانونِ مکافات کے احاطہ سے باہر نہیں ہو سکتا۔ اس کے علم کے سامنے ظاہر و باطن یکساں ہے۔ اس لئے کوئی عمل حدودِ مجازات سے باہر نہیں جا سکتا۔

وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ

"جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، تم اسے ظاہر کرو یا پوشیدہ رکھو، وہ تم سے اس کا محاسبہ کرتا ہے۔"

(۲/۲۸۴ نیز ۱۵/۹۲)

اور اس کے لئے اسے کسی معاون و مددگار کی ضرورت نہیں۔ وہ حساب لینے کے لئے خود کافی ہے۔ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِیْبًا (۴/۶ نیز ۴/۸۶ و ۳۳/۳۹)۔

ایک ایک ذرّہ محاسبہ کی گرفت میں آجاتا ہے۔

وَ نَضَعُ الْمَوَازِیْنَ الْقِسْطَ لِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَیْئًا ؕ وَ اِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَیْنَا بِهَا ؕ وَ كَفٰى بِنَا حٰسِبِیْنَ ۝ (۲۱/۴۷)۔

"اور ظہورِ نتائج کے وقت ہم انصاف کی ترازو کھڑی کر دیں گے۔ اس میں کسی کے ساتھ ذرا بھی ناانصافی نہ ہوگی۔ اگر رائی برابر بھی کسی کا عمل ہوگا تو ہم اسے وزن میں لے آئیں گے۔ جب ہم (خود) حساب لینے والے ہوئے تو پھر اس کے بعد باقی کیا رہا؟"

اور یہ "حساب" صرف قیامت کے دن ہی نہیں ہوگا، بلکہ یہ سلسلہ یہیں سے شروع ہو جاتا ہے اُس کے آئینِ مکافات اور قانونِ مہلت کے ماتحت بعض نتائج بدیر ظہور میں آتے ہیں اور بعض جلد، لیکن حساب بہرکیف فوراً شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر عمل کا نتیجہ اس عمل کے سرزد ہونے کے ساتھ ہی مرتّب ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ محسوس و مشہود شکل میں ہمارے سامنے کچھ وقت کے بعد آتا ہے اس کے لئے کہا کہ وَ هُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۱۳/۴۱)۔ چنانچہ کفّارِ مکّہ کو ان کے انکار و جحود کے جن نتائج سے ڈرایا جاتا تھا ان کے متعلق فرمایا۔

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ ۝ (۱۳/۳۹ نیز ۳۹ — ۲۲/۴۰ ؛ ۴۰/۱۷)

"اور ہم نے ان لوگوں سے جو وعدے کئے ہیں (کچھ ضروری نہیں کہ یہ سب ایک ہی مرتبہ ظہور میں آجائیں) ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض باتیں ہم تجھے (اے رسول) تیری زندگی میں دکھا دیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان سے پہلے ہی تیرا وقت پورا ہو جائے۔ بہرحال جو کچھ تیرے ذمّہ ہے وہ پیغامِ حق پہنچا دینا ہے۔ ان سے (ان کے اعمال کا) حساب لینا ہمارا کام ہے تیرا کام نہیں ہے۔"

اس کا حساب سخت اور حساب کا نتیجہ بڑا محکم گیر ہوتا ہے۔

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَ رُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا وَّ عَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ۝ (۶۵/۸)

"اور کتنی بستیاں ایسی تھیں کہ انہوں نے اپنے رب اور اس کے رسولوں کے حکم سے سرتابی کی۔ سو ہم نے ان کا سخت محاسبہ کیا اور (ان کے اعمال کی پاداش میں انہیں) عذابِ شدید میں گرفتار کیا۔"

یہ حساب کس طرح ہوتا ہے اور اس کے نتائج کیسے سامنے آتے ہیں، ان امور کی تفصیل کسی آئندہ مجلّدات میں سامنے آئے گی۔ یہاں صرف اتنا ہی اشارہ کافی ہے کہ یہ چیزیں کہیں باہر سے نہیں آتیں، بلکہ خود نفسِ انسانی کے اندر ہی یہ حساب کتاب مرتّب ہوتا رہتا ہے لیکن ہوتا ہے اللہ کے قانونِ مکافات کے مطابق ہے۔

وَ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ؕ وَ نُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا ۝ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ؕ

(۱۷/۱۴ -۱۳)

"اور ہم نے ہر انسان کا اعمالنامہ خود اس کی گردن سے باندھ رکھا ہے۔ (اس وقت وہ لپٹا ہوا ہے) قیامت کے دن ہم اسے کھول کر سامنے لے آئینگے۔ وہ اسے اپنے سامنے کھلا دیکھ لیگا اور (ہم اس سے کہیں گے کہ) اپنا نامۂ اعمال پڑھ لے۔ آج کے دن خود تیرا نفس تیرے احتساب کے لئے کافی ہے"

اسی کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا گیا ہے کہ ہر شخص کا حساب خدا کے ذمّہ ہے۔

اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ۙ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ۧ (۸۸/۲۶-۲۵)

"یقیناً ان (تمام انسانوں) کو ہماری طرف لوٹنا ہے اور ان سب کا حساب ہمارے ذمّہ ہے"۔

جب انسانی معاشرہ کی تشکیل اُن افراد کے ہاتھوں سے ہو جن کی ذات، خداوندی صفات کی آئینہ دار ہو تو اس میں ہر شخص کے اعمال کا محاسبہ ہوتا رہتا ہے۔ نہ کسی کا حسنِ عمل بلا نتیجہ رہتا ہے نہ جرم چھپ سکتا۔ اس میں نہ کسی کی رعایت ہوتی ہے نہ کسی کے ساتھ زیادتی۔ میزانِ عدل ہوتی ہے اور لوگوں کے اعمالِ حیات۔

۱۷- اَلشَّاكِرُ
اَلشَّكُوْرُ

شُکر کے بنیادی معنی ہیں اعمال کے بھرپور نتائج۔ لہٰذا' اَلشَّاكِرُ اور اَلشَّكُوْرُ کے معنی ہیں انسانی اعمال کا بھرپور بدلہ دینے والا۔

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ۝ (۴/۱۴۷ نیز ۲/۱۵۸)۔

"(لوگو!) اگر تم شکر کرو (یعنی خدا کی نعمتوں کی قدر کرو اور انھیں ٹھیک ٹھیک کام میں لاؤ) اور خدا پر ایمان رکھو، تو خدا کو تمہیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے؟ خدا تو ان اعمال کا قدر شناس اور ان کی (حالت) کا علم رکھنے والا ہے"!

وہ تو ایسا قدرشناس ہے کہ جو کچھ تم اللہ کی راہ (نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے) صرف کرو اس کا بدلہ اس سے کہیں زیادہ دیتا ہے۔

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ۙ (۶۴/۱۷)۔

"اگر تم اللہ کو قرضِ حسنہ دو تو وہ اسے دگنا (کر کے تمہیں واپس) دے گا اور تمہاری حفاظت کا سامان کردیگا اور اللہ (اعمالِ حسنہ) کی بڑی قدر کرنے والا اور بڑا بُردبار ہے۔"

سورۂ فاطر میں فرمایا کہ جو لوگ کتاب اللہ کے اِتباع میں نظامِ صلوٰۃ قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ کا انتظام کرتے ہیں، وہ اپنا اثاثہ ایک ایسی تجارت میں لگاتے ہیں جس میں کبھی نقصان نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ باب تجارت کھولا ہی اس لئے ہے۔

لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَ يَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ○ (۳۵/۳۰)۔

"تاکہ وہ ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ انہیں دے اور اپنے فضل سے اس پر اضافہ بھی کرے یقیناً وہ سامانِ حفاظت عطا کرنیوالا (اعمال کا) بہترین بدلہ دینے والا ہے۔"

یہی لوگ جب جنت میں داخل ہوں گے، تو وہاں ان کی صدا اس کے سوا کچھ نہ ہوگی۔

وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ۙ (۳۵/۳۴)۔

"ہر قسم کی حمد و ستائش کے لائق وہ ذات ہے جس نے حُزن و ملال کو ہم سے دور کیا (اور ہمیں اس امن و سلامتی کے مقام پر پہنچا دیا)۔ یقیناً ہمارا رب بخشنے والا بہترین بدلہ دینے والا ہے۔"

۱۸۔ اَلسَّلَامُ۔ اَلْمُؤْمِنُ

قرآنِ کریم نے انسانی زندگی کی انتہائی کامیابیوں کو ایک جامع لفظ میں بیان کیا ہے اور وہ لفظ

ہے سلام۔ غور کیجئے! تمام انسانی جدوجہد کا مقصود اور اس کی ساری تگ ودو کا مفہوم اس کے سوا اور کیا ہے کہ اسے سلامتی حاصل ہو۔ امن وسکون کی زندگی، اطمینان وسلامتی کی زندگی، وہ زندگی جس میں کوئی خوف وحزن نہ ہو، کسی قسم کا رنج وملال نہ ہو، کامل اطمینان وسکون ہو۔ لیکن وہ فریب سکون نہیں جو آرزوؤں کے فنا اور خواہشات کے ترک کر دینے سے حاصل ہوتا ہے، بلکہ وہ اطمینانِ قلب جو تسخیرِ کائنات کے بعد اس کے ماحصل کو اقدارِ خداوندی کے مطابق صرف کرنے سے حاصل ہوتا ہے اس لئے خدا کی صفات اَلسَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ (۵۹/۲۳)۔ (امن وسلامتی کا عطا کرنے والا) بھی ہے۔ واضح رہے کہ سلام کے معنی امن وسلامتی (PEACE) کے علاوہ کسی شے کے مکمل (مسلّم) کر دینے کے بھی ہیں۔ خدا کی ذات مکمل ترین ہے۔ جو انسان اس کے قوانین کی اطاعت کرتا ہے اس کی ذات کی بھی تکمیل ہو جاتی ہے۔ یہ ہے وہ سلام (مکمل ہو جانا) جس کی طرف خدا کا نظام دعوت دیتا ہے۔

وَ اللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (۱۰/۲۵)

"اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور جو شخص چاہتا ہے اسے (اپنے قانونِ مشیت کے مطابق) سلامتی کی سیدھی راہ دکھا دیتا ہے۔"

اللہ سلامتی کے گھر کی طرف دعوت قرآنِ کریم کے ذریعے دیتا ہے۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ يَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (۵/۱۶-۱۵)

"اللہ کی طرف سے تمہارے پاس (حق کی) روشنی آ چکی، یعنی ایسی کتاب جو اپنی ہدایتوں میں (نہایت) واضح ہے۔ خدا اس کتاب کے ذریعے ان لوگوں پر جو خدا کی رضا جوئی کے تابع ہوں سلامتی کی راہ کھول دیتا ہے اور اپنے حکم سے (یعنی اپنے مقررہ قانون کے مطابق) انہیں تاریکیوں میں سے نکالتا اور (کامیابی کی) سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے۔"

اس لئے خدا کے پاس سلامتی کا گھر ان کے لئے ہے جو اس کی کتابِ مبین پر ایمان لائیں اور صراطِ مستقیم پر چلیں۔

وَ هٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ۝ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ هُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۶/۱۲۶-۱۲۸)

"اور یہ تمہارے پروردگار کی سیدھی راہ ہے۔ بے شک ہم نے ان لوگوں کے لئے جو نصیحت و موعظت پر دھیان دینے والے ہیں (راہِ حق کی) نشانیاں تفصیل کے ساتھ بیان کر دی ہیں۔ ان لوگوں کے لئے ان کے پروردگار کے نزدیک سلامتی اور عافیت کا گھر ہے اور ان کے (حسنِ) اعمال کی وجہ سے اللہ ان کا رفیق و مددگار رہے۔"

یہی وہ راہِ راست ہے جس پر چلنے والوں کے لئے سلامتی ہے۔ وَ السَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ۝ (۲۰/۴۷) اور الہدیٰ (خدا کی ہدایت) اب قرآنِ کریم کے علاوہ اور کہیں نہیں۔ اس لئے جس شب[1] مبارک میں امن و سلامتی کے پیغام کا نزول شروع ہوا اس کے متعلق فرمایا کہ

سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝ (۹۷/۵)۔

"(اس شبِ مبارک میں) تمام امور میں سلامتی ہی سلامتی ہے یہاں تک کہ طلوعِ فجر ہو جائے۔"

قرآنِ کریم مسلمانوں کی ذہنی و قلبی تعلیم کا مرکز ہے اس لئے وہ سراپا امن و سلامتی کا سرچشمہ ہے۔ ملّتِ اسلامیہ کا سیاسی مرکز کعبہ ہے اس لئے وہ بھی امن و عافیت کا کفیل ہے۔ وَ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ (۳/۹۶) "جو کوئی اس کی حدود میں داخل ہو گیا' امن و حفاظت میں آ گیا"۔ غور کیجئے! دنیا کو ایسے خطۂ ارض کی کتنی ضرورت ہے، جہاں کسی مستبد کے دستِ تطاول کی رسائی نہ ہو، جہاں پہنچ کر انسان کامل حریّت و آزادی کی فضا میں سانس لے، جہاں اسے کسی قسم کا خوف و حزن نہ ہو، جہاں اس کا سب کچھ محفوظ ہو۔ یہ امن و عافیت کا مرکز کعبہ ہے اس لئے کہ وہ دنیا میں حکومتِ خداوندی کا مستقر ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جس نظام کا مرکز امن و سلامتی کا سرچشمہ ہو اس کا دائرہ از خود امن و عافیت کا کفیل ہوگا

---

[1] یا تاریکی کے زمانے میں۔

برگزیدہ انسانوں کو سلامتی کی بشارتیں

حضرات انبیائے کرامؑ کو جن کی ذاتِ گرامی نمائے صفاتِ خداوندی کی مورد تھی، امن و سلامتی کی بشارتوں سے نوازا جاتا تھا۔ حضرت نوحؑ اور ان کے متبعین کے متعلق فرمایا۔

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَ عَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ (۱۱/۴۸ نیز ۳۷/۷۹)

"حکم ہوا، اے نوح! اب کشتی سے اُتر۔ ہماری جانب سے تجھ پر سلامتی اور برکتیں ہوں، نیز ان جماعتوں پر جو تیرے ساتھ ہوں"۔

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق فرمایا، سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۝ (۳۷/۱۰۹)۔ حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کے متعلق فرمایا، سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ۝ (۳۷/۱۲۰)۔ اسی طرح حضرت الیاسؑ کے متعلق فرمایا، سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ ۝ (۳۷/۱۳۰)۔ حضرت یحییٰؑ کے متعلق ارشاد ہے۔

وَ سَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَ يَوْمَ يَمُوْتُ وَ يَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ۧ (۱۹/۱۵)۔

"اس پر سلامتی ہو جس دن وہ پیدا ہوا، جس دن مرا اور جس دن پھر زندہ اُٹھایا جائے گا"۔

ایسا ہی حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے۔ (۱۹/۳۳)۔

تمام مرسلین کے متعلق فرمایا، وَ سَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۚ (۳۷/۱۸۱) تمام برگزیدہ بندوں کے متعلق ارشاد ہوا۔

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ سَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ؕ آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ (۲۷/۵۹)۔

"کہو کہ تمام تعریف اور ستائش اللہ کے لئے اور سلامتی خدا کے برگزیدہ بندوں کے لئے (تو) کیا اللہ بہتر ہے یا وہ جنہیں یہ لوگ اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں"!

یہ سب وہ حضرات ہیں جن کی ذات، صفاتِ خداوندی کا آئینہ ہے۔ اس لئے ان کے لئے سلامتی ہے۔

جنّت میں سلامتی

جو معاشرہ ایسے افراد کے ہاتھوں متشکّل ہو جن کی ذات نشوونما پاکر صفاتِ خداوندی کی مظہر ہو، وہ معاشرہ، اس دنیا میں جنّتی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

اور جب یہ افراد، اس دنیا کے بعد، اگلی زندگی میں جائیں، تو انہیں وہاں بھی جنّتی زندگی نصیب ہوگی۔ اُخروی جنّت، زندگی کے ارتقائی منازل سے عبارت ہے اور یہ منازل وہی افراد طے کر سکیں گے جن کی ذات نشوونما یافتہ ہوگی۔ ان افراد کے متعلق ارشاد ہے۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ۝ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ۝

(۴۵-۱۵/۴۶ نیز ۵۰/۳۴)

"بلاشبہ متقی باغوں اور چشموں (کی راحت) میں ہوں گے (ان سے کہا جائے گا) امن و سلامتی کے ساتھ ان میں داخل ہو جاؤ!"

سورۂ دخان میں ہے اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ۙ (۴۴/۵۱)۔ یقیناً متقی امن کی جگہ میں ہونگے وہاں ناشائستگی کی کوئی بات نہیں ہوگی۔ ہر طرف سے سلامتی کی صدائیں کانوں میں پڑیں گی۔ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ؕ (۱۹/۶۲ نیز ۵۶/۲۶)۔ اس زندگی میں کوئی لغوبات ان کے کانوں میں نہ پڑے گی، جو کچھ سُنیں گے، وہ سلامتی کی صدا ہوگی۔ اہلِ جنّت کی دعائیں اور صدائیں سب سلامتی کے لئے ہوں گی۔

دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۧ (۱۰/۱۰)

"وہاں ان کی پکار یہ ہوگی، خدایا! تو ہر نقص سے دُور ہے۔ ان کی دُعا یہ ہوگی، سلامتی ہو اور خاتمہ یہ ہوگا، الحمد للّٰہ رب العالمین!"

اہلِ اعراف جنّت والوں کے پاس یہی ہدیۂ سلام بھیجیں گے۔

وَ نَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ (۷/۴۶)۔

"یہ لوگ اہلِ جنّت کو پکاریں گے کہ تم پر سلامتی ہو!"

ملائکہ آئیں گے اور اہلِ جنّت کو امن و سلامتی کا ہدیۂ تہنیت پیش کریں گے۔

وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۚ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ؕ (۲۳-۱۳/۲۴ نیز ۱۶/۳۲، ۳۹/۷۳)

"ملائکہ ہر دروازے سے ان پر آئیں گے اور کہیں گے" یہ جو تم نے دنیا کی زندگی میں استقامت سے

کام لیا تو اس کی وجہ سے (آج) تم پر سلامتی ہو۔ پھر کیا ہی اچھا عاقبت کا ٹھکانا ہے جو ان لوگوں کے حصہ میں آیا ہے"۔

اسلامی معاشرت میں سلام

سلام و تہنیت کا جو انداز اہلِ جنت کا ہوگا، مومنین کو اسی کی تلقین اس زندگی میں کی گئی ہے یا یوں کہئے کہ باہمی دعا و سلام کا جو اسلوب مسلمانوں کی موجودہ معاشرت میں رکھا گیا ہے وہی جنت کی زندگی میں ہوگا۔ غور کیجئے کہ اگر زندگی اسلامی خطوط پر متشکل ہو جائے تو کس طرح اسی دنیا میں امن و سلامتی کی جنت آباد ہو جائے۔ مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کے متعلق ارشاد ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (۲۴/۲۷)

"اے ایمان والو! اپنے گھروں کے علاوہ جب کسی اور کے گھر میں جانا ہو تو پہلے ان سے اجازت طلب کرو اور پھر اہلِ خانہ کو سلام کہو۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے تاکہ تم اس حقیقت کو ہر وقت یاد رکھو (کہ تمہارا باہمی تعلق امن و سلامتی کا تعلق ہے)"۔

غیروں کے گھروں میں ہی نہیں، بلکہ خود اپنے گھروں میں بھی آؤ، تو اپنے اہلِ خانہ کو سلام و تہنیت کا ہدیہ پیش کرو۔

فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ؕ (۲۴/۶۱)۔

"سو جب تم گھر میں داخل ہو تو اپنے لوگوں کو (اللہ کا بتایا ہوا) مبارک و طیب ہدیہ سلام پیش کرو"۔

غور کیجئے کہ جس سوسائٹی کے افراد کی یہ کیفیت ہو کہ جب آپس میں ملیں، ایک دوسرے پر امن و سلامتی کی دعاؤں کے پھول برسائیں، اس سوسائٹی کی زندگی کیسی جنت کی زندگی ہوگی۔ جب مسلمان قرآنی تعلیم کی حقیقت سے آگاہ اور اس پر صحیح مفہوم میں عمل پیرا تھے، تو وہی سلام، جو ایک بے جان رسم بن کر رہ گیا ہے، ان کے باہمی ربط و ضبط اور قلبی تعلقات کا زندہ مظہر تھا۔ آج یہ سلام دو لفظوں کا مجموعہ ہے جو

حلق کے اُوپر اُوپر سے میکانکی طور پر زبان پر آجاتے ہیں۔ دل سے ان کا کچھ علاقہ نہیں ہوتا۔ حالانکہ قرآنِ کریم کا مقصود یہ تھا کہ الفاظ تمہارے جذباتِ قلبی کے اظہار کا ذریعہ اور اعمال کا آئینہ ہوں۔ اگر قلب و زبان اور الفاظ و اعمال میں ہم آہنگی نہ ہو تو ان الفاظ کا قرآنی میزان میں کوئی وزن نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ وہ منافقت ہے جو خدا کے ہاں بدترین لعنت کی مستوجب ہے۔

كَبُرَ مَقْتًا عِندَ اللَّهِ أَن تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝ (۶۱/۳)

"اللہ کے نزدیک یہ بہت بُری بات ہے کہ تم زبان سے وہ کچھ کہو جس پر تمہارا عمل شاہد نہ ہو"

اس لئے اسلامی معاشرت میں "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ" صرف دو الفاظ کا مجموعہ نہیں، بلکہ سوسائٹی کے افراد کے قلبی تعلقات کا مظہر ہے۔ وہ تعلقات جو باہمی مودّت و مؤاخات، بہی خواہی اور سلامت روی کی بنیادوں پر استوار ہوں۔ اس معاشرہ میں جب ایک فرد، دوسرے فرد سے ملتا ہے تو اس سے کہتا ہے کہ میں آرزومند ہوں کہ تم ہر طرح سے امن و سلامتی میں رہو۔ اس کا اوّلین مفہوم یہ ہے کہ تم مطمئن رہو۔ میری طرف سے تمہیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ اس کے جواب میں، یہ دوسرا شخص بھی، اس آرزو کا اظہار کرتا ہوا وعلیکم السلام کہتا ہے، یعنی یہ دونوں، اس امر کا اعلان کرتے ہیں کہ ہمیں ایک دوسرے کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں، بلکہ پورا پورا اطمینان ہے کہ ہم باہمی امن و سلامتی سے رہیں گے۔ یہ تھا اسلامی معاشرہ میں "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ" کا مفہوم۔

اب اس طریقِ معاشرت کے ایک اور پہلو پر بھی غور کیجئے۔ آج ہماری یہ حالت ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو کسی اعتبار سے بڑا سمجھتا ہے، وہ متوقع ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ اسے سلام کریں۔ وہ اپنی طرف سے پہل کرنے میں سبکی محسوس کرتا ہے۔ لیکن دیکھئے کہ قرآنِ کریم اس باب میں کیا تعلیم دیتا ہے۔ نوعِ انسانی میں نبی اکرمؐ سے بلند اور کس کا مرتبہ ہو سکتا ہے۔ جس ذاتِ اقدس و اعظمؐ پر ایمان لانا فرض ہے، اس کی رفعتِ شان حیطۂ تصور میں نہیں آسکتی! لیکن قرآنِ کریم کا ارشاد ہے۔

وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ۖ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ (۶/۵۴)۔

"اور (اے پیغمبر) جب وہ لوگ تمہارے پاس آئیں جو ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں، تو تم ان سے کہو، تم پر سلام ہو" تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت لازم ٹھہرا دی ہے"۔

یعنی افرادِ اُمّت کے لئے امن وسلامتی کی آرزوئیں اور ان آرزوؤں کی تکمیل کے لئے عملی پروگرام کا تعین، خود کرنا ملّت کی طرف سے ہونا چاہیئے۔

"اسلام" کا مادہ بھی (س۔ ل۔ م) ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر اسلام کے معنی "امن وسلامتی کا مذہب" کئے جاتے ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ اسلام، امن وسلامتی کا دین ہے لیکن امن وسلامتی تو ایک منفی کیفیت ہے، یعنی شر وفساد کا نہ ہونا۔ اس میں مثبت پہلو نہیں ہے۔

لیکن جب ہم (س۔ ل۔ م) کے دوسرے معانی پر غور کرتے ہیں، تو اس میں مثبت پہلو اُبھر کر سامنے آجاتا ہے۔ وہ دوسرے معانی ہیں ـــ مکمل ہونا ـــ کسی کی کمی کو پورا کرکے اس کی ذات کی تکمیل کر دینا۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو اسلام اس نظام کا نام ہے جس میں ہر فرد، امن وعافیت میں بھی رہتا ہے اور اس کی انسانی صلاحیتوں اور ذات کے مضمرات کی تکمیل بھی ہوتی جاتی ہے۔ اس طرح اسلام، منفی اور مثبت، دونوں پہلوؤں کا حسین امتزاج بن جاتا ہے۔

۱۹- اَلْاَعْلٰی

(بالاتر)

اَلْعَظِیْمُ

(صاحبِ عظمت)

اَلْعَلِیُّ

(برتر)

اَلْمُتَعَالُ

(بلند مرتبہ)

صفحہ ارض پر سب سے زیادہ بلند مرتبت ہستی انسان کی ہے اور انسانیت کی میزان میں اس شخص کو سب سے زیادہ عالی مرتبت سمجھا جاتا ہے جس کی ذات (PERSONALITY) سب سے زیادہ نشوونما یافتہ (DEVELOPED) ہو۔ اللہ کی ذات مکمل ترین ہے۔ اس لئے اس کا مقام بھی بلند ترین ہے۔ جس عظمت اور بلندی کا مالک وہ ہے اس کا تصور بھی انسان نہیں کر سکتا۔ وَ هُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝ (۲/۲۵۵ نیز ۴۲/۴) اور وہ ذات سب سے بلند اور عالی مرتبت ہے۔ عَالِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ (۱۳/۹) غیب و شہادت کا جاننے والا، سب سے بڑا بلند مرتبہ، عالم اور ساتھ حکیم بھی اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝ (۴۲/۵۱) بے شک وہ صاحبِ حکمت و مرتبت ہے (۴۳/۴)۔ علم و حکمت سے آگے بڑھ کر انسان کے نزدیک بلندیٔ مرتبت کا معیار حکومت و سطوت ہے۔ جتنا بڑا صاحبِ حکومت اتنا ہی بڑا صاحبِ مرتبت۔ لیکن قرآن کریم اللہ کے سوا کسی اور کی حکومت کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس لئے جب حکومت اس کی ہے تو بلندی و کبریائی کے شایانِ شان بھی وہی ہے۔ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (۴۰/۱۲)۔ "حکومت تمام اس خدا کی ہے جو بلند مرتبہ صاحبِ (جبروت) کبریائی ہے۔" اس حکومت میں اس کا کوئی شریک نہیں۔

ذَالِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ۝ (۲۲/۶۲ نیز ۳۱/۳۰ ؛ ۳۴/۲۳)۔

"یہ اسی لئے ہے کہ حق اللہ ہی کی ہستی ہے اور جن ہستیوں کو یہ اس کے سوا پکارتے ہیں باطل ہیں اور اس لئے بھی اللہ ہی کی ہستی بلند مرتبہ بڑائی والی ہے۔"

بادشاہِ حقیقی فقط وہی ہے فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ج (۲۰/۱۱۴ ؛ ۲۳/۱۱۶) "پس ہر طرح کی بلندی اللہ کے لئے ہے۔ وہی جہاندارِ حقیقی ہے۔ انسان کے لئے یہی زیبا ہے کہ ساری دنیا سے بڑا ہو کر اس بڑائی کے مالک (خدا) کے سامنے جھکے۔ کائنات کی ہر شے اس کے تابع فرمان ہو، لیکن یہ اس شاہنشاہِ حقیقی کے متعین فرمودہ پروگرام کی تکمیل میں سرگرم عمل رہے۔ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ع (۵۶/۷۴، ۵۶/۹۶) "اپنے عظمتوں والے پروردگار کے نام کی برتری و بلندی دنیا میں ثبت کر۔" سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝ (۸۷/۱) اس لئے کہ کوئی اس کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ وہ اس سے بہت بلند ہے۔ سُبْحَانَهٗ وَ تَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ (۱۶/۱) "اس کی ذات شرک سے پاک اور بلند ہے۔ ان تمام

باتوں سے منزّہ اور بلند جو انسانی ذہن اس کی طرف منسوب کرتا ہے سُبْحَانَہٗ وَ تَعَالٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ ٥ (۶/۱۰۱)۔ ان تمام ہفوات سے پاک اور برتر جو اس کے متعلق جہالت کی بنا پر کہی جاتی ہیں۔ سُبْحَانَہٗ وَ تَعَالٰی عَمَّا یَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا کَبِیْرًا ٥ (۱۷/۴۳)۔

عالی مرتبت خدائی بندے

ظاہر ہے کہ جب خدائے بلند و برتر اس درجہ عالی مرتبت ہے، تو دنیا میں اس کی حکومت قائم کرنے والے بندے بھی کس بلندی پر ہوں گے، ایسی بلندی پر کہ کوئی اور قوم ان کی گرد تک بھی نہ پہنچ سکے۔ انہی کے متعلق کہا کہ

وَ لَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ٥ (۳/۱۳۸؛ ۴۷/۳۵)۔

”مت ہمت ہارو۔ بالکل غمگین نہ ہو۔ تم ہی سب سے برتر و اعلیٰ ہو، بشرطیکہ تم سچے مومن ہو۔“

وہ جماعت جس کی شان یہ ہے کہ

مومنے بالائے ہر بالا ترے
غیرتِ اُو بر نتابد ہمسرے　　(اقبالؒ)

جس طرح ان کا خدا تمام موجودات میں اپنے عُلوِّ مرتبت اور رفعتِ شان کے لحاظ سے وحدہٗ لاشریک ہے، اسی طرح اس کے بندوں کی یہ جماعت تمام نوعِ انسانی میں اپنا شریک و حریف نہیں رکھتی۔

خرقۂ لَا تَحْزَنُوْا اندر برش　　اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ تاجے بر سرش
می کشد بارِ دو عالم دوشِ اُو　　بحر و بر پروردۂ آغوشِ اُو
پیشِ باطل تیغ و پیشِ حق سپر　　امر و نہیِ اُو عیارِ خیر و شر
در فضائے ایں جہانِ ہائے و ہُو　　نغمہ پیدا نیست جز تکبیرِ اُو

لیکن ان کی یہ رفعت اور بلندی نہ سرکشی و تمرّد کی پیدا کردہ ہوگی نہ اسے پیدا کرنے کا موجب۔ ایک ”عُلوِّ مرتبت“ فرعون ہے جس کا دعویٰ تھا کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی (۷۹/۲۴)۔ میں تمہارا ربِّ اعلیٰ ہوں، لیکن اس کا دعویٰ خود فریبی پر مبنی تھا۔ تمرّد و سرکشی کبھی حقیقی بڑائی نہیں ہو سکتی۔ بڑائی وہی بڑائی ہے جو قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکنے سے حاصل ہو۔ قیام وہی قیام ہے جس کے ساتھ سجدہ بھی شامل ہو۔ حقیقی بڑائی فرعون کا حصہ

نہ تھی، حضرت موسیٰؑ کا حصّہ تھی۔ جب ساحرینِ فرعون سے مقابلہ ہوا اور حضرت موسیٰؑ نے ہراس محسوس کیا کہ لوگ ساحرین کے جادو سے متاثر نہ ہو جائیں تو ارشاد ہوا کہ لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ۝ (۲۰/۶۸)۔ "اندیشہ نہ کرو یقیناً تم ہی غالب رہو گے۔" اس لئے کہ حقیقی غلبہ کے لئے صداقت ضروری ہے اور صداقت حضرت موسیٰؑ کے ساتھ تھی، آلِ فرعون کے ساتھ نہ تھی۔ اسی لئے فرمایا کہ حق و صداقت کی مخالفت کرنے والوں کے منصوبے ہمیشہ پست ہو جاتے ہیں اور اللہ کی بات بلند رہتی ہے۔

وَ جَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (۹/۴۰)۔

اور اس نے (بالآخر) کافروں کی بات پست کی اور اللہ ہی کی بات ہے جس کے لئے بلندی ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔

لہٰذا، ہر قسم کی بڑائی اور عظمت اللہ کے لئے، اللہ کے دین کے لئے اور اس ملت کے لئے ہے جو دنیا میں اس کے دین کے تمکّن کا باعث ہو۔

۲۰۔ اَلْمَتِيْنُ
(قوت والا)
اَلْعَزِيْزُ
(زبردست، غالب)

عزت کے معنی بھی قوت کے ہیں، لیکن ایسی قوت جس کے ساتھ غلبہ بھی شامل ہو۔ اس لئے عزیز کے معنی صاحبِ غلبہ ہوں گے۔ متانت میں بھی قوت کا مفہوم پنہاں ہے لیکن ایسی قوت جس میں کہیں ڈھیل نہ ہو، کسر نہ ہو، اس لئے مَتِيْنٌ ایسا صاحبِ قوت ہو گا جس کی تدابیر مضبوط و محکم ہوں۔ فرمایا۔

وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ ۚ وَ اُمْلِيْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ۝ (۱۸۲–۱۸۳/۷ نیز ۴۵/۶۸)

"اور جن لوگوں نے ہمارے قوانین کو جھٹلایا ہم انہیں بتدریج (آخری نتیجہ تک) لے جائیں گے اس طرح کہ انہیں خبر بھی نہ ہوگی۔ ہم انہیں ڈھیل دیتے ہیں اور ہماری مخفی تدبیر (یعنی قانونِ مجازات) بڑی ہی مضبوط ہے۔"

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ تمام قوتوں کا مالک اور متین و مقتدر ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ○ (۵۱/۵۸)

"یقیناً اللہ رزق دینے والا محکم قوتوں کا مالک ہے۔"

قرآنِ کریم میں اللہ تعالےٰ کے لئے عَزِیْز کا لفظ متعدد مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ کہیں عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ہے (۲/۲۴۰)، یعنی وہ ذات جس کا غلبہ معاذ اللہ اندھا دھند قوت کے بل بوتے پر مبنی نہیں، بلکہ سرتاپا حکمت و اصلاح پر مبنی ہے۔ کہیں عَزِیْزٌ ذُوانْتِقَامٍ ہے (۳/۳) یعنی اس کا غلبہ اس لئے ہے کہ قانونِ مکافات کی رُو سے اعمال کی جزا و سزا پورے پورے طریق پر دی جا سکے۔ کمزور کی حکومت میں نہ حق دار کو اس کا حق ملتا ہے نہ مجرمین کو پاداشِ عمل۔ اس لئے مجازات کے لئے محکم غلبہ اور پائیدار تسلط کی ضرورت ہے۔ اسی لئے قَوِیٌّ عَزِیْزٌ بھی آیا ہے (۲۲/۴۰)، یعنی اس کا غلبہ یونہی اتفاقی طور پر عمل میں نہیں آگیا بلکہ اس کی لامحدود قوتوں کا نتیجہ ہے۔ جب قومِ فرعون اپنے جرائم کی پاداش میں جکڑی گئی تو فرمایا کہ اَخْذَ عَزِیْزٍ مُّقْتَدِرٍ ○ (۵۴/۴۲)۔ اسے اس ہستی نے پکڑا جو غالب اور صاحبِ اقتدار ہے۔ وہ ربّ العزّت ہے (۳۷/۱۸۰)۔ جس کسی کو عزّت کی تلاش ہو اسے اس کے قوانین کی اطاعت کرنی ہوگی۔ اس لئے کہ حقیقی عزت اور کہیں سے نہیں مل سکتی۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ○ (۳۵/۱۰)

"جو عزت کا متلاشی ہے اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ تمام کی تمام عزت اللہ کے لئے ہے۔"

وہ عزت کے متلاشیوں کو عزت عطا کرتا ہے۔ لیکن کیسے؟

اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَ الْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ط (۳۵/۱۰)

"نوعِ انسانی کے لئے منفعت بخش نظریاتِ زندگی اس کی طرف بلند ہوتے ہیں اور عملِ صالح اس کو اوج و رفعت عطا کرتا ہے۔"

اس طرح یہ عزّت اس کے صالح بندوں کے حصّہ میں آتی ہے۔

وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَ لٰكِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ (۶۳/۸)

منافقین دوسروں کے ہاں عزّت کے متلاشی ہوتے ہیں۔ یہ کسقدر نگاہ کا فریب اور دل کی بھول ہے۔

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِیْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمَا ۙ الَّذِیْنَ یَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ اَیَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا ؕ (۴/۱۳۸-۱۳۹)

"(اے رسول) تم منافقین کو مطلع کر دو۔ ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ وہ لوگ جو مسلمانوں (کی جماعت) کو چھوڑ کر کفار کو اپنا دوست بناتے ہیں' کیا یہ لوگ ان (غیروں) کے ہاں عزّت ڈھونڈتے ہیں ؟ (اگر ایسا ہے تو یاد رکھیں کہ عزّت جتنی ہے سب کی سب اللہ ہی کے پاس ہے۔

عزّت تمام اللہ کے لئے ہے اور (اس کی عطا فرمودہ) اس کے رسول اور جماعتِ مومنین کے لئے کہ وہ اس کتاب کے وارث و متبع ہیں جو خود عزیز ہے۔ وَ اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِیْزٌ ۙ (۴۱/۴۱)۔ اس میں شبہ نہیں کہ بظاہر ہمیں نظر آتا ہے کہ اس کتاب کے منکرین بھی صاحبِ عزّت و قوت ہوتے ہیں' لیکن ان کی عزّت جھوٹے نگوں کی میناکاری ہوتی ہے جو ظاہر بیں نگاہوں کو خیرہ کر سکتی ہے' لیکن سچے معیار کی آزمائش کی کبھی تاب نہیں لا سکتی۔ بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ عِزَّةٍ وَّ شِقَاقٍ ۝ (۳۸/۲)۔ "لیکن منکرینِ حق کی یہ حالت ہے کہ ایک جھوٹی عزّت کے زعمِ باطل میں مخالفت پر اڑے ہوئے ہیں" یہ وہ لوگ ہیں جن کی کیفیت یہ ہے کہ

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَ لَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ (۲/۲۰۶)

"اور جب ان لوگوں سے کہا جائے کہ قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے ڈرو تو (جھوٹی عزّت کا گھمنڈ) انہیں (اور زیادہ) مخالفت پر اکساتا ہے۔ ان لوگوں کو جہنم کفایت کریگا جو بہت بُرا ٹھکانہ ہے"۔

وہ جہنم جہاں انہیں نہایت ذلّت کی زندگی بسر کرنا ہوگی اور اس عذاب کے متعلق ان سے کہا جائیگا کہ

ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْكَرِیْمُ ۝ (۴۴/۴۹)۔

"اسے چکھو! تم (اپنے آپ کو) بہت بڑا صاحبِ عزّت و تکریم تصور کیا کرتے تھے"۔

یہ سب اس لئے کہ ان لوگوں نے عزت و تکریم کے غلط معیاروں سے اپنے آپ کو فریب دے رکھا تھا۔ عزت کا معیار صرف یہ ہے کہ

وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَ لِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ (۶۳/۸)

"تمام تر عزت اللہ اور اس کے رسول اور جماعتِ مومنین کے لئے ہے۔"

یعنی صحیح عزت و تکریم، بلندیٔ کردار سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ فریب و استبداد سے۔

جب قرآنِ کریم نے یہ کہا کہ محکم اور پائیدار عزت و تکریم، جماعتِ مومنین کے لئے ہے — اور عزت بھی ایسی کہ کوئی دوسری قوم ان کی ہمسری نہیں کر سکتی — تو اس سے ظاہر ہے کہ ہم موجودہ مسلمان، جو (بدنصیبی سے) دنیا کی ذلیل ترین قوموں میں شمار ہوتے ہیں، اپنے آپ کو مومن نہیں کہہ سکتے۔ مومن اور ذلت کی زندگی دو متضاد باتیں ہیں۔

۲۱- اَلْبَارِئُ
اَلْمُصَوِّرُ

سورۂ حشر میں ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ (۵۹/۲۴)

"اللہ خالق، باری[1] اور مصوّر ہے۔"

ایک نشوونما یافتہ ذات کی بنیادی خصوصیت تخلیق (CREATION) ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفتِ خالقیت کے متعلق (شروع میں) تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ اَلْبَارِئُ اور اَلْمُصَوِّرُ بھی درحقیقت

---

[1] یہ لفظ دو مرتبہ سورۂ بقرہ میں بھی آیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ (۲/۵۴)۔

عملِ تخلیق کے مراحل سے متعلق ہیں۔ تخلیق کے معنی ہیں مختلف عناصر میں خاص تناسب اور ترتیب پیدا کر کے ایک نئی چیز بنا دینا۔ اس ترتیبِ نَو میں حشو و زوائد کو الگ کیا جاتا ہے۔ یہ باریؔ کی صفت ہے۔ اس کے بعد اُسے ایک خاص شکل (FORM) عطا کرنا صفتِ مصوّریّت (صورت گری اور نقوش سازی) ہے۔ انہی مراحلِ تخلیق و تسویہ کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۙ فِیْۤ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ؕ
(۸۲/۸–۷)

"وہ پروردگار جس نے تمہیں پیدا کیا، پھر ٹھیک ٹھیک درست کر دیا، پھر (اعضاء و جوارح میں) اعتدال و تناسب پیدا کیا۔ پھر جیسی صورت بنانا چاہی اس کے مطابق ترکیب دیدی"۔

پہلا مرحلۂ تخلیق۔ اس کے بعد حشو و زوائد کو دُور کر کے تناسب و موزونیّت کا پیدا کرنا، تعدیل و تسویہ اور آخر الامر، نوک پلک درست کر کے صحیح صحیح نقشہ مرتب کر دینا جس سے اس میں حسن و جمال کی تمام رعنائیاں سمٹ کر نادرہ کاری کا زندہ اعجاز بن جائیں (وَ لَكُمْ فِیْهَا جَمَالٌ (۱۶/۶)۔ یہ آخری مرحلہ، مصوّریّت کا ہے۔ هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُكُمْ فِی الْاَرْحَامِ كَیْفَ یَشَآءُ ؕ (۳/۵)" وہ ذات جو رحمِ (مادر) میں، اپنی مشیّت کے مطابق تمہاری صورت آرائی کرتی ہے، ایسی متنوّع صورت گری کہ ایک کا نقشہ دوسرے سے نہیں ملتا اور ایسا حُسنِ تناسب کہ دیکھنے، سونگھنے، سانس لینے کے "آلات" جو اگر محض پرزوں کی مانند بے ڈول بے ڈھنگے ہوتے تو بھی طبعی ضروریات اسی طرح پوری ہو جاتیں، ہزاروں جاذبیتوں کے حسین و جمیل پیکر بن گئے۔ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (۶۴/۳)۔ "اس نے بہترین صورت میں تمہاری صورت گری کی"۔ کیا یہ (معاذ اللہ) کسی "اندھی فطرت کی کرشمہ زائی قرار دی جا سکتی ہے؟ اگر کسی جاذبِ نگاہ تصویر کی سحر کاری و ندرت آفرینی مصوّر کے حُسنِ کمال کی منہ بولتی شہادت سمجھی جا سکتی ہے تو کیا اس نگار خانۂ رنگ و تعطّر کی رعنائی و زیبائی، اس کے خالق کی فقید المثال کاریگری کی دلیل نہیں ٹھہرائی جا سکتی؟

خالق اور خالق کے ساتھ پھر باری اور مصوّر بھی، فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ۔ (۲۳/۱۴)۔

ضمناً اَلْمُصَوِّرُ کے معنی خطوط و نقوش مرتب کرنے والا ہی نہیں۔ اس کے معنی صورت (FORM) عطا کرنے والا بھی ہیں اور یہ ایک اہم بنیادی صفت ہے۔ فلسفہ کے طالب علم جانتے ہیں کہ ارسطو کے نزدیک کسی شے کا وجود، اسکی FORM کا دوسرا نام ہے، یعنی (وہ کہتا ہے کہ) جب کوئی شے، ایک (FORM)

اختیار کرتی ہے تو ہم اس وقت کہتے ہیں کہ وہ شے وجود میں آگئی ہے۔ عالمِ محسوسات میں بلا شکل و صورت (FORMLESS) کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ لہٰذا، قرآنِ کریم نے جب خدا کو المصوّر کہا تو اس سے یہ مفہوم بھی ہے کہ ہر وہ شے کو خاص (FORM) عطا کرکے، اسے وجود میں لاتا ہے۔

۲۲- اَلْوَاسِعُ

علم الافلاک کے ماہرین بتاتے ہیں کہ جب وہ اجرامِ سماوی میں سے کسی ایک کے نظام پر غور کرتے ہیں، تو اس کی لامحدود وسعتوں کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں کہ اس کائنات کی حدود و قیود کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں! یہ اس کارگہِ عالم کے ایک شعبہ کے ایک ضمنی سے گوشے کا حال ہے۔ ذرا تصور میں لائیے کہ یہ تمام و کمال کائنات کیا ہو گی؟ لیکن وہ تصور کہاں سے لایا جائے جس میں ان بے پناہ وسعتوں کا خاکہ بھی سما سکے اور جب کائنات کا یہ عالم ہے تو خود خالقِ کائنات کی وسعتیں کس کے حیطۂ تصور و قیاس و گمان و وہم میں سما سکتی ہیں! ایسی بے پایاں وسعتوں کا مالک، بلا حدود وسعتیں، بلا قیود پہنایاں، ایسے خدا کے لئے مکان و جہت کی نسبت؟ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعَالٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ حقیقت یہ ہے کہ جہت اور مکان کی نسبت اجسام کے لئے درست قرار پا سکتی ہے، ذات PERSONALITY ان نسبتوں سے بلند ہوتی ہے۔

> وَ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ (۲/۱۱۵)۔
>
> (اور دیکھو) مشرق ہو یا مغرب (ساری دنیا) اللہ ہی کے لئے ہے۔ جہاں کہیں بھی تم ہو، وہ تمہارے سامنے ہے۔ بلاشبہ اس کی قدرت کی وسعت بڑی ہی وسعت ہے اور وہ سب کچھ جاننے والا ہے۔

قرآن میں اللہ کی وَاسِعٌ کی صفت بالعموم عَلِيْمٌ کے ساتھ آتی ہے (۲/۲۴۷؛ ۲/۲۶۸؛ ۳/۷۲؛ ۵/۵۴)۔

لہٰذا، یہ وسعت درحقیقت، اس کے علم و حکمت کی وسعت ہے۔ چونکہ یہ وسعت لامحدود ہے، اس لئے ہمارا محدود ذہن اس کا تصور نہیں کر سکتا۔ البتہ اتنا تو ہم بھی جانتے ہیں کہ جسم کے مقابلہ میں انسانی ذات کی

دنیا کس قدر وسیع ہے۔ ذات کی دنیا تو خیر بہت بلند ہے، انسانی فکر کی دنیا بھی بے حد وسیع ہے۔ ہمارے تصورات و خیالات کہاں کہاں پہنچتے ہیں، اس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔

خدا کے علم کی وسعتوں سے نیچے اُتر کر اگر ہم اپنی معاشی اور معاشرتی دنیا میں اس کے الواسع ہونے کا نظارہ کرنا چاہیں تو قوانینِ خداوندی کے مطابق نظامِ معاشرہ متشکل کر کے دیکھیں کہ اس میں کس طرح ایک ایک دانہ سات سات سو میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَ اللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ○ (۲/۲۶۱)۔

"جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں ان (کے انفاق) کی مثال اس بیج کے دانے کی سی ہے جو زمین میں بویا گیا (اس میں سے) سات بالیں پیدا ہو گئیں اور ہر بال میں سو دانے نکل آئے اور اللہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق اس سے بھی دُگنا کر دیتا ہے۔ وہ بڑی وسعت رکھنے والا، سب کچھ جاننے والا ہے"!

اسی لئے فرمایا کہ احکامِ خداوندی کے اتباع میں یہ فکر دامنگیر نہیں ہونی چاہیئے کہ کھانے کو کہاں سے ملے گا؟ نظامِ معاشرت و معیشت خدائی خطوط پر متشکل کر لو، پھر دیکھو کہ اس کی وسعتیں کس طرح بے حساب دیتی ہیں۔ (۴/۱۳۰؛ ۲۴/۳۲)۔ تفصیل رزق کے عنوان میں گذر چکی ہے۔

۲۳۔ اَلْوَهَّابُ

موہبت ایسے عطیّہ کو کہتے ہیں، جو نہ کسی غرض کے لئے دیا جائے نہ معاوضہ کی خاطر۔ کائنات میں انسانی نشو و نما کے لئے جس قدر سامان موجود ہے، وہ سب خدا کی طرف سے اسی قسم کا عطیّہ ہے۔ اس لئے خدا کی صفت اَلْوَهَّابُ بھی ہے۔ انسانی نشو و نما میں، سامانِ زیست کے علاوہ، وحی کی راہ نمائی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ بھی خدا کی طرف سے موهبتہً ملتی ہے۔ اس میں نہ دینے والے (خدا) کی طرف سے کسی معاوضہ کا سوال ہوتا ہے نہ لینے والے (نبی) کے کسی کسب و ہنر کا دخل۔ یہی وہ راہ نمائی

ہے جس کی ہر رہرو جادۂ حیات کو ہر وقت ضرورت رہتی ہے اسی لئے جماعتِ مومنین کی دعا یہ ہوتی ہے کہ

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ○ (۳/۷)۔

"اے پروردگار! ہمیں سیدھے راستے پر لگا دینے کے بعد ہمارے دلوں کو ڈانواں ڈول نہ کر اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما، یقیناً تو ہی ہے کہ بخشش میں تجھ سے بڑا کوئی نہیں"۔

اس راہ نمائی سے انکار کرنے والوں کے متعلق کہا

اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيْزِ الْوَهَّابِ ○ (۳۸/۹)۔

"کیا ان کے پاس تیرے صاحبِ قوت و عطا رب کی رحمتوں کے خزانے ہیں (جو یوں اس سے منحرف ہو رہے ہیں)"۔

خدائے وہّاب کی رحمتوں کے خزانے صرف اسی کے پاس ہیں۔ اس لئے ساری دنیا اسی کی محتاج ہے۔ وہ سب سے بے نیاز ہے۔

انسانی دنیا میں، جن افراد کی ذات، اس صفتِ خداوندی کی آئینہ دار ہو گی، ان کی کیفیت بھی یہ ہو گی کہ وہ باقی افرادِ انسانیہ کو سامانِ زیست بلا مزد و معاوضہ عطا کریں گے۔ اسی کا نام نظامِ ربوبیت ہے جو جماعتِ مومنین کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے۔

۲۴۔ اَلْغَنِیُّ

انسان نے جب اپنے ذہن سے ایک معبود تراشا اور اسے اپنی شکل پر ڈھالا تو اس معبود کے لئے وہی خصوصیتیں متعین کیں جو اس کا ذہن وضع کر سکتا تھا۔ وہ اسے زیادہ سے زیادہ ایک دنیاوی بادشاہ کی پوزیشن دے سکا۔ اس کے نزدیک اس سے بڑھ کر کوئی اور مرتبہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے بعد جب اس نے دیکھا کہ دنیاوی بادشاہ اپنی رعایا سے اپنے احکام منواتے ہیں، انہیں اپنی اطاعت سکھلاتے ہیں، تو یہ سب اس لئے ہوتا ہے کہ ان بادشاہوں کی بادشاہت میں خلل نہ آنے پائے۔ جس قدر رعایا اطاعت شعار اور فرماں پذیر

ہوگی، اسی قدر اس بادشاہ کی حکومت مستحکم اور مملکت پائیدار ہوگی۔ اگر یہ بادشاہ رعایا سے خراج لے گا اور ٹیکس وصول کرے گا، تو بھی اس لئے کہ اس سے اس کی حکومت کا استحکام ہو۔ لہٰذا، ان تمام امور میں وہ بادشاہ اپنی رعایا کا محتاج ہوگا۔ اگرچہ وہ زبان سے اس کا اقرار نہ کرے اور اپنی اس احتیاج کو قانون کے پردہ میں چھپا لے، لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ اپنی رعایا کا محتاج ہوگا۔ اس لئے جب انسان نے اپنے ذہن کے تراشیدہ معبود کو خدا کی حیثیت دی، تو ساتھ ہی یہ بھی لازم سمجھا کہ خدا اپنے بندوں کی عبادت کا محتاج ہے۔ ان کی نذر نیاز کی بھی اسے ضرورت ہے، اسی طرح جیسے دنیاوی بادشاہوں کو ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن قرآن نے دنیا کو جب خدائے حقیقی سے روشناس کرایا، تو اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ قوانینِ خداوندی کا اتباع انسانوں کے اپنے فائدے کے لئے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اس میں کوئی "ذاتی فائدہ" مضمر نہیں۔ اس لئے اسے انسانوں کی عبودیت اور ان کے "نذرانے" کی کوئی حاجت نہیں۔ وہ ان چیزوں سے بے نیاز ہے، مستغنی ہے۔ یہ سب کچھ خود ہمارے فائدے کے لئے ہے۔ اگر کوئی مریض طبیب کی ہدایات پر عمل کرتا ہے، تو اس میں خود مریض ہی کا فائدہ ہے، طبیب اس سے مستغنی ہے۔ اگر کوئی طالب علم اپنے غمخوار استاد کے احکام کی اطاعت کرتا ہے، تو اس میں خود اسی کا نفع ہے، استاد اس سے بے نیاز ہے۔ اسی طرح اللہ بندوں کے کفر و ایمان سے بے نیاز ہے۔ وہ کفر کو پسند نہیں کرتا کیونکہ اس سے انسان ہلاکت کے جہنم میں جا گرتا ہے۔ ایمان کو پسند کرتا ہے کہ یہ انسان کی سرفرازی کا موجب ہے۔

اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ قف وَ لَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَ اِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ؕ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ (۳۹/۷)۔

"اگر تم کفر کرو گے تو اللہ (کو تمہارے ایمان کی ضرورت نہیں وہ) تم سے بالکل بے نیاز ہے۔ (صرف اتنی بات ہے کہ) وہ اپنے بندوں کے لئے کفر پسند نہیں کرتا (یعنی کفر بندوں کے لئے فائدہ رساں نہیں ہوتا) اور اگر تم سپاس گذاری کرو گے، تو وہ اسے تمہارے لئے پسند کرے گا۔ (یعنی اس کا فائدہ تمہیں ہوگا) کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ پھر (آخر الامر) تم سب کو اپنے رب کی طرف لوٹنا ہے۔ وہ تمہیں بتا دے گا جو کچھ تم نے کیا ہوگا۔ وہ تو دلوں کے

بھیدوں (تک) سے واقف ہے"۔

امم سابقہ کے ناسپاس گزار لوگوں کے انجام و عواقب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ۡ فَكَفَرُوْا وَ تَوَلَّوْا وَّ اسْتَغْنَى اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝ (۶۴/۶)۔

"یہ اس لئے کہ ان کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی (ہدایت) لے کر آئے، لیکن انہوں نے کہہ دیا کہ کیا ہمیں (ہمارے جیسے) انسان ہدایت دینے کے لئے آئے ہیں؟ سو انہوں نے انکار کر دیا اور مُنہ موڑ لیا اور اللہ (ان کے کفر و ایمان سے) مستغنی تھا اور وہ تو بے نیاز، سزاوارِ حمد و ستائش ہے"۔

حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا۔

اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝ (۱۴/۸، ۶۴/۶، ۶۰/۶)۔

"اگر تم اور تمام رُوئے زمین کے باشندے کفر کا شیوہ اختیار کر لو، تو (اللہ کو اس کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے) اللہ کی ذات تو بے نیاز اور ستودہ صفات ہے"۔

شکر اور کفر، سپاس گذاری اور انکار سب انسان کی اپنی ذات کے لئے ہے۔

وَ مَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝ (۳۱/۱۲ نیز ۲۷/۴۰)۔

"جو شکر (نعمت) کرے گا تو (اس کا نیک نتیجہ) اس کی اپنی ذات کے لئے ہوگا اور جو انکار کرے گا (تو اس کا وبال اُسی پر پڑے گا) یقیناً اللہ (تمہارے کفر و شکر سے) بے نیاز و ستودہ صفات ہے"۔

عرصۂ حیات میں جدّ و جہد اور سعی و عمل خود انسان کے اپنے نفع کے لئے ہے۔ جو صحیح انداز میں کوشش کرے گا اس کے نتائج سے خود متمتّع ہوگا۔ جو ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے گا اس کے عواقب اس کے سامنے آئیں گے۔

وَ مَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِىٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ○ (۲۹/۶)۔

"اور (یاد رکھو) جو کوشش کرے گا وہ اپنی ذات ہی کے لئے کوشش کرے گا۔ یقیناً اللہ تو تمام کائنات سے بے نیاز ہے۔"

جیسے جس کے اعمال ہوں گے، اسی کے مطابق اس کے مدارج کا تعین ہو جائے گا۔

وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ○ وَ رَبُّكَ الْغَنِىُّ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ (۱۳۳–۱۳۲/۶)۔

"اور (قانونِ خداوندی کی رُو سے) سب کے الگ الگ درجے ہیں ان کے اعمال کے مطابق۔ جیسے کچھ انسان کے اعمال ہیں، اللہ ان سے غافل نہیں۔ تمہارا پروردگار بے نیاز اور رحمت والا ہے۔"

دین کے متعین کردہ "اعمال و عبادات" بھی خود انسانوں ہی کے فائدے کے لئے ہیں۔ اللہ ان عبادات و مناسک کا محتاج نہیں۔ حج کے سلسلہ میں کہا۔

وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ○ (۳/۹۶)۔

"اور اللہ کی طرف سے لوگوں کے لئے یہ بات ضروری ہوگئی کہ اگر اس تک پہنچنے کی استطاعت پائیں تو اس گھر کا حج کریں۔ بایں ہمہ جو کوئی اس سے انکار کرے تو یاد رکھو کہ اللہ کی ذات تمام دنیا سے بے نیاز ہے۔"

نظامِ ربوبیت کی بنیاد انفاق پر ہے، یعنی اپنی محنت کے ماحصل کو فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں) خرچ کرنے کے لئے کھلا رکھنا۔ اس "اللہ کی راہ" سے مراد بھی نوعِ انسانی کی نشوونما اور فلاح و بہبود ہے۔ اللہ کو ہمارے مال و دولت کی کچھ احتیاج نہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَ لَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَ لَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ۝ (۲/۲۶۷)

"اے ایمان والو! جو کچھ کما ڈالے سے کھلا رکھو اور جو کچھ ہم تمہارے لئے زمین سے پیدا کر دیتے ہیں، اس میں سے نکالو (کوئی صورت ہو لیکن) چاہیئے کہ خدا کی راہ میں صرف کرو تو عمدہ چیزیں صرف کرو۔ ایسا نہ کرو کہ فصل کی پیداوار میں سے کسی چیز کو ردّی اور خراب دیکھ کر صدقہ کردو۔ حالانکہ اگر ویسی ہی چیز تمہیں دی جائے تو تم کبھی اسے (خوشدلی سے) نہ لو۔ مگر یہ کہ (جان بوجھ کر) آنکھیں بند کر لو۔ یاد رکھو! اللہ کی ذات بے نیاز اور ساری ستائشوں سے ستودہ ہے۔"

جیسا کہ "خدا کی اولاد کے عقیدہ" کے عنوان میں لکھا جا چکا ہے، چونکہ اولاد اُس وقت کا سہارا ہوتی ہے جب انسان دوسروں کا محتاج ہو جاتا ہے اس لئے لوگوں نے ناسمجھی کی بنا پر اللہ کے لئے اولاد کا عقیدہ بھی قائم کر لیا۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ خیال کس قدر باطل اور بے خبری پر مبنی ہے۔ بھلا اللہ کو کسی کے آسرے کی کیا ضرورت ہے؟ زمین و آسمان میں سب کچھ اسی کی ملک ہے۔ وہ ساری کائنات سے بے نیاز ہے۔ ایسا خدا اولاد کا محتاج کیوں ہوگا۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا سُبْحٰنَہٗ ؕ ھُوَ الْغَنِیُّ ؕ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَکُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۢ بِھٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (۱۰/۶۸ نیز ۲۲/۶۴؛ ۳۱/۲۶)

"یہ کہتے ہیں کہ اللہ نے اپنا ایک بیٹا بنا رکھا ہے۔ اس کے لئے تقدیس ہو۔ وہ تو (اس قسم کی تمام احتیاجوں سے) بے نیاز ہے۔ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اسی کے لئے ہے تمہارے پاس ایسی بات کہنے کے لئے کونسی دلیل آگئی؟ کیا تم اللہ کے بارے میں ایسی بات کہنے کی جرأت کرتے ہو جس کے لئے تمہارے پاس کوئی علم نہیں؟"

زمین و آسمان میں سب کچھ اسی کا ہے۔ وہ جملہ کائنات کا مالک اور خالق ہے۔ وہ احتیاج اور ضرورت کی لطیف سے لطیف نسبت سے بھی پاک اور بلند ہے۔ وہ غنیٌ عن العالمین ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ (جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے) ذات (PERSONALITY) کی بنیادی خصوصیات حریّت (FREEDOM) اور استغنار (INDEPENDENCE) ہے۔ ایک نشوونما

یافتہ ذات، خود مکتفی اور دوسروں کے سہاروں سے بے نیاز ہوتی ہے۔ لہٰذا، خدا کی ذات کسی کی محتاج کس طرح ہو سکتی ہے؟ یہی کیفیت ان لوگوں کی ہوگی جن کی ذات، صفاتِ خداوندی کی آئینہ دار ہوگی۔ وہ بھی دنیا میں کسی کے محتاج نہیں ہوں گے اور جو معاشرہ ان لوگوں کے ہاتھوں سے متشکل ہوگا، وہ بھی دوسروں کے سہاروں سے مستغنی ہوگا۔

ہمارے ہاں عام طور پر الغنی (یا الصمد) کا ترجمہ "بے پرواہ" کیا جاتا ہے۔ "اللہ بڑا بے پرواہ ہے" یہ فقرہ ہر مذہب پرست گھرانے میں مروج چلا آتا ہے۔ لیکن "بے پرواہ" سے خدا کے متعلق ایسا غلط تصور ذہن میں آتا ہے جو نہ صرف یہ کہ اس کے شایانِ شان نہیں، بلکہ اس کی شان کے بالکل خلاف ہے۔ "بے پرواہ" کے معنی ہوتے ہیں وہ جو نہ کسی قاعدے اور قانون کا لحاظ رکھے نہ کسی اصول اور ضابطہ کی پرواہ کرے۔ جو جی میں آئے کرے اور جیسا چاہے فیصلہ کر دے۔ خدا کے متعلق یہ تصور، اس تصور کے یکسر خلاف ہے جو خدا نے اپنے متعلق قرآنِ کریم میں دیا ہے۔

ہم نے بھی مندرجہ بالا آیات میں الغنی کا ترجمہ "بے نیاز" کیا ہے۔ اگرچہ، اس لحاظ سے کہ "بے نیاز" کے معنی ہوتے ہیں وہ جو کسی شے کا محتاج نہ ہو، اس ترجمہ پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا لیکن ہم سمجھتے ہیں مستغنی کا لفظ زیادہ مناسب اور جامع ہے۔ مستغنی کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس کے پاس سب کچھ ہو لیکن وہ ان میں سے کسی شے کا محتاج نہ ہو۔ یہ استغنا ہے جو بے نیازی اور غیر محتاجی سے کہیں زیادہ وسیع المعنی ہے۔ سو خدا کی ذات کامل طور پر مستغنی ہے۔ استغنا، ایک نشوونما یافتہ (انسانی) ذات کی بنیادی خصوصیت ہے۔

۲۵۔ اَلْفَتَّاحُ

فتح کے معنی ہیں کھولنا، حق و باطل میں تمیز کرنا۔ یہیں سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جس چیز کو قرآنِ کریم فتح کہتا ہے، اس کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے یہ فطرت کا اٹل قانون ہے کہ حق غالب رہے گا اور باطل مغلوب ہوگا۔ جس مقام پر، جس معرکہ میں، حق اور باطل کی یہ فطری تمیز کھل کر سامنے آجائے، اسے فتح کہیں گے۔ اس لئے قرآنِ کریم جہاں مومنین کے لئے فتح کا ذکر کرتا ہے، اس سے مفہوم مجرد

(VICTORY) نہیں، بلکہ حق کا غلبہ ہوتا ہے اور چونکہ حق و باطل کی یہ تمیز، اللہ کے قانون کے مطابق ہوتی ہے، اس لئے اللہ فَتَّاح ہے، فاتح ہے۔ سورۂ اعراف میں یہ مفہوم نمایاں ہو کر سامنے آگیا ہے۔ حضرت شعیبؑ کی دعوت اور ان کی قوم کی طرف سے تکذیب کے تذکرہ کے ضمن میں فرمایا کہ حضرت شعیبؑ نے ان سے کہا کہ

وَ اِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَ طَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ وَ هُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ○ (۷/۸۷)۔

"اور اگر ایسا ہوا کہ تم سے ایک گروہ اس تعلیم پر ایمان لے آیا جس کی تبلیغ کے لئے میں بھیجا گیا ہوں اور دوسرا گروہ وہ ہے جسے اس پر یقین نہیں، تو ذرا انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کردے اور وہ فیصلہ کرنے والا ہے۔"

یہاں فیصلہ کرنے والے کے لئے حَاکِمْ کا لفظ آیا ہے۔ اس سے دو آیات کے بعد حضرت شعیبؑ کی زبان سے یہ دُعا بیان فرمائی۔

رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَ اَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ○ (۷/۸۹)

"اے ہمارے پروردگار! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان سچائی کے ساتھ فیصلہ کردے اور تو بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔"

یہاں "فیصلہ کرنے والے" کے لئے فاتح کا لفظ آیا ہے، یعنی حق و باطل میں تمیز کر دینے والا۔ خود نبی اکرمؐ کے متعلق ہے۔

قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ۭ وَ هُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ○ (۳۴/۲۶)۔

"(اے رسولؐ ان مخالفت کرنے والوں سے کہہ دو کہ) ہمارا پروردگار ہمیں ایک جگہ اکٹھا کریگا اور پھر حق کے ساتھ ہمارا فیصلہ کردے گا۔ وہ سب سے بڑا فیصلہ کرنے والا، ہر شے کا جاننے والا ہے۔"

یہ دونوں جماعتیں ایک جگہ اکٹھی ہوئیں اور اس کے بعد ان میں ایسا کھلا کھلا فیصلہ ہوا کہ بدر و حنین کا ایک

ایک ذرّہ اس پر شاہد ہے۔ ایسا فیصلہ کہ اس کے بعد التباسِ حق و باطل کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔ دونوں نکھر کر الگ الگ ہو گئے اور قیامت تک کے لئے ایسا معیار قائم کر گئے کہ حق و باطل کی تمیز میں کسی کو شبہ ہی نہ رہے۔ قرآن کی لغت میں فاتح کے یہی معنی ہیں۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جب کسی مردِ مومن کے لئے فاتح و منصور کے الفاظ استعمال ہوں گے تو ان الفاظ کا صحیح مفہوم کیا ہوگا، یعنی قوانینِ خداوندی کے مطابق حق و باطل میں تمیز کرنے والا۔ ایک دنیاوی فاتح اور قرآنی فاتح میں یہی نازک لیکن اہم ترین فرق ہے جسے نظر انداز کر دینے سے سطح بین نگاہیں عُمرِ فاروقؓ اور ہلاکو خاں میں تمیز نہیں کر سکتیں، حالانکہ ایک کے سامنے محض ذاتی غلبہ و استیلاء تھا اور دوسرے کے پیشِ نظر، اللہ کی صفتِ فتّاحیت کے مظہر ہونے کی حیثیت سے حق و باطل میں امتیاز، وہ امتیاز جو حق اور علم کی رُو سے کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اللہ ایسا فتّاح ہے جو حق ہے اور علیم۔ انسانی نظامِ زندگی میں اللہ کے یہ فیصلے قرآنِ کریم کے مطابق ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ قرآن قولِ فیصل ہے۔

اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۙ وَّ مَا هُوَ بِالْهَزْلِ ؕ (۸۶/۱۳-۱۴)۔

"یقیناً قرآن ایک فیصل کن (حقیقت ہے)۔ لوہنی لاحاصل (اور بے معنی) شے نہیں۔"

یعنی خود حقیقتِ ثابتہ اور حق و باطل میں صاف صاف فیصلہ کر دینے والا۔ اس لئے عدالتِ خداوندی کا ضابطہ، قوانین یہی کتاب ہے اور اللہ کی حاکمیت اور فتّاحیت کا مظاہرہ اسی ضابطہ کی تنفیذ ترویج سے ہوگا۔

جب قرآنِ کریم جماعتِ مؤمنین کے متعلق کہتا ہے کہ فتح حاصل ہو گئی تو اس سے اتنا ہی مقصود نہیں ہوتا کہ ان کے دشمنوں کو شکست ہو گئی اور وہ ان پر غالب آ گئے۔ اس سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ اس سے وہ موانع دُور ہو گئے جو اُن کے آگے بڑھنے کے راستے میں حائل تھے اور اس طرح ان کے سامنے زندگی کی کشادگی کے "مزید" دروازے کُھل گئے۔ لہٰذا، جماعتِ مومنین کی ہر فتح 'مزید کشاد کے لئے ایک نئے باب' کا افتتاح ہوتا ہے اور یہ سلسلہ لامتناہی ہوتا ہے۔

۲۶- اَلْحَقُّ

اللہ حق ہے۔ اس کے علاوہ جس کو بھی کوئی پکارے وہ باطل ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ۝ (۲۲/۶۲ نیز ۳۱/۳۰)

"یہ اس لئے کہ حق اللہ ہی کی ہستی ہے اور جن ہستیوں کو لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں باطل ہیں اور یہ کہ اللہ ہی ہستیِ بلند مرتبہ ہے، بڑائی والی"۔

حق اسے کہتے ہیں جو ثابت ہو، اٹل ہو، انمٹ ہو، اپنی جگہ پر قائم ہو، حقیقت کے ہر معیار پر پورا اُترے علم و بصیرت کی ہر کسوٹی پر کھرا ثابت ہو اور اس کے نتائج ہمیشہ تعمیری ہوں، جو حالات کے ہر تعمیری تقاضے کو پورا کرے۔ اس کے برعکس باطل وہ جو مٹ جانے والا ہو، جو باقی نہ رہ سکے، جو محض ظن و تخمین اور قیاس اور گمان میں موجود ہو۔ فی الحقیقت اس کا وجود کوئی نہ ہو، جو تخریبی نتائج پیدا کرے۔ حق صرف اللہ کی ذات ہے۔ باطل کی قوتیں اس وقت تک قوتیں دکھائی دیتی ہیں جب تک حق سامنے نہیں آتا جب حق آجائے، تو باطل فنا ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم کی ساری دعوت کی بنیاد اسی اصلِ عظیم پر ہے کہ حق صرف اللہ کی ذات ہے غیر اللہ باطل ہے۔ بظاہر یہ چھوٹی سی بات دکھائی دیتی ہے لیکن جوں جوں اس پر غور کرتے جائیے بڑی بڑی عظیم الشان حقیقتیں بے نقاب ہوتی جائیں گی۔ سب سے پہلے یہ کہ اللہ کی ذات ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ یہ نہیں کہ پرستاروں کے ذوقِ عبودیت نے اپنے ذہن سے ایک معبود تراش لیا ہو۔ ؏

ذوقِ بندگی پروردگارے کردہ ام پیدا

اللہ کی ذات اُس وقت بھی معبود تھی جب کوئی پیشانی ذوقِ سجود سے لذت آشنا نہ تھی اور اُس وقت بھی معبود ہو گی جب عبودیت اور بندگی کا کوئی مظہر باقی نہ ہوگا۔ اس لئے کہ وہ حق ہے اور کھلا ہوا حق۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی خود اپنی آنکھیں بند کر لے، لیکن اس سے حق کے حق ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ آج آنکھیں بند کی جا سکتی ہیں، لیکن ظہورِ نتائج کے وقت اس کا امکان نہیں ہوگا۔

يَوْمَئِذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ وَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ۝ (۲۴/۲۵)

"جس دن اللہ ان کی پوری پوری جزا انہیں دے دے گا اور وہ جان لیں گے کہ بے شک اللہ کھلا ہوا حق ہے"۔

لیکن اس وقت اس حقیقت کی آگہی سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ باطل سے مُنہ موڑ کر حق کی طرف آنے کا تو یہی وقت ہے۔

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ○ (۱۰/۳۲)

"یہی اللہ فی الحقیقت تمہارا پروردگار ہے۔ پھر بتاؤ۔ حق معلوم ہونے کے بعد اسے نہ ماننا گمراہی نہیں تو اور کیا ہے؟ (حیرت ہے کہ تم حق سے) منہ پھیرے کدھر جارہے ہو؟"

اللہ کو حق ماننے کے معنی یہ ہیں کہ اس حقیقتِ باہرہ پر ایمان لایا جائے کہ حکومت و بادشاہت اسی کے لئے ہے۔ اس کے سوا کسی کی اطاعت و محکومیت جائز نہیں۔ تمام بڑائیوں اور عظمتوں کا مالک وہی ہے۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ○ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ○

(۱۱۶ — ۲۳/۱۱۷) (۲۰/۱۱۴)۔

"اللہ کہ پادشاہِ حقیقی وہی ہے، بڑا عالی مرتبت ہے۔ اس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں۔ وہ جہانداری کے تخت کا مالک ہے۔ جو کوئی اس کے ساتھ کسی اور اِلٰہ کو بھی پکارتا ہے، تو اس کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں۔ اس کے رب کے ہاں اس کا حساب ہوگا۔ یقیناً (اس کی پادشاہت سے) انکار کرنے والے کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔"

اللہ کے حق ہونے پر ایمان لانے سے مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ اس کی طرف سے ہے اسے حق سمجھا جائے۔ وہ خود حق ہے اس لئے اس نے کائنات کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ وَيَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ ؕ قَوْلُهُ الْحَقُّ ؕ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ؕ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ

الْخَبِیْرُ ۝ (۶/۷۳-۷۴)

"اسی کی ذات ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے (اس کی قدرت کا یہ عالم ہے کہ) جس وقت وہ کہہ دے ہوجا (تو جیسا وہ چاہے) ویسا ہی ہوجائے۔ اس کا قول حق ہے۔ اسی کے لئے بادشاہی ہے جس دن صُور پھونکا جائے گا۔ وہ غیب وشہادت کا جاننے والا ہے، حکمت والا ہے، ہر شے سے باخبر۔"

کائنات حق کے ساتھ پیدا کی اور انسانی دنیا کی رہنمائی کے لئے قرآن کو حق کے ساتھ نازل کیا۔ اَنَّہُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّھِمْ (۴۷/۲)۔ لہٰذا، آج حق قرآن کے اندر ہے، یعنی کائنات میں اشیائے فطرت حق کی مظہر اور قرآن کریم کے قوانین انسانی دنیا میں حق کے پیکر۔ یہی نظام وہ دین الحق ہے جو انسانوں کے وضع کردہ تمام نظاموں پر غالب آنے والا ہے۔

ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ ۙ وَ لَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ ۝ (۹/۳۳ نیز ۶۱/۹)۔

"اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت یعنی دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس دین کو (تمام انسانی) نظامہائے زندگی پر غالب کردے، اگرچہ مشرکوں کو ایسا ہونا پسند نہ آئے (کیونکہ وہ انسانوں کے وضع کردہ قوانینِ حیات کے تابع رہنا پسند کرتے ہیں)۔"

اَللہ حق، کائناتِ فطرت حق کے ساتھ پیدا کردہ، اس کا رسول حق کے ساتھ ارسال فرمودہ۔ اس کا لایا ہوا دین، حق اور جماعت وارثینِ کتاب، حق کی علمبردار۔ اس کے علاوہ اور سب باطل۔ حق باقی رہنے والا، باطل مٹ جانے والا۔ باقی وہی رہے گا جس کی نسبت حق کے ساتھ ہے۔ یہی ایک حقیقت ہے، باقی افسانہ طرازیاں۔

قرآنِ کریم نے یہ کہہ کر کہ کائنات کو بالحقّ پیدا کیا گیا ہے، ذہنِ انسانی کی ایک بہت بڑی غلط نگہی کا پردہ چاک کیا ہے۔ افلاطون نے یہ تصور پیش کیا کہ یہ محسوس کائنات اپنا وجود نہیں رکھتی۔ اشیاء اپنے حقیقی وجود کے ساتھ "عالمِ امثال" میں ہیں اور کائنات میں جو کچھ نظر آتا ہے، ان اشیاء کا سایہ ہے۔ یہ (باطل) تصور، آگے چل کر ہندوؤں کے ہاں یوگ، اور ایرانیوں اور مسلمانوں کے ہاں تصوف کی بنیاد بنا۔ ہندوؤں نے کہا کہ دنیا سب مایا (فریب) ہے۔ ایرانی آتشکدوں سے (غالب کے الفاظ میں)

آواز بلند ہوئی کہ

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

ہمارے ہاں کے تصوف نے وحدت الوجود کا تصور پیش کر دیا جس کی رُو سے کہا گیا کہ وجود صرف ذاتِ خداوندی کا ہے۔ اس کے علاوہ کسی شے کا کوئی وجود نہیں۔

قرآنِ کریم نے یہ کہہ کر کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے، ان تمام باطل نظریات واعتقادات کو جڑ سے کاٹ دیا۔ کائنات اپنا وجود رکھتی ہے اور اسے قوانینِ خداوندی کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے تاکہ انسان اس سے نفع یاب ہو۔ (تسخیرِ کائنات سے یہی مراد ہے)۔

۲۷- حَمِیۡدٌ مَّجِیۡدٌ

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کی جس قدر صفات بیان ہوئی ہیں، انہیں سامنے رکھئے اور پھر دیکھئے کہ خوبی و کمال کی وہ کونسی صفت ہے جس سے اس کی ذات متصف اور نقص و زوال کی وہ کونسی شق ہے جس سے اس کی ہستی مبرا نہ ہو۔ حسن و جمال کی تمام زیبائشوں سے مزین اور شانِ کبریائی کی تمام ستائشوں کی سزاوار لَهُ الْأَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ط (۵۹/۲۴)۔ ہر قسم کی تعریف و توصیف اور ہر انداز کی ستائش و نیائش اسی کے لئے ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم کی ابتدا ہی اس انتہا سے ہوتی ہے کہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۱/۱ نیز ۴۵/۳۶)

"تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جو جملہ کائنات کا رب ہے۔"

لیکن عربی زبان میں حمد کا لفظ ایک بنیادی اور عظیم خصوصیت رکھتا ہے۔ آپ کسی ملک میں سیر کے لئے جا رہے ہوں۔ کسی مقام پر آپ کے سامنے اچانک ایک ایسا منظر آجائے جو نہایت دل کش اور جاذبِ توجہ ہو۔ اسے دیکھ کر آپ کی زبان سے بے اختیار "واہ واہ" نکل جائے۔ اسے حمد سے تعبیر کیا جائے گا، یعنی یہ اس منظر کے صانع کی حمد ہوگی۔ لہٰذا، جب خدا کے متعلق کہا جائے گا کہ اس کے لئے حمد ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کائنات کا ہر حسین گوشہ، خدا کے تخلیقی پروگرام کی

منہ بولتی تصویر ہے جسے دیکھ کر بلا اختیار دل سے تعریف و توصیف کے جذبات اُبھر آتے ہیں۔ غور کیجئے کہ قرآن نے اس حقیقت کو کس کس انداز سے بیان کیا ہے۔ کہا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ..... (۳۵/۱ نیز ۶/۱)۔ تمام تعریف اس ذات کے لئے جو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو عدم سے وجود میں لایا۔ سورۃ المومن میں ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚۖ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ هُوَ الْحَیُّ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (۴۰/۶۴-۶۵ نیز ۲۵/۳۱)۔

"اللہ کی ذات وہ ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو مستقر اور آسمان کو (بمنزلہ) چھت کے بنایا اور تمہاری بہترین صورت میں صورت گری کی اور تمہیں طیب چیزوں میں سے رزق دیا۔ یہ ہے اللہ تمہارا رب۔ کس قدر بابرکت ہے اللہ، رب العالمین کی ذات۔ وہ جو زندہ ہے (اور زندگی میں کسی کا محتاج نہیں)۔ اس کے سوا کوئی اور اِلٰـہ نہیں۔ سو خالصۃً اسی کے قوانین کی اطاعت کے لئے اسے پکارو۔ تمام حمد و توصیف اسی خدا کے لئے ہے جو رب العالمین ہے"۔

وہ ہر شے کا خالق ہے اور تخلیق کے بعد، اپنے اٹل قوانین کے ماتحت مدارجِ ارتقا کے لئے ان اشیاء کا انتخاب کرتا ہے اور اس نظام کو بطریقِ احسن چلا رہا ہے۔ سو اوّل و آخر حمد اسی کے لئے ہے۔

وَ رَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَ يَخْتَارُ ؕ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ وَ رَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ ۝ وَ هُوَ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰى وَ الْاٰخِرَةِ ؗ وَ لَهُ الْحُكْمُ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (۲۸/۶۸-۷۰ نیز ۳۴/۱ و ۳۰/۱۸)۔

"اور تیرا رب (اپنے قانونِ مشیت کے مطابق) جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے،

(ارتقائی مدارج کے لئے) منتخب کر لیتا ہے۔ یہ انتخاب اوروں کے اختیار میں نہیں ہے۔ وہ انسانوں کے شرک سے منزہ ہے اور تیرا رب جانتا ہے جو کچھ یہ دلوں میں چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں اور اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں۔ اوّل و آخر حمد اسی کے لئے ہے اور حکومت بھی اسی کی ہے اور تمہارا ہر قدم اسی کی طرف اُٹھ رہا ہے۔"

خالقیت، رزّاقیت، ربوبیت خالق بھی وہی ہے اور رازق بھی۔ اس لئے تعریف و توصیف اس کے سوا اور کس کے لئے زیبا ہو سکتی ہے؟

اَللّٰہُ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖ وَ یَقۡدِرُ لَہٗ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ۝ وَ لَئِنۡ سَاَلۡتَہُمۡ مَّنۡ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحۡیَا بِہِ الۡاَرۡضَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِہَا لَیَقُوۡلُنَّ اللّٰہُ ؕ قُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ ؕ بَلۡ اَکۡثَرُہُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ ۝ (۲۹/۶۳-۶۲)

اللہ وہ ہے کہ اپنے بندوں میں سے جس کے لئے (اپنے قانونِ مشیت کے مطابق) چاہتا ہے رزق کی کشادگی کر دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے نپی تُلی روزی دیتا ہے۔ یقیناً اللہ ہر شے کا علم رکھتا ہے اور اگر تم ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو آسمان سے مینہ برساتا ہے جس سے زمینِ مُردہ کو زندگی ملتی ہے؟ تو یہ یقیناً کہیں گے کہ وہ اللہ ہے۔ کہو کہ (جب وہ ایسا ہے تو) سب تعریف اسی کے لئے ہے۔ لیکن اکثر اس (حقیقت) کو نہیں سمجھتے ہیں۔"

خالق و رازق اور تمام نعمتوں کا عطا کرنے والا، ایسے حالات میں عطا کرنے والا جب ظاہری اسباب و علل کے ماتحت انسان پر مایوسی چھا چکی ہو۔۔

وَ ہُوَ الَّذِیۡ یُنَزِّلُ الۡغَیۡثَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا قَنَطُوۡا وَ یَنۡشُرُ رَحۡمَتَہٗ ؕ وَ ہُوَ الۡوَلِیُّ الۡحَمِیۡدُ ۝ (۴۲/۲۸)۔

"اللہ وہی ہے جو مایوسی کے بعد (اپنے ابرِ کرم سے) گہر باری کرتا ہے اور یوں اپنے (سحابِ) رحمت کو پھیلا دیتا ہے۔ وہ سب کا آقا اور حمد و ثنا کا سزاوار۔"

اس کی ربوبیت صرف مادی ضروریات تک ہی ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لئے رشد و

ہدایت بھی اسی کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ اس لئے اگر طبعی ضروریات سے متعلق اس کی نوازشاتِ کریمانہ اس کی حمد و ستائش کی موجب ہیں تو عالمِ رشد و ہدایت میں اس کا ترحّمِ خسروانہ اس سے بھی بڑھ کر توصیف و ستائش کا مستحق ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَ لَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ؕ (۱۸/۱)

"تمام تعریفیں اس خدا کے لئے ہیں جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل فرمائی جو ہر طرح کے پیچ و خم سے پاک ہے۔"

وہ کتابِ عظیم جس کے متعلق فرمایا کہ "باطل اس کے سامنے اور پیچھے کہیں سے بھی نہیں آسکتا" اور جو تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝ (۴۱/۴۲) "اس خدا کی طرف سے نازل شدہ ہے جو صاحبِ حکمت اور حمد و ستائش کا مستحق ہے۔ حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو جب "علم" عطا ہوا تو انہوں نے خدا کی حمد و ثنا میں سجدۂ شکر ادا کیا۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَ قَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰي كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (۲۷/۱۵)۔

"اور ہم نے یقیناً داؤد و سلیمان کو علم عطا کیا اور انہوں نے کہا کہ تمام تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں اپنے بندوں میں سے اکثر پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔"

نبی اکرمؐ نے بھی اسلام اور قرآن کی بخشائشِ عظیم کی سپاس گذاری میں یہی فرمایا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ (۲۷/۹۳) "ہر قسم کی ستائش و نیائش اللہ کے لئے ہے۔" مومنین کی صفات میں فرمایا کہ وہ حَامِدُوْنَ (اللہ کی سب حمد و ستائش کرنے والے ہیں۔ (۹/۱۱۲)۔

قانونِ مکافات، موجبِ حمد و توصیف

اللہ کی طرف سے ضابطۂ قوانین (رشد و ہدایت) اس لئے ملتا ہے کہ لوگوں کو قانونِ مکافاتِ عمل سے آگاہ کردیا جائے۔ انہیں بتا دیا جائے کہ قوانینِ خداوندی کے اتباع کا لازمی نتیجہ سعادت و فیروزمندی ہے اور ان کی معصیت کا فطری نتیجہ ہلاکت و بربادی۔ جب کسی قوم پر اس کی سرکشی و عدوان کی وجہ سے تباہی و بربادی کا عذاب نازل ہو، تو ہرچند، نظر بظاہر یہ صرف عبرت و موعظت کا مقام ہوگا، لیکن حقیقت میں

نگاہوں کے لئے یہ خدا کی حمد و ستائش کا مرقع ہوگا۔ اس لئے کہ اگر اس کا قانونِ مکافات اس ربط و ضبط کے ساتھ نافذ العمل نہ ہو تو کائنات کا شیرازہ بکھر جائے۔ دنیا میں اعتدال و توازن اسی قانون کی رو سے قائم ہے۔ یہی وہ مواقع ہیں جن کے ضمن میں کہا۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ...... فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (۴۲-۴۵/۶)

" اور (اے رسول) تجھ سے پیشتر ہم نے ان قوموں کی طرف جو پہلے گذر چکی ہیں (اپنے رسول) بھیجے اور انہیں (ان کے اعمال کے بدلے) سختی اور محنت میں گرفتار کیا کہ شاید وہ (اتنے سے مواخذہ سے عبرت پکڑلیں اور) اللہ کے (قوانین) کے سامنے جھک جائیں۔ پھر (دیکھو) ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب ہماری طرف سے اُن پر سختی آئی تو وہ گڑگڑاتے؟ اس لئے کہ ان کے دل سخت پڑ گئے تھے اور شیطان ان کے اعمال کو ان کی نگاہوں میں خوشنما بنا کر دکھاتا تھا۔ پھر جب ایسا ہوا کہ جو کچھ نصیحت انہیں کی گئی تھی اسے انہوں نے بھلا دیا، تو ہم نے بظاہر) ان پر ہر طرح (کی خوشحالیوں) کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ وہ جب ان (کامرانیوں پر خوشیاں منانے لگے جو انہیں بظاہر حاصل ہوئی تھیں تو اچانک (مکافات کے قانون کا وقت آگیا اور) ہم نے انہیں پکڑ لیا۔ پس ناگہاں وہ نا اُمید ہو کر رہ گئے۔ تو (دیکھو) اس طرح اس گروہ کی، جو ظلم کرنے والا تھا جڑ کاٹ دی گئی اور تمام ستائش اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام کائنات کا پروردگار ہے"۔

جب قوم لوطؑ اپنے اعمال کی بدولت عذابِ خداوندی میں گرفتار ہوئی اور حضرت لوطؑ اور ان کے ساتھی اس عذاب سے محفوظ رہے تو اس واقعہ کے تذکرہ کے بعد فرمایا۔

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ سَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ؕ آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ (۲۷/۵۹)

" کہو کہ تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں اور اپنے بندوں میں سے جنہیں اس نے منتخب کیا ہے ان پر سلامتی۔ (کہو کہ) اللہ بہتر ہے یا وہ جنہیں یہ لوگ اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں"۔

اسی طرح جب قوم نوحؑ سیلاب کے مصائب میں گرفتار ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کو ظالم و سرکش قوم کے استبداد سے نجات دلائی، تو اس مقام پر فرمایا۔

فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَ مَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ نَجّٰنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○ (۲۳/۲۸)۔

"اور جب تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ کشتی میں سوار ہو جائے تو اس وقت کہو کہ سب ستائش خدا کے لئے ہے جس نے ہمیں قوم ظالم سے نجات دی ہے۔"

یہ تو مختلف واقعات کا جزئی تذکرہ تھا۔ سورۃ الصّٰفّٰت میں اسی اصول کو ایک کلیہ کی حیثیت سے بیان کیا کہ حق و باطل کے معرکوں میں ہمارے رسول اور جیوش ہمیشہ منصور و غالب رہتے ہیں اور باطل کی قوتیں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ اس اصول کی تبیین کے بعد کہا۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۚ وَ سَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۚ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۚ (۱۸۰—۱۸۲/۳۷)۔

"تیرا رب، ربُّ العزت ان تمام باتوں سے منزّہ ہے جو لوگ اس کی نسبت (اپنی طرف سے) بیان کرتے ہیں اور (اس کے) مرسلین پر سلامتی ہے اور تمام ستائشیں اللہ رب العالمین کے لئے ہیں۔"

مقامِ محمود

یہی وہ راہ تھی جس پر گامزن ہو کر نبی اکرمؐ مقامِ محمود پر سرفراز ہوئے۔

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ○ (۷۹/۱۷)۔

"اور (اے رسول) رات کا کچھ حصہ شب بیداری میں بسر کر یہ تیرے لئے ایک مزید عمل ہے۔ قریب ہے کہ اللہ تجھے ایک ایسے مقام میں پہنچا دے جو حمد و ستائش کا مقام ہے۔"

خدائے حمید کی صراطِ حمید پر چل کر مقامِ محمود تک پہنچنا یقینی ہے۔ یہی شرفِ انسانیت کی تکمیل ہے یہی زندگی کی معراج ہے۔ یہی منتہائے مقصود ہے اور درخورِ حمد و ستائش ہیں وہ سعادت مند جو اس مقام پر سرفراز ہوں۔ یہی وہ افراد ہیں جن کی نشو و نما یافتہ ذات، صفاتِ خداوندی کی مظہر ہوتی ہے فلہٰذا، درخورِ حمد و ستائش، یعنی جب دنیا ان کے وہ کارنامے دیکھتی ہے جو نوعِ انسانی کی ربوبیت اور شادکامی کے ضامن بنتے ہیں، تو لوگوں کی زبان پر بے اختیار نغماتِ تبریک و تہنیت زمزمہ بار ہو جاتے ہیں۔

۲۸۔ تسبیح

مفہوم کائنات کی ہر شے اُس قانون کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہے جس کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے وہ پیدا کی گئی ہے۔

وَ لَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا..... (۳/۸۲)

"زمین و آسمان میں جو کوئی بھی (موجود) ہے۔ اللہ (کے حکم) کے سامنے طوعاً و کرہاً سرِ تسلیم خم کئے ہے"۔

اشیائے فطرت میں سے جو کام جس کے سپرد کیا گیا ہے، وہ اس کی تکمیل میں سرگرمِ عمل ہے اور یوں اللہ کے احکام کے سامنے سجدہ ریز ہے۔

وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا......

(۱۳/۱۵ نیز ۲۲/۱۸)

"زمین و آسمان میں جو کوئی بھی ہے اللہ (کے احکام و قوانین) کے آگے سجدہ میں گرا ہوا ہے۔

اس تسلیم و سجود کی تشریح سورۂ نحل میں یوں بیان کی گئی ہے۔

وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ (۴۹—۱۶/۵۰)۔

"اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اور زمین میں جس قدر جاندار ہیں، سب اللہ کے آگے سر بسجود ہیں۔ نیز ملائکہ کہ وہ سرکشی نہیں کرتے اور اپنے پروردگار سے ڈرتے رہتے ہیں جو ان کے اُوپر موجود ہے اور انہیں جو کچھ حکم دیا جاتا ہے، اس کی تعمیل کرتے ہیں"۔

يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ پر غور کیجئے۔ یہی ان چیزوں کا سجدہ ہے۔ یہی ان کی تسلیم (اَسْلَمَ) ہے، یعنی وہ جس کام کے لئے مامور ہیں، اس کی تکمیل میں منہمک ہیں۔ کوئی شے اس میں ذرا غفلت نہیں برتتی۔ اپنے مقررہ راستے سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہٹتی۔ اسی پر نظامِ کائنات کا دارومدار ہے۔

آیاتِ مندرجہ صدر میں اَسْلَمَ اور یَسْجُدُ کے الفاظ آئے ہیں۔ اسی مفہوم کے لئے بعض آیات میں سَبَّحَ یُسَبِّحُ (تسبیح) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا ○ (۱۷/۴۴)۔

"متعدد اجرامِ فلکی اور زمین اور جو کوئی ان میں ہے، سب اس کی تسبیح کر رہے ہیں۔ یہاں کوئی شے نہیں جو اس کی حمد و ثنا میں زمزمہ سنج نہ ہو۔ مگر تم ان کی حمد و توصیف کے زمزموں کو سمجھتے نہیں۔

بلاشبہ وہ حلیم و غفور ہے"۔

سَبْحٌ" کے معنی ہیں تیرنا، گھوڑے کا تیزی سے دوڑنا، یعنی جس طرح تیرنے میں بازوؤں کو ان کی وسعت تک پھیلایا جاتا ہے، اسی طرح جب گھوڑا پورے قدم پھیلا کر سرپٹ دوڑے تو اسے "سَبْحٌ" کہا جاتا ہے۔ اس لئے اس لفظ میں تیزی اور دُوری (دُور دُور ہاتھ پاؤں مارنے) دونوں کا مفہوم مضمر ہے۔ چنانچہ سَبَّحَ فِی الْاَرْضِ کے معنی ہیں "دُور دراز ملکوں میں سفر کرنا"۔ اِنَّ لَكَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا ○ (۷۳/۷) "تیرے لئے (اے رسول) دن میں (کاروبار اور معاملات) کی لمبی چوڑی مصروفیتیں ہیں"۔ لہٰذا جب یہ کہا جائے کہ کائنات کی ہر شے اللہ کے لئے "تسبیح خواں" ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ان فرائض کی سرانجام دہی میں جو اسے تفویض کئے گئے ہیں، پوری تیزی کے ساتھ مصروفِ عمل ہے۔

تسبیح اور حمد

اب ایک اور چیز پر بھی غور کیجئے۔ آپ کے سامنے ایک مشین ہے جس کا ہر پُرزہ اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک نصب (فِٹ) ہے۔ پوری کی پوری مشین نہایت عمدگی سے چل رہی ہے۔ کہیں کوئی نقص نہیں، کوئی چوک نہیں، محکم، مضبوط، پائیدار، اپنی جگہ پر قائم، جس غرض کے لئے بنائی گئی ہے اس کے مطابق زندہ نتائج سامنے چلے آرہے ہیں۔ اس مشین کو دیکھتے ہی

---

[1] فلکی کُرّوں کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ (۲۱/۳۳، ۳۶/۴۰) "ہر کُرّہ اپنے اپنے دائرہ میں تیزی سے تیرتا پھر رہا ہے"۔ فلکی کرّوں کی گردش کے لئے فضا میں تیرنے کا لفظ کس قدر جامع اور بلیغ ہے۔

آپ اس کے بنانے والے (صنّاع) کی حمد و ستائش میں رطب اللسان ہو جائیں گے۔ آپ کی زبان پر بے اختیار اس کی تعریف کے کلمات آجائیں گے۔ یہ مشین اپنے صانع کی مجسّم حمد ہوگی۔ ہر عمدہ تصویر اپنے مصوّر کی نادرہ کاری اور معجز نگاری کا مُنہ بولتا قصیدۂ مدحیہ ہوتی ہے۔ ہر حسین مجسمہ سنگ تراش کے کمالِ فن کی زندہ دلیل ہوتا ہے۔ جب ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کی یہ کیفیت ہے تو غور کیجئے کہ کائنات کا یہ عظیم المرتبت اور محیّر العقول کارخانہ جس نظم و ضبط اور حُسن و خوبی سے سرگرمِ عمل ہے، کیا یہ اپنے فقید المثال صنّاع کی زندہ حمد و ثنا نہیں؟ یہاں کا ذرّہ ذرّہ کمالِ رعنائی و زیبائی کی چلتی پھرتی تصویر ہے۔ کیا یہ تصویریں اور ان کی جاذبِ نگاہ رنگینیاں اس "مصوّر" کی شانِ جمالی کے قصائدِ مدحیہ نہیں ہیں؟ لہٰذا، ہر وہ شے جو اپنے فریضۂ مفوّضہ کی تکمیل میں سرگرداں ہے، چشمِ بینا کے لئے 'اپنے خالق' ربّ العزّت کی حمد و ستائش کا زندہ پیکر ہے۔ اس کی سرگرمیٔ عمل، خدا کی تحمید و تقدیس کا زمزمۂ قدس اور اس کی ہر حرکت اس کی تعریف و توصیف کا نغمۂ سرمدی ہے۔ ان تصریحات کو سامنے رکھئے اور اس کے بعد ان آیات پر غور کیجئے جن میں خدا کی تسبیح و تحمید کا تذکرہ ہے۔ مفہوم بے نقاب ہو کر سامنے آجائے گا۔

مظاہرِ فطرت کی تسبیح

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ۭ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسْبِيْحَهٗ ۭ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ○ (۲۴/۴۱)

"کیا تم نہیں دیکھتے کہ زمین و آسمان میں جو کوئی بھی ہے اور پر پھیلائے ہوئے پرندے سب اللہ کے لئے تسبیح خواں ہیں۔ وہ سب اپنی اپنی صلوٰۃ و تسبیح (کے طریقوں) کو جانتے ہیں اور اللہ ان سب کے اعمال کو (بھی) جانتا ہے۔"

حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ جنہیں ملکِ عظیم اور علم و حکمت کا بہرۂ وافر عطا ہوا تھا، خدا کی تسبیح میں نغمہ ریز رہا کرتے تھے اور ان کے ساتھ دیگر اشیائے فطرت بھی۔

وَ سَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَ الطَّيْرَ ۭ وَ كُنَّا فٰعِلِيْنَ○

(۲۱/۷۹؛ ۳۴/۱۰؛ ۳۸/۱۸)

"اور ہم نے پہاڑوں کو داؤد کے لئے مسخر کر دیا تھا اور وہ (اللہ) کی تسبیح کیا کرتے تھے اور

اسی طرح پرندوں کو بھی اور ہم (ایسا ہی) کرنے والے تھے"۔

بادل کی گرج، جو دلوں میں خوف وہراس پیدا کردیتی ہے، درحقیقت اپنے فریضہ کی تکمیل اور احکام کی تعمیل میں صدائے لبیک، اللہ کے جلال وکبریائی کا اعلان اور سحابِ کرم کی پیشوائی کا طبل و دمدمہ ہوتی ہے۔

وَ يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ (۱۳/۱۳)

"اور بادلوں کی گرج اس کی حمد میں تسبیح کرتی ہے اور ملائکہ بھی اس کے خوف سے سرگرمِ ستائش رہتے ہیں"۔

مظاہرِ فطرت کی اجمالی "تسبیح خوانی" کا ذکر کئی ایک مقامات پر فرمایا۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۵۷/۱؛ ۵۹/۱؛ ۶۱/۱؛ ۶۲/۱)

"پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اللہ کی تسبیح کرتا ہے"۔

ملائکہ کے متعلق شروع میں بیان کیا جاچکا ہے کہ وہ احکامِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے رہتے ہیں اور "وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے"۔ یہی ان کی تسبیح و تقدیس ہے۔ قصۂ آدم میں ملائکہ نے یہی کہا تھا کہ

وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ (۲/۳۰)۔

"اور ہم تیری حمد و ثنا میں تسبیح و تقدیس کرتے ہیں"۔

دوسرے مقام پر ہے۔

وَ مَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَ لَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ۚ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ○ (۲۱/۱۹-۲۰ نیز ۷/۲۰۶؛ ۴۱/۳۸؛ ۴۲/۵)۔

"اور جو اس کے حضور ہیں، وہ کبھی تکبر میں آکر اس کی عبودیت سے سرتابی نہیں کرتے۔ نہ (تعمیلِ احکام سے) تھکتے ہیں۔ وہ دن رات اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور کبھی تھکتے نہیں"۔

اس سے بھی ملائکہ ہی مراد لئے جاسکتے ہیں۔ ان کی فطرت میں اطاعت مضمر ہے۔ اس لئے وہ مسلسل اطاعت کوش رہتے ہیں۔ نہ اس سے تھکتے ہیں کہ یہ ان کی فطرت کا خاصہ ہے۔ ؎

دریا کی ساری عمر روانی میں کٹ گئی

اِنسانوں کی تسبیح | یہ تو تھی اشیائے فطرت اور مدبرینِ امورِ الٰہیہ کی تحمید و تسبیح۔ اب انسانوں کی تسبیح و تقدیس دیکھئے۔ نظامِ فطرت (اور ملائکہ کی) تو کیفیت یہ ہے کہ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ٥ (۱۶/۵۰) جس کام کا انہیں حکم دیا گیا ہے اس کے سرانجام دہی میں منہمک ہیں۔ اپنے فرائض کی تکمیل میں سرگرمِ عمل ہیں۔ وہ قوانینِ خداوندی سے کبھی سرکشی و سرتابی اختیار نہیں کر سکتے۔ انہیں معصیت اور عدوان پر قدرت ہی نہیں۔ انہیں نافرمانی پر اختیار ہی نہیں۔ لیکن اس کے برعکس انسان کو معصیت پر بھی اختیار ہے۔ یہ قوانینِ الٰہیہ سے سرکشی بھی کر سکتا ہے، ان سے اعراض بھی برت سکتا ہے۔ اس لئے جس طرح فطرت کی ہر شے ہر وقت "تسبیح خواں" (سرگرمِ اطاعت) رہتی ہے اس طرح ہر انسان ہر وقت مصروفِ تحمید تسبیح نہیں کہلا سکتا۔ وہ صرف اُس وقت زمزمہ حمد و ستائش میں نغمہ ریز (تسبیح خواں) ہوگا، جب وہ ان احکام کی تعمیل کر رہا ہوگا جو اس کے لئے بطور ضابطۂ حیات متعین کئے گئے ہیں۔ وہ جس قدر ان احکام کی اطاعت میں منہمک ہوگا اسی قدر وہ خدا کی حمد و تسبیح میں مصروف سمجھا جائے گا۔ حضرات انبیاء کرامؑ کی پوری زندگی قوانینِ خداوندی کی اطاعت میں گذرتی تھی، اس لئے ان کا ہر سانس تسبیح و تحمید کا مقدس نغمہ ہوتا تھا وہ مسلسل پیہم اللہ کی "تسبیح" میں مصروف ہوتے تھے۔ ان کی دعوت کے اوّلین مراحل میں ہجومِ مصائب وازدحامِ مخالفت انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتے تھے۔ حالات کی نامساعدت بظاہر بڑی حوصلہ شکن ہوتی تھی لیکن ان مشکلات و موانع میں انہیں ارشاد ہوتا تھا کہ حالات کی ناسازگاری سے مت گھبراؤ۔ استقلال و استقامت سے اپنے فریضہ کی تکمیل میں سرگرمِ عمل رہو۔ جس قدر مخالفت زیادہ ہو، تم اسی قدر اطاعتِ احکامِ الٰہیہ میں منہمک ہوتے چلے جاؤ۔ انجامِ کار کامیابی تمہارے ہی لئے ہوگی۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ٥ ..... وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ٥ (۱۵/۹۴-۹۹)۔

"جو کچھ تمہیں حکم دیا گیا ہے، لوگوں کے سامنے اس کا اعلان کرتے رہو اور مشرکوں کی کچھ پروا نہ کرو۔ ان ہنسی اڑانے والوں کے لئے ہم تمہاری طرف سے کافی ہیں۔ یہ جو اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی معبود بناتے ہیں، عنقریب معلوم کرلیں گے کہ حقیقتِ حال کیا تھی۔ ہم اس سے بے خبر نہیں کہ ان لوگوں کی باتوں سے تمہارا دل دُکھنے لگتا ہے (تم ان باتوں کی پروا نہ کرو اور) اپنے رب کی تسبیح و تحمید" میں منہمک اور (اس کے احکام کے سامنے) سجدہ ریز رہو۔ اپنے رب کی عبودیت اختیار

کئے رہو حتّیٰ کہ انجام کار یقینی نتائج تمہارے سامنے آجائیں۔

یہاں "تسبیح و تحمید اور سجدہ" کا مفہوم واضح ہے، یعنی قوانینِ خداوندی کی مکمل اطاعت، اس کی حکومت کا اپنے اُوپر اور پھر ساری دنیا پر عملاً مسلّط کر دینا اور اس پر جم کر کھڑے ہو جانا۔ متعدّد مقامات پر اس تحمید و تسبیح کی تلقین ہے۔

وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ؕ وَ كَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا ۚ (۲۵/۵۸؛ ۲/۱۲۷؛ ۴۰/۵۵؛ ۵۰/۳۹؛ ۵۲/۴۸؛ ۷۶/۲۶)

"اور اس ذات پر بھروسہ کر جو زندہ ہے اور جس کے لئے کبھی موت نہیں اور اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کر اور وہ اپنے بندوں کی لغزشوں سے واقف ہونے کے لئے خود ہی کافی ہے۔"

تسبیح کا نمایاں مفہوم

حضرت موسیٰؑ کے قصہ میں تسبیح کا مفہوم نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے۔ جب انہیں فرعون کی سرکشی و سرتابی کے خلاف حکم جہاد ملا تو چونکہ وہ مہم بڑی سخت تھی، انہوں نے خدا سے دُعا مانگی۔

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ۙ وَ يَسِّرْ لِيْۤ اَمْرِيْ ۙ...... وَنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ۙ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ۝ (۲۰/۲۵ — ۳۵)

"موسیٰؑ نے عرض کیا، اے پروردگار! میرا سینہ کھول دے۔ میری مہم میرے لئے آسان کر دے۔ میری زبان کی گرہ بھی کھول دے (کہ) میری بات لوگوں کے دلوں میں اُتر جائے۔ نیز میرے گھر والوں میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا دے۔ اس کی وجہ سے میری قوّت مضبوط ہو۔ وہ میری مہم میں شریک ہو، تاکہ ہم بہت زیادہ تیری تسبیح کر سکیں اور کثرت سے تیرا ذکر کر سکیں اور بلاشبہ تو ہمارا حال دیکھ رہا ہے۔"

اس کے بعد تفصیلاً مذکور ہے کہ کس طرح حضرت موسیٰؑ کی دعا منظور ہوئی۔ کس طرح انہیں اللہ کی تائید و نصرت حاصل ہوئی اور کس طرح وہ اپنی مہم میں کامیاب و کامران ہوئے۔ فرعون کا ظلم و استبداد سیلاب فنا میں غرق ہو گیا اور اس کی جگہ اللہ کی حکومت کا تختِ اجلال بچھایا گیا اور یوں ہر طرف اللہ کی "تسبیح و ذکر" کی زمزمہ نوائی ہوئی۔ انسانی قوانین کی جگہ اللہ کے قوانین کا دَور دورہ ہوا۔ یہ ہے اللہ کی تسبیح و تحمید کا عملی پہلو۔

یہی حضرات انبیائے کرامؑ کا مشن تھا اور ان کے بعد یہی نصب العین وارثینِ کتابِ الٰہی یعنی جماعتِ مومنین کا ہے۔

اِنَّمَا یُؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ هُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ (۳۲/۱۵؛ نیز ۴۲/۴۲؛ ۴۹/۹)

"ہماری آیات پر تو وہ ایمان رکھتے ہیں کہ جب انھیں ان کی یاد دلائی جاتی ہے تو ان (احکام) کے سامنے سجدے میں جھک جاتے ہیں اور اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے ہیں اور اس کی اطاعت سے، کبھی سرتابی نہیں کرتے۔"

مومن کی تسبیح

یہ تسبیح وہی ہے جس کا اجمالی ذکر حضرت موسیٰؑ کے قصہ میں اُوپر گذر چکا ہے یعنی قیام و بقائے حکومتِ الٰہیہ کے لئے سرگرداں رہنا۔ زندگی کو اس مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے وقف کر دینا۔ یہ ہے جماعتِ مومنین کی تسبیح و تحمید۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ ۝ وَ رَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ اسْتَغْفِرْهُ ۝ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝ (۱۱۰/۳-۱)

"جب اللہ کی نصرت اور کامیابی (سامنے) آجائے اور تو دیکھے کہ لوگ فوج در فوج دینِ خداوندی میں داخل ہو رہے ہیں تو اس وقت اپنے رب کی حمد کی تسبیح کر اور اس سے اپنی فروگذاشتوں کی مغفرت طلب کر۔ وہ یقیناً (رحمتوں کے ساتھ) لوٹ آنے والا ہے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

یہ ہے مومن کی حمد اور یہ ہے اس کی تسبیح۔ خود قوانینِ الٰہیہ کے مطابق زندگی بسر کرے اور ساری دنیا میں ان قوانین کی تنفیذ و ترویج کا موجب بنے۔ اب سوچئے کہ جب مسلمانوں نے حمد و ستائش اور تکبیر و تقدیس کا صحیح مفہوم سمجھا تھا تو اُن کی زندگی اور دنیا کی حالت کیا تھی اور اس کے بعد جب دین نام رہ گیا "سبحہ شماری" کا تو ان کی حالت کیا ہو گئی؟ ؎

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات (اقبالؒ)

۲۹۔ سُبحان اللہ

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، سبحٌ کے معنوں میں "دُوری" کا مفہوم بھی پنہاں ہے۔ اس لئے سُبحَانَ کے معنی ہیں "ہر قسم کے نقائص سے دُور"، منزّہ و مقدّس۔ اس لئے حمد اگر ایجابی صفت ہے (یعنی تمام خوبیوں اور کمالات کی موجودگی) تو تسبیح اپنے اندر سلبی پہلو کو لئے ہوئے ہے (یعنی ہر قسم کے نقص اور زوال سے دُور اور منزّہ) وہی لَا اور اِلَّا جو صفاتِ خداوندی کے ہر شعبہ میں جلوہ ریز ہیں۔

وَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ○ (۲/۱۱۶)

"اور (عیسائی) کہتے ہیں کہ خدا نے (مسیح کو) اپنا بیٹا بنایا۔ حالانکہ اس کی ذات اس سے بہت دُور ہے (سُبْحٰنَهٗ)، وہ کیوں اس بات کا محتاج ہو کہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے اور سب اسی کے قوانین کے سامنے جھکے ہوئے ہیں"۔

یعنی لوگوں نے خدا کے متعلق جو باطل عقیدہ قائم کر رکھا ہے وہ اس سے بہت بلند ہے۔ وہ اس قسم کے تمام نقائص سے پاک اور تمام خامیوں سے منزّہ ہے۔

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّ مَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَ لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ۙ (۲۳/۹۱)۔

"نہ تو اللہ نے کسی کو اپنا بیٹا بنایا اور نہ اس کے ساتھ دوسرا معبود ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر معبود اپنی مخلوق کی فکر میں رہتا اور ایک معبود دوسرے معبود پر چڑھ دوڑتا۔ اللہ کی ذات ان باتوں سے پاک ہے جو یہ اس کی نسبت بیان کرتے ہیں"۔

وہ ذات اس قسم کے تمام غلط تصوّرات اور باطل عقائد سے منزّہ و بلند ہے۔ متعدد آیات میں "خدا کی اولاد" کے عقیدۂ باطل کے ذکر کے بعد فرمایا کہ اللہ اس سے بہت دُور ہے۔ وہ ان باتوں سے پاک ہے۔ ملاحظہ ہو۔

(۴/۱۷۱ ; ۱۰/۶۸ ; ۱۶/۵۷ ; ۱۹/۳۵ ; ۲۱/۲۶ ; ۳۷/۱۵۹ ; ۳۹/۴ ; ۴۳/۸۲)۔

عقیدۂ ابنیّت کے علاوہ، خدا کے ساتھ اور ہستیوں کو بھی شریکِ خدائی ٹھہرایا جاتا ہے۔ وہ اس

فاسد عقیدہ سے بھی بلند و بالا ہے۔ وہ تمام قوتوں کا سرچشمہ ہے، ساری کائنات کا خالق و مالک۔ اسے کونسی احتیاج ہے جس کے لئے وہ اپنے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کرے۔ اگر اس کارگہِ عالم میں ایک سے زیادہ خُدا ہوں تو تمام نظامِ کائنات تہ و بالا ہو جائے۔

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ (۲۱/۲۲ نیز ۴۳/۸۲)۔

"اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا کوئی اور اِلٰہ بھی ہوتا، تو وہ یقیناً بگڑ کر برباد ہو جاتے۔ پس اللہ جو تمام قوتوں کے سرچشمہ کا مالک ہے، ان تمام باتوں سے بہت بلند (و پاک) ہے جو یہ لوگ اس کی نسبت بیان کرتے ہیں۔"

متعدد آیات میں اس حقیقتِ کبریٰ کا اعلان ہوا ہے کہ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔ اللہ کی ذات اس شرک سے پاک اور بلند ہے جو لوگ کرتے ہیں (۱۰/۱۸ نیز ۶/۱۰۱؛ ۹/۳۱؛ ۱۲/۱۰۸؛ ۱۶/۱؛ ۲۸/۶۸؛ ۳۰/۴۰؛ ۳۹/۶۷)۔ سورۂ مائدہ میں ہے کہ قیامت میں حضرت عیسیٰؑ سے پوچھا جائے گا کہ "کیا ان لوگوں سے تم نے کہا تھا کہ تمہیں اور تمہاری والدہ کو خدا کے ساتھ معبود بنا لیں"۔ تو وہ جواب میں عرض کریں گے کہ (سُبْحَانَكَ) تیری ذات اس سے بہت بلند و پاک ہے۔ میں بھلا ان سے ایسی بات کیوں کہنے لگا تھا جو میرے لئے زیبا نہ تھی (۵/۱۱۶)۔ ملائکہ سے پوچھا جائے گا تو وہ بھی ایسا ہی جواب دیں گے (۳۴/۴۱)۔ حتیٰ کہ خدا کے جن برگزیدہ بندوں کو لوگوں نے خواہ مخواہ معبود بنا لیا ہے، ان سے بھی جب دریافت کیا جائے گا تو وہ بھی ایسا ہی عرض کریں گے (۲۵/۱۸)۔ بعض مقامات

عظمت و جبروت

پر عظمت و جبروت اور کبریائی و ملکوت کے موقع پر بھی سُبحان اللہ آیا ہے۔ اس لئے کہ اس کی عظمت کے اعتراف کے معنی یہی ہیں کہ اس کے متعلق اقرار کیا جائے کہ وہ ہر قسم کے نقص و زوال سے پاک اور بلند ہے۔

اَوَ لَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۚ بَلٰى ۚ وَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ۝ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (۳۶/۸۱-۸۳)۔

"کیا وہ خدا جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے اس پر قادر نہیں کہ ان کی مثل بھی پیدا کر دے؟

کیوں نہیں، وہ تو خلاق و علیم ہے۔ اس کا تو انداز (امر) یہ ہے کہ جب کسی چیز (کی تخلیق) کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے (فقط اتنا) کہہ دیتا ہے کہ (موجود) ہو جا تو وہ (موجود) ہو جاتی ہے۔ پس (ہر قسم کی کمزوری اور نقص سے) پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر شے کی ملکوت (تمام بادشاہت) ہے اور تم سب کا قدم اسی کی طرف اٹھتا ہے۔"

مندرجہ صدر مقامات کے علاوہ کم و بیش انہی معانی میں چند ایک اور مقامات پر بھی یہی لفظ آیا ہے۔ مثلاً (۱۷/۹۳؛ ۱۷/۱۰۸؛ ۲۱/۸۷؛ ۳۰/۱۷؛ ۳۶/۳۶) ان تمام مقامات پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآنِ کریم نے جہاں حمد و توصیف سے اللہ تعالیٰ کی عظمت و جبروت کو نمایاں کیا ہے، تسبیح و تقدیس سے اس امر کو دل نشین کرا دیا ہے کہ وہ تمام نقائص سے پاک اور ہر قسم کی کمزوری اور عیب سے منزّہ ہے اور ذہنِ انسانی جس قسم کے تصورات اس کے متعلق قائم کرتا ہے، وہ اس سے بہت بلند و بالا ہے (سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ تَعَالٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ)۔ اس کی صفات کے متعلق صحیح تصوّر وہی ہے جو قرآنِ کریم متعین کرتا ہے۔ اس لئے کوئی شخص خدا پر صحیح ایمان نہیں رکھ سکتا تا وقتیکہ وہ قرآنِ کریم پر ایمان نہ رکھے اور قرآنِ کریم کو منجانب اللہ ماننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ نبی اکرمؐ کی نبوّت پر ایمان لایا جائے۔

ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۳۰/۳۰)

پیرایۂ مجاز

قرآنِ کریم میں بعض مقامات پر اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو انسانی اعضاء (ہاتھ، آنکھ) پر دلالت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ محض ایک پیرایۂ بیان ہے جس میں یہ الفاظ استعارۃً ہمارے طریقۂ کلام کے مطابق استعمال ہوئے ہیں ورنہ جس ذات کے متعلق خود قرآن کا بیان ہو کہ لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (۴۲/۱۱) (اس کی مثل کوئی شے نہیں) اس کے لئے یہ الفاظ ان معنوں میں نہیں آسکتے جن میں انہیں ہم استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً سورۂ قصص میں ہے۔

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ (۲۸/۸۸)

"اس کی ذات کے سوا ہر شے فنا ہو جانے والی ہے۔"

وَجْهُهٗ کے لفظی معنی چہرہ ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس سے یہاں مفہوم "چہرہ" نہیں ہو سکتا۔ مفہوم ترجمہ سے ظاہر ہے۔ دوسری جگہ ہے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۚ وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ ۚ (۵۵/۲۶-۲۷)

"سطحِ ارض پر جو کوئی بھی ہے فانی ہے اور باقی رہنے والی تیرے ربِ صاحبِ جلال و عظمت کی ذات ہے۔"

سورۂ بقرہ میں ہے۔

وَ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ

اِنَّ اللّٰہَ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ○ (۲/۱۱۵)۔

"اور مشرق اور مغرب سب اللہ ہی کے لئے ہے۔ جہاں کہیں بھی تم (اللہ کی طرف) رُخ کرلو، تو اللہ تمہارے سامنے ہے۔ وہ بڑی وسعتوں والا جاننے والا ہے۔"

یہاں معنی اور بھی واضح ہوگئے، یعنی اللہ ہر جگہ موجود ہے۔

وَجْہٌ کے علاوہ یَدٌ (ہاتھ) کا لفظ بھی چند ایک جگہ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ آلِ عمران میں ہے قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰہِ ۚ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ ۭ (۳/۷۳ نیز ۵۷/۲۹) "کہو کہ یقیناً فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے (اپنے قانونِ مشیّت کے ماتحت) عطا کر دیتا ہے۔" ظاہر ہے کہ یہاں یَدٌ کے معنی "ہاتھ" نہیں، بلکہ قبضہ و اختیار ہے۔ خود ہماری زبان میں بھی اس کے یہی معنی ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ حضرت ابراہیم، اسحاق، اور یعقوب (علیہم السلام) اُولِی الْاَیْدِیْ وَ الْاَبْصَارِ (۳۸/۴۵) "ہاتھوں اور آنکھوں والے" تھے۔ معنی واضح ہیں کہ وہ صاحبِ قوّت و بصیرت تھے۔ اس لئے یَدٌ (ہاتھ) کے معنی قبضہ و اختیار، قوّت و شوکت کے ہیں۔ سورۂ ذاریات میں ہے۔

وَ السَّمَآءَ بَنَیْنٰہَا بِاَیْىدٍ وَّ اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ○ (۵۱/۴۷)۔

"اور آسمان کو ہم نے قوّت (ہاتھوں) سے بنایا اور ہم یقیناً وسیع (وعریض کائنات) پیدا کرنیوالے ہیں۔"

حدیبیہ کے مقام پر جب پرستارانِ توحید نے اپنی تمام متاعِ حیات اللہ کی راہ میں پیش کردی اور اعلائے کلمۃ الحق کے لئے سب کچھ قربان کردینے کا عہد کیا، تو ارشاد ہوا کہ

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ ؕ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْہِمْ ۚ (۴۸/۱۰)۔

"(اے رسول) جو لوگ تجھ سے بیعت کر رہے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ ہے۔"

یعنی وہ لوگ جان اور مال اللہ کے ہاتھوں بیچ رہے ہیں۔ یہ بیچنے والے ہیں اور اللہ خریدنے والا ہے۔ یہاں بھی یَدٌ (ہاتھ) کے معنی واضح ہیں۔ سورۂ زمر میں ہے۔

.... وَ الْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَ السَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌۢ بِیَمِیْنِہٖ ؕ سُبْحٰنَہٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ○ (۳۹/۶۷)۔

" قیامت کے دن تمام زمین اس کے قبضہ میں ہوگی اور آسمان لپٹے ہوئے اس کے داہنے ہاتھ میں ۔
اللہ پاک اور بلند ہے اس شرک سے جو لوگ اس کے ساتھ کرتے ہیں "۔
یہاں بھی ہاتھ کے معنی قبضہ و اختیار کے ہیں۔

قصۂ حضرت نوحؑ میں ہے کہ ہم نے نوحؑ سے کہا۔ وَ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا (۱۱/۳۷)۔
"ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہمارے حکم کے مطابق ایک کشتی بناؤ"۔ ظاہر ہے کہ "ہماری آنکھوں کے سامنے"
سے مفہوم یہ ہے کہ ہماری زیرِ نگرانی کشتی بناؤ۔

ان مقامات سے واضح ہے کہ یہ الفاظ محض بطور پیرایۂ بیان استعمال ہوئے ہیں اور یہ انداز بیان ہر زبان میں پایا جاتا ہے۔ ورنہ اللہ کی ذات، جو ہر جگہ حاضر و ناظر اور لطیف و خبیر ہے اور ہر قسم کی مادی نسبتوں سے منزہ و مقدس، اس کی نسبت ایسا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ انسانوں کی طرح جسم رکھتا ہے۔ جسم رکھنا تو ایک طرف لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ز وَ هُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ج وَ هُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ○ (۶/۱۰۴) "اسے کوئی نگاہ نہیں پا سکتی لیکن وہ (سب) نگاہوں کو پا رہا ہے۔ وہ بڑا ہی باریک بین اور باخبر ہے"۔ اس موضوع پر ان تصریحات کی چنداں ضرورت نہ تھی، اس لئے کہ صفاتِ خداوندی کے متعلق جو کچھ قرآنِ کریم میں مذکور ہے اور جتنا کچھ سابقہ اوراق میں لکھا گیا ہے، اس کے بعد کسی صاحبِ بصیرت کو یہ بتانے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی کہ اللہ کی ذات تمام محسوس نسبتوں سے منزہ و معرّیٰ ہے۔ لیکن بایں ہمہ ان اشارات کی ضرورت اس لئے سمجھی گئی کہ قرآنِ کریم کے ان مقامات کے متعلق دل میں کوئی کھٹک باقی نہ رہے اور یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آجائے کہ قرآنِ کریم میں جہاں کہیں بطور پیرایۂ بیان خدا کے متعلق ایسے الفاظ آئے ہیں جو انسانی اعضاء پر دلالت کرتے ہیں، ان کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق قرآن کا واضح ارشاد ہے کہ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ "اس کی مثل کوئی شے نہیں اور یہی اس باب میں حرفِ آخر اور قولِ فیصل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تو خدا کی ذات ہے خود انسانی ذات بھی جسم اور اعضاء کی نسبتوں سے دُور ہوتی ہے۔ ذات (PERSONALITY) محسوس شکل میں ہو ہی نہیں سکتی۔ اسے تو صرف اس کی صفات سے پہچانا جاتا ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ

یہ ہے اللہ

رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝ (۳۹/۶)

"تمہارا رب نشوونما دینے والا، سارا اقتدار اُسی کے لئے ہے۔ اس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں سو تم کدھر بھٹکتے پھر رہے ہو۔"

قرآنی تعلیم کی بنیاد ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه۔ یوں تو یہ چار لفظوں کا چھوٹا سا جملہ ہے لیکن غور سے دیکھئے تو کائنات کے چاروں گوشے سمٹ کر اس کے اندر آ گئے ہیں۔

"کوئی ایسی ہستی نہیں جس کے قوانین کی اطاعت کی جائے مگر ہاں، ایک اللہ کی ذات۔"

گذشتہ اوراق میں جو کچھ لکھا گیا ہے (اور اس کے علاوہ قرآنِ کریم میں جس قدر گوہر شاہوار اَور ہیں) وہ اسی محکم بنیاد کی ثریا بوس عمارت، اسی نقطۂ ماسکہ کا دائرہ محیطِ کل اور اسی اصل کی سرسبز و شاداب فروعات ہیں۔ اللہ کی ایک ایک صفت جمیلہ کو لے کر اِلٰہ کی جگہ رکھتے جایئے، قرآنی تعلیم کا ایک ایک گوشہ مکمل ہوتا چلا جائے گا۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ یعنی لَا رَبَّ اِلَّا اللّٰهُ (اس کے سوا کسی میں شانِ ربوبیت نہیں) لَا خَالِقَ اِلَّا اللّٰهُ (اسکے سوا کوئی خالق نہیں) لَا قَادِرَ اِلَّا اللّٰهُ (اسکے سوا کسی میں کوئی قوت نہیں) لَا رَازِقَ اِلَّا اللّٰهُ (رزق کے سرچشمے صرف اس کے اقتدار میں ہیں) لَا حَاكِمَ اِلَّا اللّٰه (حکومت اس کے سوا کسی کو زیبا نہیں۔ اسکے سوا کسی کی محکومیت جائز

نہیں) وَ قِس علیٰ ذالک۔ قرآنی تعلیم کے اس سنگِ بنیاد پر پھر غور کیجئے اور سوچئے کہ جب ایک عبدِ مومن اپنے پورے علم و یقین کے ساتھ علیٰ وجہ البصیرت، دل کی گہرائیوں سے اعلان کرتا ہے کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تو اس کا یہ نعرۂ انقلاب فضائے عالم میں کس قدر ولولہ انگیز اور لرزہ انداز تحرک و تموج کا موجب ہوتا ہے۔ دنیا کی ہر غیر خدائی قوت سے انکار، انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام سے بغاوت، ہر انسانیت کُش نظریہ حیات سے سرکشی۔ اس لئے نہیں کہ ان سے ضد یا تعصب ہے، بلکہ اس حقیقتِ عظمیٰ کے اعلان کے لئے کہ انسان ایسا نظامِ زندگی وضع ہی نہیں کر سکتا جس میں انسانی ذات کی برومندی ہو سکے۔ یہ صرف وہی ذات کر سکتی ہے جس نے انسان کو ذات (PERSONALITY) عطا کی ہے۔ ساری دنیا کی چوکھٹوں سے مستانہ وار سرفراز گذر جانا، تکبّر و تمرّد کی بنا پر نہیں بلکہ اِس اصلِ عظیم کے مظاہرہ کے لئے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسان کو اپنے سامنے جھکائے۔ جھکنا ہے تو صرف اس خدا کے قوانین کے سامنے جس کے سامنے جھکنے کا حق ہے۔ اطاعت ہے تو فقط اس ایک کے احکام کی جس کی اطاعت میں شرفِ انسانیت کا راز مضمر ہے۔ مظاہرِ فطرت میں سے کسی کے سامنے جھکنا، مقامِ انسانیت سے انکار اور اپنے جیسے انسانوں میں سے کسی کے سامنے سرنگوں ہو جانا خودی کی انتہائی ذلت ہے۔

وَ مَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَکَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُہُ الطَّیْرُ اَوْ تَھْوِیْ بِہِ الرِّیْحُ فِیْ مَکَانٍ سَحِیْقٍ ۝ (۲۲/۳۱)۔

"جس کسی نے اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کر لیا تو اس کا حال ایسا سمجھو جیسے وہ آسمان (کی بلندی) سے (زمین کی پستی پر) اچانک گر پڑا۔ جو چیز اس طرح گرے گی اسے یا تو کوئی اُچک لے گا یا ہوا کا جھونکا کسی دُور دراز گوشہ میں لیجا کر پھینک دیگا۔"

شرک کو اسی لئے ظُلْمٌ عَظِیْمٌ (۳۱/۱۳) کہا گیا ہے کہ اس سے بڑھ کر بے حجابات کوئی نہیں۔ یہ اپنی ہستی کا انکار اور ان کی خدائی کا اقرار ہے جو زیادہ سے زیادہ اپنے جیسے انسان ہیں۔ عِبَادٌ اَمْثَالُکُمْ (۷/۱۹۴)۔ جس شخص نے شرفِ انسانیت اور تکریمِ خودی جیسی متاعِ بے بہا یوں دوسروں کی نذر کر دی، تو اس کے بعد اور کونسی چیز باقی رہ سکتی ہے جسے بیچ ڈالنے میں اُسے کسی قسم کا باک یا تامل ہو سکتا ہے؟ ایسا انسان اپنے پست جذبات کا غلام ہوتا ہے اور غلام کی یہ کیفیت کہ ؎

دین و دانش را غلام ارزاں دہد تا بدن را زندہ دارد جاں دہد

گرچہ برلب ہائے اُو نام خداست　　قبلۂ اُو طاقتِ فرماں رواست
ایں صنم تا سجدہ اش کردی خداست　　چو یکے اندر قیام آئی فناست
آں خدا نانے دہد جانے دہد　　ایں خدا جانے بُرد، نانے دہد

خدائی ضابطۂ قوانین کے مقابلہ میں انسانی نظامِ زندگی، خواہ اپنا وضع کردہ ہو یا کسی اور کا، غیر اللہ کی عبودیت ہے، جس کا لازمی نتیجہ ذلّت و رسوائی اور عدم سکون و فقدانِ طمانیّت کا ایسا جہنّم ہے جس کے جاں سوز و جہانگیر شعلے بساطِ زندگی کے ہر گوشے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ اس کے برعکس جو شخص قوانینِ خداوندی کی محکمیت پر ایمان رکھتا ہے، وہ انفس و آفاق کی تمام قوتوں کو اس بلند و بالا ضابطہ کے ساحلوں میں محصور کر کے کشتیٔ حیات کو رواں دواں اُس جنّت کی طرف لے جاتا ہے جہاں کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوتا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○ (۴۱/۳۰)۔

"یقیناً جن (سعادتمند) لوگوں نے یہ اقرار کر لیا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس (ایمان) پر جم کر کھڑے ہو گئے، تو ان پر (تسکین و طمانیت کے علمبردار) ملائکہ نازل ہوں گے (جو کہیں گے کہ) مت خوف کھاؤ اور بالکل نہ گھبراؤ اور اس جنّت کی بشارت لو جس کا تمہارے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے۔"

اللہ پر ایمان اور ہر غیر اللہ قوّت سے انکار، یہ ہے رازِ زندگی۔ یہ ہے اصلِ حیات۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○ (۲/۲۵۶)

"جو کوئی طاغوت (غیر خدائی قوتوں) سے انکار کر دے اور اللہ پر ایمان لے آئے تو بلا شبہ اُس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو ٹوٹنے والا نہیں۔ یاد رکھو! اللہ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔"

لیکن ایمان وہی ایمان ہے جس کا سرچشمہ دل کا یقین اور جس کا مظہر انفرادی پاکیزگیٔ سیرت و کردار اور اجتماعی نظامِ حیات ہو، نہ وہ جو محض زبان کی جنبش تک محدود ہو کر رہ جائے اور انسان کی عملی زندگی اس کی تکذیب کر رہی ہو۔

اس قسم کے جسدِ بے روح کی قیمت کیا ہے؟

اگر زاں برقِ بے پروا درونِ او تہی گردد
بچشمِ کوہِ سینا می نیرزد با پرِ کاہے ! (اقبالؒ)

جیساکہ شروع میں لکھا جاچکا ہے، اللہ کی ذات کی معرفت انسانی حیطۂ ادراک سے ماوراء ہے. اس نے انسان کو اپنے متعلق جس قدر علم دینا چاہا وہ ان صفات کے ذریعے دیدیا جو قرآنِ کریم میں مذکور ہیں. اس لئے ہم اللہ کے متعلق جو کچھ بھی جان سکتے ہیں وہ اتنا ہی ہے جتنا قرآن بیان کرتا ہے. اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے ہم خدا کی ذات کو پہچان سکیں یا اس کے متعلق علم حاصل کرسکیں. یہی ایک عبدِ مومن کے لئے علم کا آخری نقطہ اور معرفت کی آخری حد ہے. اس سے آگے نہ بڑھا جا سکتا ہے اور نہ بڑھنے کی کوشش نتیجہ خیز ہوسکتی ہے. اسلام ایک سیدھا سادا، صاف و شفاف نصابِ تعلیم وضابطۂ عمل ہے. اس میں نہ بے مقصد فلسفیانہ نکتہ آفرینیاں ہیں نہ بے مطلب عالمِ خیال کی قیاس آرائیاں. اسلام سے مفہوم یہ ہے کہ نبیٔ اکرمؐ پر نازل شدہ قرآن کے مطابق خدا پر ایمان فکر و نظر کے تمام گوشوں کا مرکز ہو اور امکانی حدود کے اندر صفاتِ خداوندی کا اپنے اندر منعکس کرتے جانا اعمالِ حیات کے تمام گوشوں کا محور. اس ایمان اور ایسے اعمال کی حامل جماعت کا نام ہے اُمّتِ مسلمہ اور ان کا فطری نتیجہ استخلاف فی الارض یعنی اس زمین پر اس نظام کا قیام جس کی عملی تشکیل مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ نے فرمائی. یہ ہے اسلام. اس کے علاوہ باقی سب کچھ ذہنِ انسانی کی ندرت آفرینیاں اور قیاس آرائیاں ہیں جن سے حقیقت کو کچھ واسطہ نہیں. سُبْحٰنَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ لوگ جو کچھ اللہ کے متعلق (اپنے ذہن و قیاس سے) بیان کرتے ہیں خدا اس سے بلند و بالا ہے. قرآنِ کریم سے باہر جو کچھ بھی اللہ کے متعلق کہا جائے گا، ذہنِ انسانی کا قیاس (مَا يَصِفُوْنَ) ہوگا. خدائے حقیقی وہی ہے جس کے متعلق قرآنِ کریم نے کہہ دیا کہ

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۭ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ۝ (۳۵/۱۳)۔

"یہ ہے اللہ تمہارا رب. اقتدار (صرف) اسی کے لئے ہے. لوگ اس کے علاوہ جن کو پکارتے ہیں وہ ایک تنکے (یا ذرّے) پر بھی قدرت نہیں رکھتے۔"

شعورِ انسانی نے جب سے آنکھ کھولی، وہ اس مقام کی تلاش میں سرگرداں رہا جہاں پہنچ کر وہ پورے حتم و یقین سے کہہ سکے کہ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ۔ یہی اس کے تجسّس کی انتہا اور اس کی انسانیت کی معراج تھی۔ اس نے اس منتہیٰ کی تلاش میں مدّتوں دشت پیمائیاں اور صحرا نوردیاں کیں۔ لیکن تنہا ذہنِ انسانی اس منزل کا کہیں سُراغ نہ پاسکا، نہ یونان کی درسگاہوں میں، نہ ایران کے آتشکدوں میں، نہ ہندوستان کے یوگ استھانوں میں نہ روما کی خانقاہوں میں، جب کبھی، کہیں وحیٔ ربانی کے نغمۂ سرمدی کی کوئی آواز کان میں پڑگئی، اس کی نگاہوں میں شادابی اور پیشانی پر نورانیت کے آثار چمک اُٹھے۔ لیکن جونہی وہ آواز گُم ہوئی یہ پھر اُسی وادیٔ حیرت میں کھوگیا۔ یہی ہوتا رہا، تاآنکہ ان بکھرے ہوئے نغموں کی سرمدی صدائیں ایک ایسے سازِ حقیقت نواز میں سمٹ کر آگئیں جو کاروانِ انسانیت کے لئے بانگِ درا بن گیا۔ اس سازِ حقیقت نواز کا نام القرآن العظیم ہے۔

قرآن نے پہلی بار انسان کو بتایا کہ خدا پر ایمان بنیاد ہے انسان کے اپنی ذات پر ایمان کی اور انسان کے اپنی ذات پر ایمان سے مراد ہے اس حقیقت پر ایمان کہ:

(۱) انسان صرف جسم کا نام نہیں۔ جسم کے علاوہ، اس کے پاس ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات کہتے ہیں۔

(۲) انسانی ذات کی اگر مناسب نشوونما ہوجائے تو اس میں، حدِ بشریت کے اندر، وہ صفات اُجاگر ہوتی چلی جاتی ہیں جنہیں، خدا کے ضمن میں الاسماء الحسنیٰ کہا جاتا ہے۔ اس طرح کی نشوونما یافتہ ذات، جسم کی موت کے بعد زندہ رہتی اور مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے لئے، عالمِ آخرت کا سفر اختیار کرتی ہے۔

(۳) ذاتِ انسانی کی اس قسم کی نشوونما، اُس معاشرہ کے اندر ہوتی ہے جو قوانینِ خداوندی (قرآنی نظامِ حیات) کے مطابق متشکل ہوتا ہے۔ یہ معاشرہ تمام افرادِ انسانیہ کے جسم اور ذات کی نشوونما کے لئے ضروری سامان بہم پہنچانے کا ذمّہ دار ہوتا ہے۔

(۴) اس قسم کے نظامِ معاشرہ کے بغیر، انسان اس دنیا میں بھی جہنّم کی زندگی بسر کرتا ہے اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی۔

نبیٔ اکرمؐ نے، اس قسم کا قرآنی معاشرہ قائم کرکے، اس دنیا کو جنّت میں تبدیل کرکے بتادیا اور اب دنیا کا جہنّم اسی صورت میں جنّت میں تبدیل ہوسکتا ہے جب دنیا میں پھر سے اسی قسم کا معاشرہ قائم ہو۔ اس کے علاوہ

دنیا کی نجات و سعادت کی کوئی اور صورت نہیں۔

یہ ہے قرآن کی رُو سے خدا پر ایمان سے مقصود۔

اگر باُو　نرسیدی تمام بولہبی است

اس حقیقت کو پھر دہرا دیا جائے کہ

(۱) خدا کی بعض صفات ایسی ہیں جو اس کے لئے مختص ہیں۔ ان میں کوئی اور شریک نہیں ہو سکتا۔ مثلاً هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وغیرہ۔ اس کی باقی صفات کی نمود انسانی ذات سے ہو سکتی ہے لیکن حدودِ بشریت کے اندر رہتے ہوئے۔ جس فرد میں جس حد تک ان صفات کی نمود ہو گی اسی حد تک اسے صاحبِ سیرت و کردار کہا جائیگا۔

(۲) قرآن میں بیان کردہ صفاتِ خداوندی وہ خارجی معیار ہے جس سے ہر انسان پرکھ سکتا ہے کہ اس کی ذات کی نشو و نما ہو رہی ہے یا نہیں اور اگر ہو رہی ہے تو کس حد تک۔ اگر یہ خارجی معیار سامنے نہ ہو تو انسان خود فریبی میں مبتلا ہو جاتا ہے جو یونہی سمجھ لیتا ہے کہ وہ "روحانیت" میں آگے بڑھ رہا ہے۔ یاد رکھئے! "قرآنی روحانیت" حسنِ سیرت و کردار کا دوسرا نام ہے۔

(۳) "روحانیت" کا غیر قرآنی تصوّر جسے تصوف کہا جاتا ہے، خالصتہً انفرادی جذبہ ہے اسی لئے جب ان روحانیت کے مدعیوں سے کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ وہ روحانیت کی منزلیں طے کر رہے ہیں، تو ان کے پاس اس کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ

ذوقِ ایں بادہ ندانی، بخدا تا نہ چشی

"نشہ کی کیفیت کو وہی سمجھ سکتا ہے جو خود شراب پیئے"۔ اس کیفیت کو کسی دوسرے کو سمجھایا نہیں جا سکتا۔ یہ یکسر خود فریبی ہے۔ قرآن کی رُو سے، انسانی ذات کی نشو و نما، انسان کی سیرت و کردار سے اُبھر اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے جس قدر کسی انسان کی سیرت و کردار (بحدِ بشریت) صفاتِ خداوندی کے آئینہ دار ہوں گے، اسی قدر اس کی ذات کی نشو و نما ہو چکی ہو گی۔

(۴) جب ہم نے کہا ہے کہ انسانی ذات کی نشو و نما کی نمود، اس شخص کی سیرت و کردار سے ہوتی ہے، تو اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ کوئی ایسا نشہ نہیں جس کی کیفیت سے کوئی نشہ پینے والا ہی کیف اندوز ہو سکے۔ نشو و نما یافتہ ذات کے جوہروں کی نمود، انسانوں کی اجتماعی زندگی میں ہوتی ہے، کیونکہ سیرت و کردار کا پتہ ہی اس وقت چلتا

ہے جب ایک انسان کا معاملہ دوسرے انسانوں سے پڑے۔

(۵) ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ صفاتِ خداوندی متعدد اور متنوع ہونے کے علاوہ، بعض مقامات پر، باہمدگر متضاد بھی ہیں۔ مثلاً وہ رحیم و کریم بھی ہے اور جبّار و قہار بھی۔ کیریکٹر کے معنی یہ ہیں کہ جس جگہ جس قسم کی صفت کی نمود ضروری ہو وہاں اس صفت کا ظہور ہو۔ اگر عدل کے مقام پر عفو اور رحم کے مقام پر قہاریت کی صفات کا ظہور ہو جائے تو اس سے نظامِ عالم میں فساد برپا ہو سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیسے متعین کیا جائے کہ کس مقام پر کس قسم کی صفت کا ظہور ہونا چاہیئے۔ آپ قرآنِ کریم میں دیکھیں گے کہ عام طور پر اس کی آیات کے آخر میں کسی نہ کسی صفتِ خداوندی کا ذکر ہوگا۔ اگر آپ ان آیات کی گہرائی میں جائیں گے تو اس سے حقیقت سمجھ میں آجائیگی کہ جس قسم کے احوال و کوائف کا ذکر ان آیات میں آیا ہے، ایسے مقام پر اس صفت کا ظہور ہونا چاہیئے جو ان آیات کے آخر میں آئی ہے۔ قرآنِ کریم میں اس نہج پر غور و فکر اور ممارست سے انسان کے اندر یہ ملکہ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ متعین کر سکے کہ کس قسم کے حوادث و مواقع پر کس قسم کی صفتِ خداوندی کا ظہور ہوا تھا۔ ایسے مواقع پر اسی قسم کی صفت کی نمود اس سے ہونی چاہیئے۔ عفو کے مقام پر عفو، عدل کے مقام پر عدل۔

(۶) آپ دیکھیں گے کہ دنیا میں زیادہ تباہی ان لوگوں کے ہاتھوں سے نہیں آئی جو خدا کے منکر تھے۔ بیشتر تباہی ان خداپرستوں کے ہاتھوں ظہور میں آئی ہے جو خدا کی کسی ایک صفت کو لیکر اس میں شدت اور غلو کے ساتھ آگے بڑھتے چلے گئے۔ مثلاً رحم خدا کی ایک صفت ہے۔ عیسائیت نے اس صفت میں ایسا غلو اختیار کیا کہ ان کے مذہب میں عدل اور قانونِ مکافات کا تصور ہی نہ رہا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ان کے ہاں گناہوں کا سیلاب آگیا اور جرائم وبا کی طرح پھیل گئے۔ "معافی نامے"، سبزی ترکاری کی طرح بازاروں میں بکنے لگے اور "خدا کے نمائندے" ٹکے ٹکے پر جنت بیچنے لگ گئے۔ یہ تھا صفاتِ خداوندی میں وہ مسلکِ غلو و تشدد، جس سے روکنے کے لئے قرآن نے کہا کہ وَ لِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی۔ صفاتِ خداوندی اپنا پورا پورا توازن (حُسن) لئے ذاتِ خداوندی میں مرکوز ہیں۔ فَادْعُوْهُ بِهَا۔ خدا کو ان صفات کا توازن برقرار رکھتے ہوئے پکارو۔ وَ ذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اَسْمَآئِهٖ ؕ جو لوگ اس کی بعض صفات کو لے کر ایک طرف کو نکل دوڑتے ہیں، ان سے قطع تعلق کرو۔ ان کا مسلک انہیں گمراہی کی طرف لئے جا رہا ہے۔ تم ان سے کنارہ کش رہو۔ انہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ ان کا نظریہ اور مسلک کس قدر تباہ کن نتائج کا حامل تھا۔ سَیُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ٥ (۷/۱۸۰)۔ صحیح مسلک یہی ہے کہ جس مقام پر جس صفتِ خداوندی کی نمود کی ضرورت ہو وہاں اس صفت کا ظہور ہو اور اُسی قدر ظہور ہو جس قدر اس موقعہ پر اس کی ضرورت ہے۔ صفاتِ خداوندی میں نہ کوئی صفت ایسی ہے جسے چھوڑ دینا پڑے اور نہ ہی کوئی ایسی جس میں غلو اور شدت اختیار کرلی جائے۔ اس کی تمام صفات،

اپنے اپنے موقع پر، بہترین نتائج کی حامل ہوتی ہیں۔ اسی بنا پر اس کے اسماء کو الحسنٰی کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہ صفات، اس حُسن و توازن کے ساتھ، مذاہب عالم میں کہیں نہیں ملیں گی۔ یہ صرف قرآن کریم کے اندر مذکور ہیں اور اسی لئے اس خدا پر ایمان، ایمان باللہ کہلا سکتا ہے جس کا تعارف قرآن کریم نے کرایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم ان لوگوں سے بھی ایمان باللہ کا مطالبہ کرتا ہے جو اپنے خیال اور تصور کے مطابق خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ اسی سے یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ ایمان باللہ کا عملی مفہوم کیا ہے۔ اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ اُس کی صفات اس امر کے پرکھنے کا خارجی معیار قرار پاتی ہیں کہ اس فرد کی ذات کی نشوونما ہو رہی ہے یا نہیں اور اگر ہو رہی ہے تو کس حد تک۔ اس سے واضح ہے کہ خدا پر ایمان بنیاد ہوتا ہے انسان کے اپنی ذات پر ایمان لانے کی۔

یاد رکھئے! جو شخص اپنی ذات کا منکر ہے (یعنی اپنے آپ کو محض طبیعی زندگی کا پیکر خیال کرتا ہے اور بس) وہ خدا پر ایمان نہیں لا سکتا۔ اسی لئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ؛

شاخِ نہالِ سدرہؑ خار و خسِ چمن مشو
منکرِ اُو اگر شوی، منکرِ خویشتن مشو

اس لئے کہ جو شخص "منکرِ خویشتن" ہو جائے اس کے "مومنِ خدا" ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن جو شخص "مومنِ خویش" ہے اس کے متعلق توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک دن "مومنِ خدا" ہو جائے گا۔

اور ایسا، قرآن کریم پر ایمان لانے ہی سے ممکن ہے۔

والسلام